ایک سیاست کئی کہانیاں

رؤف کلاسرا



ایک سیاست کئی کہانیاں

رؤف کلاسرا

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد - لاہور - کراچی

ڈان کے لیجنڈری ایڈیٹر

احمد علی خان (مرحوم)

کے نام

جن کے 1998ء میں مجھے ملتان سے اسلام آباد بھجوانے کے

ایک فیصلے نے میری زندگی ہمیشہ کے لیے بدل دی۔

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-385-3

کتاب	:	ایک سیاست کئی کہانیاں
مصنف	:	رؤف کلاسرا
سن اشاعت	:	2010
سرورق	:	خالد رشید
مطبع	:	[illegible]
قیمت	:	[illegible]

دوست پبلی کیشنز [illegible]

فون: [illegible] E-mail: [illegible]

ترتیب

کہانیوں کی کہانی

میں یہ کتاب چھ سال کی تاخیر سے لکھ پایا ہوں۔ یہ فرق کا بھی ایک پہلو ہے کہ جب صحافت میں ہم سب کے گرو، ضمیر نیازی کے بقول "کیڑا" ہوتے تھے کہ کتاب کی اور طرف دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ لیکن میں قیام لندن کے دنوں میں جس بک شاپ پر گیا اور جس بیسٹ سیلر بک کو بھی ہاتھ لگایا تو پتہ چلا وہ وہاں کے کسی صحافی نے لکھی تھی۔ پاکستان کے بارے میں بھی اچھی کتابیں اب تک لکھی گئی ہیں ان کے لکھنے والے بھی غیر ملکی صحافی ہیں۔ یہ صحافی پاکستان میں اپنے اخبار کے لیے صرف تین سال لگاتے ہیں اور اپنی معیاد ختم ہونے پر واپس جا کر ان کا پہلا کام پاکستان اور پاکستانی سیاستدانوں، فوج اور ایجنسیوں کے بارے میں کتابیں لکھنا ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک خواہش میرے دل میں بھی پہلے سے موجود تھی کہ کچھ ایسا کام کیا جائے جس سے پاکستانی سیاست کے مختلف ادوار اور بڑے بڑے کرداروں کو عوام کے سامنے ایک کہانی کی شکل میں پیش کیا جا سکے۔ اسی خواہش کے پیش نظر ان سیاسی خاکوں کو اردو میں ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے ذہن میں یہ بات کیسے آئی تھی کہ 2003ء میں، میں نے اس وقت کے سب سے زیادہ طاقتور سیاستدان چوہدری شجاعت حسین کا انٹرویو کیا تھا جس نے میرے لیے ایک نئی راہ متعین کی تھی۔ میں ہمیشہ اس کوشش میں رہا کہ میں خبر کو بھی ایک کہانی کی شکل میں لکھوں تاکہ پڑھنے

[illegible] کا انٹرویو [illegible] میں [illegible] ملاقات کا وہ انٹرویو اپنے انگریزی اخبار [illegible] کہانی کی طرح ہی لکھا تھا۔ وہ کہانی لوگوں کو اتنی پسند آئی کہ پھر میں نے تیس کے قریب سیاستدانوں کی کہانیاں لکھیں۔ مجھے محمود خان اچکزئی کا وہ فقرہ نہیں بھولتا کہ میں نے چالیس برس بعد اٹلی کی مشہور عالمی صحافی اوریانا فلاسی کی یاد انہیں دلا دی تھی۔ میں نے اس وقت تک عالمی لیڈروں کے دو درجن انٹرویوز پر مشتمل اوریانا کی کتاب "An interview with history" نہیں پڑھی تھی۔ جب پڑھی تو اس کا ایک ایسا روحانی اثر مجھ پر ہوا کہ میں نے اس کا بھٹو صاحب کا مشہور زمانہ انٹرویو ترجمہ کر کے اس کتاب میں شامل کیا ہے تاکہ ہماری نئی نسل ماضی سے قدرے روشناس ہو سکے۔ یہ انٹرویو 1972ء میں لیا گیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ کاش اوریانا فلاسی دوبارہ بھٹو صاحب کا انٹرویو 1977ء کی فوجی بغاوت کے بعد کرتی تو پتہ نہیں کیا کیا انکشافات ہوتے۔ جس انداز سے اوریانا فلاسی نے بھٹو صاحب کی شخصیت کو بے نقاب کیا ہے وہ اس کتاب کو پڑھنے والوں کے لیے زیادہ دلچسپ بنائے گا۔

جب میں اپنے ان تمام سیاسی خاکوں میں سے انتخاب کرنے بیٹھا تو مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کس کا نام ڈراپ کروں۔ مجھے سب سے زیادہ مایوسی اس بات کی ہے کہ محمود خان اچکزئی کے ساتھ آٹھ برسوں پر محیط نشستوں کے بعد بھی میں اپنے آپ کو اس قابل نہ بنا سکا کہ وہ مجھے اپنے رازوں کی کہانی لکھنے دیتے۔ میرا خیال ہے کہ اگر محمود اچکزئی مجھے اجازت دے دیتے تو وہ اس کتاب کا سب سے بہترین باب ہوتا۔ میں ابھی بھی مایوس نہیں ہوا ہوں۔ انہوں نے آٹھ برس پہلے مجھے یہ کہا تھا کہ یہ تمام راز آف دی ریکارڈ بتائے جا رہے ہیں۔ میرے لبوں پر پھیلتی مسکراہٹ دیکھ کر وہ یکدم سنجیدہ ہو کر براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک پٹھان کے لہجے میں بولے۔ "اگر تم نے وہ راز راز نہ رہنے دیئے تو پھر ہو سکتا ہے کسی دن تمہیں اپنی جان بچانے کے لیے اسلام آباد سے فرار ہونا پڑے تو اگر کوئی شخص تمہیں پورے پاکستان میں اپنا مہمان بنائے گا تو وہ صرف محمود اچکزئی ہوگا۔ آگے تمہاری مرضی۔ اگر تم اپنی آخری پناہ گاہ بھی میرے راز لکھ کر ختم کرنا چاہتے ہو تو یہ تمہاری چوائس!"

یہ بات میں ہی جانتا ہوں کہ کتنی مشکل سے میں نے ان آٹھ برسوں میں محمود اچکزئی کے سینے سے دھواں بن کر نکلنے والے ان خوفناک رازوں کو کیسے ایک صحافی ہونے کے باوجود چھپا کر رکھا ہے۔ اگرچہ میرے دوست کالم نگار سلیم صافی نے محمود اچکزئی کی موجودگی میں مجھے کہا کہ رؤف بھائی آپ بھی [illegible] ہو۔ تم لگے رہو اور [illegible] کہ کبھی [illegible] نہیں [illegible] رہے ہیں، انہیں کبھی چھاپ سکے۔ ایک دو [illegible] جن سے [illegible] اس پٹھان کا [illegible] سے اپنے صحافیوں کو [illegible] کر دیا ہے۔ میں نے مسکرا کر سلیم صافی کو جواب دیا کہ [illegible] یہ [illegible] محمود اچکزئی صاحب [illegible] کے صحافی کے ساتھ [illegible] ہوں جن [illegible] کے صحافی کو ان آٹھ برسوں میں ابھی تک ان سے ایک فقرہ بھی حاصل نہیں ہو سکا۔

محمود اچکزئی کے علاوہ شیخ رشید، [illegible] آصف، [illegible] حسین، [illegible] اختر [illegible] اور پانچ ایسے سیاستدان تھے جن کے پروفائل لکھ رکھے ہیں [illegible] اس کتاب میں شامل نہیں کر سکا۔ اگر اس سیاسی کتاب کو پذیرائی ملی تو شاید ان کے رازوں سے بھی پردہ اٹھ جائے گا۔ [illegible] دوستوں نے کہا کہ قاضی حسین احمد، مولانا فضل الرحمن اور الطاف حسین کے بھی اسی طرح کے پروفائل لکھوں۔ پتہ نہیں میرا دل کیوں نہیں مانا۔ میں نے ان سب کو یہی جواب دیا کہ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے اپنے دل کی باتیں نہیں بتائیں گے یا وہ سچ جو میں سننا چاہتا ہوں وہ اپنے اندر سے نہیں نکال پائیں گے لہذا ان کا اور اپنا وقت برباد کرنے کا کیا فائدہ؟ اس لیے میں ان تینوں کے چاہنے والوں سے معذرت خواہ ہوں۔

"دی نیوز" کے سابق ایڈیٹر سلیم بخاری مجھے ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ مجھے انگلش میں لکھے گئے یہ سارے سیاسی پروفائلز کتابی شکل میں لے آنے چاہئیں۔ یہ کریڈٹ بھی سلیم بخاری کو جاتا ہے کہ یہ سب کے سب تہلکہ خیز پروفائلز انہی کے دور میں شائع ہوئے اور پہلی دفعہ جنرل مشرف کے دور میں انہی کے خلاف ہی ایسی ایسی چیزیں شائع ہونا شروع ہوئیں جن کا تصور کرنا شاید مشکل تھا۔ سلیم بخاری نے ایک بھی پروفائل نہیں رکنے دیا۔ اگر میں یہاں جنگ گروپ کے مالک میر شکیل الرحمن کا ذکر نہ کروں تو یہ ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اس بات کا میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ میر شکیل الرحمن پر جنرل مشرف کا کتنا دباؤ تھا کہ وہ اس طرح کے انٹرویو چھاپنا بند کریں۔ جنرل علی قلی خان کے پروفائل کے بعد تو حد ہو گئی تھی کیونکہ اس سے جنرل مشرف کی ان سازشوں کا پردہ فاش ہوا تھا جو انہیں نواز شریف سے خفیہ ملاقاتوں کے بعد آرمی چیف کے عہدے تک لے گئی تھیں۔ میر شکیل الرحمن نے بڑی ہمت سے میرے سارے پروفائل اخبار میں چھاپے۔ شاید اگر وہ جنرل مشرف کے دباؤ میں آ جاتے تو آج یہ تاریخ اس طرح رقم نہ ہو پاتی جس طرح اس کتاب کی شکل میں ہو رہی ہے۔ میں اس کتاب پر زیادہ تبصرہ اس لیے نہیں کرتا

چاہتا ہوں کہ آپ اسے اپنا [illegible] اور [illegible] سے [illegible] اپنے [illegible] کہ اس ملک کو [illegible]
[illegible] سیاستدانوں نے کس طرح [illegible] اس حال تک [illegible]
[illegible] ہے۔ یہ سیاستدانوں کی وہ داستان ہے جس کا [illegible]
کہانی کے تمام [illegible] آنکھوں کے سامنے [illegible] ہیں اور سب [illegible] ہے۔ کسی نے
کوئی سبق نہیں سیکھا۔ میں چاہتا ہوں کہ [illegible] سیاستدانوں سے [illegible] اس قابل نہیں پایا کہ میرے دل میں ان
کے لیے کوئی عزت و احترام پیدا ہوتا۔ سب کو میں نے کسی نہ کسی سازش میں شریک پایا اور مقصد ایک ہی
تھا کہ اقتدار میں جا کر اپنی نسلوں کا مستقبل سنوارنے کی کوشش کی جائے۔ لہٰذا ان [illegible]
[illegible] اس ملک سے [illegible] جس کی شاید انہوں نے خواہش بھی نہیں کی تھی اور [illegible] میں وہ اس
ملک اور اس کے باسیوں کو [illegible] بھی نہیں لوٹا سکے۔ ہماری فوج اور [illegible] سے [illegible] بھی شاید [illegible] کے
ادارے ہیں جو اپنے سیاستدانوں کو کرپٹ اور [illegible] کر کے بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومت کرتے ہیں۔

جیو ٹی وی کے پروگرام "جواب دہ" کے شہرہ آفاق اور میرے پسندیدہ میزبان افتخار احمد نے ان
[illegible] کی روایت کو اپنے جارحانہ انداز کے ذریعے ایک نئی شکل دی اور ان تمام سیاستدانوں کو [illegible]
سے [illegible] کر [illegible] پر لے آئے اور [illegible] زبردست کام کیا۔

اس کتاب کے انتساب کا وقت آیا تو میرے دل اور دماغ میں ڈان کے [illegible] احمد
علی خان کی تصویر چمک کر رہ گئی۔ جولائی 1998ء کی بات ہے میں اس وقت ملتان میں ڈان کا ایک
معمولی سا نمائندہ تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ ڈان اسلام آباد میں ایک رپورٹر کی جگہ خالی ہے۔ پتہ نہیں میرے
ذہن میں کیا سمایا کہ میں نے بھی خان صاحب کو ایک درخواست لکھ کر بھیج دی۔ میرے لاہور کے ایڈیٹر
طاہر مرزا صاحب بہت ناراض ہوئے۔ نوکری سے نکالنے تک کی دھمکی دے دی کہ تمہیں یہ جرأت کیسے
ہوئی کہ تم ملتان سے اپنا تبادلہ اسلام آباد کراؤ۔ ڈان لاہور کے سب دوستوں نے منع کیا کہ خان صاحب
کو درخواست بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہ مرزا صاحب کی مرضی کے بغیر میرا تبادلہ ہرگز نہیں کریں
گے۔ انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ اسلام آباد کی اس ایک سیٹ کے لیے پہلے ہی لاہور اور کراچی کے
کئی رپورٹرز درخواست دے چکے ہیں اور ان میں سے کوئی تجربے کی بنیاد پر اسلام آباد بھیجا جائے
گا۔ میں نے دوستوں سے کہا جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ زندگی میں اس طرح کے [illegible] چانس لینے میں کوئی

حرج نہیں۔ [illegible] میں نے خان صاحب کو [illegible]
[illegible]
گئے۔ [illegible]
درخواست میں [illegible]
[illegible] اسلام آباد [illegible]
[illegible] کرنے کی [illegible]

جب بھی خان صاحب فون پر آئے تو ان کی [illegible] آواز میرے کانوں میں گونجی کہ میں نے اس
دن [illegible] درخواست منظور کر کے آپ کا تبادلہ اسلام آباد کر دیا ہے۔ خان صاحب نے کہا کہ وہ
اسلام آباد کے بیورو چیف ضیاء الدین صاحب سے بھی فون پر بات کر چکے ہیں۔ میں جب بھی جانا
چاہوں میری مرضی ہے۔ انہوں نے میری رپورٹنگ کے بارے میں چند تعریفی کلمات کہے اور کہا کہ
مجھے یقین ہے کہ تم اسلام آباد جا کر اپنا نام پیدا کرو گے۔ کراچی اور لاہور کے رپورٹرز کو تو پہلے ہی
مواقع ملتے رہتے ہیں۔ اب کی دفعہ ملتان کے رپورٹر کو یہ موقع ملنا چاہیے۔ تم اپنی [illegible]
نوکری [illegible] اور اسلام آباد چلے جاؤ۔

میں ریسیور ہاتھ میں پکڑے پتہ نہیں کتنی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ پتہ نہیں کہاں سے چند آنسو میری
آنکھ سے نکلے اور میرا سر احمد علی خان صاحب کے لیے احترام سے ایسا جھکا کہ آج تک جھکا ہوا ہے اور
ہمیشہ جھکا رہے گا۔ ان کے اس ایک فیصلے نے میری زندگی بدل دی۔ میری یہ کاوش انہی کے نام ہے۔
ان کی موت کا سن کر ایسا لگا تھا کہ کوئی اپنا بچھڑ گیا ہے۔

خان صاحب کا ذکر چلا ہے تو ڈان اسلام آباد کے بیورو چیف ضیاء الدین صاحب کی شفقت
اور پروفیشنل ازم [illegible] بھی اب یادوں کا حصہ ہے۔ میرے ڈان کے دنوں کے دوست اور خوبصورت
انسان ناصر ملک نے بھی مجھے اپنی غلطیاں دور کرنے میں بڑی مدد کی ہے۔ آج بھی جب ڈان کے بیورو
جاتا ہوں اپنے دوست ارشد شریف، شہزاد رضا، اسد محمود اور مطیع اللہ جان سے ملنے جاتا ہوں تو اکثر وہاں
خاموش بیٹھا رہتا ہوں کہ وہاں ضیاء الدین، ناصر ملک، شاہین صہبائی، افتخار الحق، اکرام ہوتی،
احمد حسن علوی، محمد یاسین، سید عرفان رضا جیسے دوستوں کی یاد ستاتی ہے۔

[illegible]

میں قریال، احمد اور مہد کی محبتوں کا مقروض ہوں۔ صحافت سے جڑے میرے اس جنون کی قیمت اگر کسی نے ادا کی ہے یا کر رہے ہیں تو وہ یہ تینوں ہیں جن کے بغیر ذاتی زندگی ہرگز اتنی خوبصورت اور مطمئن نہ ہوتی جتنی مجھے اب لگتی ہے!

رؤف کلاسرا

اسلام آباد

زاویے

رؤف کلاسرا کی کتاب "ایک سیاست کئی کہانیاں" بہت اچھی کاوش ہے جس کی آجکل کے دور میں پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔

ہمارے ہاں کتابیں لکھنے کا رجحان بہت کم ہے۔ اس طرح کی کتابیں خاص طور پر سیاست پر اور زیادہ لکھی جانی چاہییں اور لکھنے والا اگر صحافی ہو اور وہ بھی ایسا جسے سیاست اور اس کے کرداروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہو تو موضوع میں جان پڑ جاتی ہے۔

صحافت میں رپورٹر کو دفتر میں بیٹھے ہوئے اداریہ نویسوں، یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے پروفیسروں (ریسرچرز) یا محققوں کے مقابلے میں حالات کو بلاواسطہ (First hand) دیکھنے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ اسی لیے رپورٹنگ کو تاریخ کا پہلا ڈرافٹ کہا جاتا ہے۔ اگر رپورٹر میں بہتر مشاہدہ، متاثر کن پس منظر اور لکھنے کی صلاحیت بھی موجود ہو تو رپورٹ میں مزید "چار چاند" لگ جاتے ہیں۔

مگر میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ سیاسی رپورٹنگ کے لیے ایک خاص شوق بلکہ جسے عرف عام میں "کیڑا" کہتے ہیں، اس کے ہونے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

رؤف کلاسرا میں بلاشبہ وہ "کیڑا" موجود ہے جس کی وجہ سے وہ حالات و واقعات کو سیاسی تناظر میں پرکھتا ہے۔ یہ کیڑا اس کو 24/7 ڈیوٹی پر رکھتا ہے جس میں وہ ہر مشاہدے کا ذاتی نوٹس لے [illegible]

ہوتا ہے۔ سیاستدان ایسی صحبتوں کی کھوج میں رہتا ہے جہاں سیاسی گفتگو ہو سکے۔ یہ "گیم" [illegible] کو سمجھنے اور واقعات کی بڑی کہانیوں سے کڑیاں جوڑنے میں مصروف رکھتا ہے۔

پاکستان میں سیاسی صحافت کے لوازمات ذرا مختلف ہیں۔ گورے صحافیوں کے لیے پاکستان کا موروثی جاگیرداری اور برادری پر مبنی معاشرہ سمجھنا ایک مشکل عمل ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے اپنے انگلش میڈیم صحافی بھی پاکستانی سیاست کے مقامی پیچ و خم، سیاسی کرداروں اور جماعتوں کی تاریخ اور مختلف ادوار کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے کا تردد نہیں کرتے۔ میرے کافی ایسے "مقامی گورے" صحافی دوست ہیں جو فخریہ بتاتے ہیں کہ ان کی اردو بہت کمزور ہے اور یہ کہ وہ اردو اخبار بالکل نہیں پڑھتے۔ اکثر بڑے شہروں میں پلے بڑھے ہیں اور نچلے طبقوں کے معاشرتی مسائل سے بہت کم واقفیت رکھتے ہیں اور جو صحافی درمیانے اور نچلے طبقوں سے ترقی کر کے اوپر آ گئے ہیں، اسلام آباد اور بڑے شہروں کی رنگینیاں ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور وہ اپنے ماضی سے جان چھڑاتے نظر آتے ہیں۔

صحافت میں پاکستانی معاشرے میں موجود یہ طبقاتی مسائل ہمیشہ رہے ہیں۔ مگر اب فرق یہ ہے کہ سیاست سے نابلد صحافیوں کی ایک پوری نسل ایسے عہدوں پر براجمان ہو چکی ہے کہ وہ رائے عامہ کو ایک اندھیری گلی میں دھکیلتی نظر آتی ہے۔

ٹیلی ویژن کی آمد سے یہ رجحان مزید خطرناک ہو گیا ہے۔ اینکرز کا ایک حلقہ اسلام آباد کے ڈرائنگ روموں کی گپ شپ، ایجنسیوں کی پھیلائی ہوئی سازشی افواہوں اور مراعات یافتہ مافیا کے پراپیگنڈے کو سیاسی تجزیے کے طور پر روزانہ پیش کرتا نظر آتا ہے۔

اکثر اینکرز کا صحافتی تجربہ کچھ سالوں یا مہینوں پر محیط ہے جس میں اچھے زمانوں میں صحافیوں کو سیاسی رپورٹنگ کی مشکل اجازت ملتی تھی۔ انھیں نہ تو ڈرائنگ روموں کی ذات ذہنیت کا تجربہ ہے نہ فیلڈ رپورٹنگ کا۔ یہ ایسے ادوار کی پیداوار ہیں جس میں سیاسی عمل یا تو مفقود تھا یا اس کی کوئی اکھڑی شکل سیاست کے طور پر موجود تھی۔ اس کی وجہ سے یہ موجودہ صحافتی سیاست اور سیاستدان کے خلاف بڑی جلدی تعصب قائم کر لیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف ملک میں جمہوریت کے پروان چڑھنے میں دشواری ہوتی ہے بلکہ ہم ایک بارش اور متبادل خیالات کو برداشت کرنے والے معاشرے کو قائم کرنے سے قاصر ہیں۔ آج کے دن پاکستانی ذرائع ابلاغ پر سیاسی موضوعات پر ایسی بھونڈی بحث نظر آتی ہے کہ انسان کا سر پیٹنے کو دل کرتا

ہے۔ ایک بنیادی سوال ہے جس میں جھوٹی خبر بغیر تناظر کے اس طرح اچھال دی جاتی ہے کہ اس سے حکومت اور بلکہ پورا جمہوری نظام خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

مہذب معاشرے میں سیاستدان ناکام ہوتے ہیں۔ حکومتیں گرتی ہیں۔ آئینی تبدیلیاں ہوتی ہیں اور ادارے اختیارات پر لڑتے بھی ہیں مگر اس سے نظام، ریاست یا قومی سلامتی پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ اٹلی میں پچھلے 25 سال میں پاکستان کے مقابلے میں دوگنا حکومتیں گر چکی ہیں۔ امریکہ میں سپریم کورٹ نظریاتی بنیاد پر استوار ہے۔ ججوں کے نظریات، زندگی اور فیصلوں پر عام تنقید ہوتی ہے۔ فرانس کے صدر کی اہلیہ ان کی تیسری بیوی بننے سے پہلے ننگے جسم کی ماڈلنگ کرتی تھی۔ جاپان اور برطانیہ میں آئے دن سیاستدان مالی اور جنسی سکینڈلز میں پکڑے جاتے ہیں۔ مگر ان واقعات سے ان ملکوں کی قومی سلامتی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ کوئی یہ راگ نہیں الاپتا کہ یہ ناکام ریاست ہے یا یہ ملک ٹوٹ جائے گا بلکہ اس طرح کی بحثیں ملک، جمہوریت اور صحتمند معاشرے کے لیے بہت مفید ہیں۔ یہ تب ہی ممکن ہے اگر سیاست اور سیاستدانوں کو صحیح تناظر میں دیکھا جائے۔

پاکستان میں تو ویسے ہی سیاست کو سات خون معاف کر دیے جائیں۔ جس ملک میں اس کی تاریخ کے آدھے وقت فوج حکمران رہی ہو، وہاں سیاست کو کیسے گالی دی جا سکتی ہے۔ جنہیں ہم سیاستدان کہہ کر تھوکتے ہیں، زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنہیں مختلف ادوار میں ایجنسیوں نے بڑی محنت کے بعد چنا ہوتا ہے تاکہ وہ ان کے ایجنڈے پر کاربند رہیں اور سیاسی عمل کو پنپنے نہ دیں۔ ان میں سے کچھ لوگ جب نیک بننے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم صحافی ان کو ان کا مکروہ ماضی یاد دلا کر اتنے پتھر مارتے ہیں کہ وہ بیچارے یا تو سیاست چھوڑ دیتے ہیں یا دوبارہ اسٹیبلشمنٹ کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ تمام بڑی جماعتیں، مسلم لیگ (ن)، ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی یا تو فوج کی تخلیق شدہ ہیں یا ان کے قائدین نے مارشل لا دور کی کوکھ سے جنم لیا ہے، مگر اس کے باوجود مختلف ادوار میں سب نے اپنی بساط بھر عملی حالات کے مطابق ملک و معاشرے کی بھلائی کے لیے کاوشیں کی ہیں۔

اس سب کے لیے سیاست کی اہمیت کے بنیادی فلسفے پر بات کرنا ضروری ہے۔ ضروری نہیں کہ ہمارے ہاں عمومی طور پر پائی جانے والی سیاست اور اس سے وابستہ کردار اور جماعتوں کے متعلق جو آرا پائی جاتی ہیں وہ صحیح ہوں۔ ضروری نہیں کہ سیاست کا مطلب مال بنانا اور طاقت کا حصول ہو۔ ضرورت

[illegible]

[illegible] سے روشناس کراتا ہے۔

سیاست کی ایک بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ ایسا نظام مہیا کرے جس میں عوام [illegible] اور ان [illegible] سیاستدان [illegible] اپنے آپ کو عوام کے سامنے پیش کیا ہے کیونکہ ان سے کردار اور اہلیت [illegible] طاقت [illegible] کے لیے استعمال کرے گا اور انسان کو یہ حق ہے کہ اس کے کردار کے متعلق جانچ پڑتال کر سکے۔ سیاسی عمل [illegible] کس وقت کیا اور کیوں کیا [illegible] کام سے عوام کے مسائل کا کیا تعلق ہے۔ سیاست عوامی مسائل کے متعلق ہے نہ کہ سیاسی بیانات سے!

ہم یہ لازم سمجھتے ہیں کہ ہم سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں کو یہ موقع دیں جس میں سیاسی عمل اور ارتقا جاری رہے۔ ایسا سیاسی کلچر پروان چڑھے جس میں ہم سیاستدانوں پر جائز تنقید بھی کرتے رہیں اور سیاسی نظام بھی نہ لڑکھڑائے۔ جس میں سیاستدانوں اور جماعتوں کو عوام ووٹ کے ذریعے ہی لے کر آئیں اور ووٹ کے ذریعے ہی تبدیل کریں۔ جس میں رائے عامہ اتنی مضبوط ہو کہ سیاسی جماعتیں وراثتی اور موروثی امیدواروں کی جگہ سیاسی کارکنوں کو فروغ دیں اور اپنی جماعت کے اندر بھی جمہوری کلچر نافذ کریں۔ جس میں کاروباری اور کرپٹ مافیا کا کردار کم ہو اور عام آدمی بھی سیاست میں ترقی کر سکے۔ جس میں آزاد الیکشن کمیشن سب کے لیے مساویانہ موقع فراہم کر سکے اور عوام میں ووٹ کی طاقت کا ادراک بڑھ سکے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایسی بحث و مباحثہ یا informed public discourse ہو جس میں عوام اچھے اور برے کا بہتر تعین کر سکیں۔

ایسی پڑھی لکھی Debate تب ہی ممکن ہے جب ہمارے سیاسی رپورٹر یا تجزیہ نگار (جو کہ آج کے تجزیہ باز صحافیوں سے مختلف ہیں) کو اپنے موضوع کا بہتر ادراک ہو اور یہ سب تب ہی ممکن ہے جب نئے تجزیہ نگاروں کو وہ مواد مہیا ہو جس سے وہ کل کے واقعات جان کر آج اور آنے والے کل کے متعلق بہتر بات کر سکیں۔ رؤف کلاسرا کی یہ کاوش آج کے ان تجزیہ نگاروں کے لیے بہت مفید ہے جن کے پاس رائے عامہ کو تبدیل کرنے کی طاقت تو بہت ہے مگر سیاست کو سمجھنے کا تجربہ، جماعتوں کے اسرار و رموز، مقامی سیاست کے مسائل اور علاقائی تفریقوں سے آگاہی بہت کم ہے۔

[illegible]

عامر متین

[illegible] اسلام آباد

چوہدری شجاعت حسین

مجھے چوہدری شجاعت حسین سے ملنے کا شوق اس وقت ہی پیدا ہو گیا تھا جب اڈیالہ جیل میں قید یوسف رضا گیلانی اور اسلام آباد کے سب سے مہنگے ترین علاقے ایف سیون سیکٹر میں واقع اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بات بات پر مسکراتے اور قہقہے لگاتے سید مشاہد حسین نے مجھے ایک ہی بات بتائی کہ جب ان دونوں کو 12 اکتوبر 1999ء کی فوجی بغاوت کے بعد گرفتار کیا گیا تو جو شخص ان کے گھر سب سے پہلے اپنی جیبوں میں پیسے ڈال کر ان کے بیوی بچوں کی خیریت دریافت کرنے گیا تھا وہ اور کوئی نہیں چوہدری شجاعت تھا۔

پتہ نہیں کیوں میرے ذہن میں چوہدری شجاعت کا امیج ایک ایسے سیاسی گاڈ فادر کا سا بن گیا تھا جو مشکل وقت میں اپنے دوستوں اور دشمنوں کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار تھا۔ شاید چوہدری صاحب بھی ماریو پوزو کے ناول گاڈ فادر کے ڈان کورلیون کی طرح اپنے اندر ایک ایسی جبلت لے کر پیدا ہوئے تھے جس کو اس بات کا احساس تھا کہ اپنے سیاسی مخالفین کو جیتنے کا سب سے بہتر موقع وہ تھا جب وہ کسی بہت بڑی مصیبت کا شکار تھے۔ کہنے کو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انہیں یوسف رضا گیلانی کے گھر والوں کی مصیبتوں کا اس لیے بھی علم تھا کیونکہ وہ خود پرویز الٰہی کے ساتھ اسی اڈیالہ جیل میں قید و بند کی صعوبتیں اٹھا چکے تھے۔ یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ جنرل مشرف کے ساتھ مل کر تو انہوں نے گیلانی کو

دیکھ رہا تھا لہٰذا اس سے بہتر کون جانتا تھا کہ ان کے قیدی کے گھر میں اب پیسوں کی کمی تھی۔

اب 23 اپریل 2003ء کو میں ایف ایٹ مرکز میں واقع چوہدری شجاعت کی رہائش گاہ کے باہر پہنچا تو وہاں قیمتی گاڑیوں کی لمبی قطاریں دیکھ کر کسی بھی شخص کا پہلا تاثر یہی ہوتا کہ اس ملک کا اصل حکمران جنرل مشرف نہیں بلکہ جو اس گھر میں رہتا تھا۔ بہت بڑے ڈرائنگ روم میں ہر قسم کے سیاسی چہرے دیکھے جا سکتے تھے۔ وہاں کوئی وزیر بننا چاہ رہا تھا تو کوئی پارلیمانی سیکرٹری اور کچھ نہیں تو اسٹینڈنگ کمیٹی کا چیئرمین ہی لگ جائے۔ چوہدری شجاعت کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ہر پانچ منٹ بعد اس سیاسی مجمع میں سے کوئی اچانک آگے نکل کر اپنے نتھنے پھلائے زور سے اپوزیشن کے خلاف تقریر کرنا شروع کر دیتا کہ بھلا جنرل مشرف کے لیگل فریم ورک آرڈر کی مخالفت کرنے کی کیا تک تھی۔

میں خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھا ان سیاسی لوگوں کی مضحکہ خیز باتیں سن رہا تھا کہ کسی نے آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا اور بولا کہ میں چوہدری شجاعت کا انتظار کروں۔ ابھی مجھے بیٹھے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور چوہدری شجاعت اندر داخل ہوئے۔ میں کھڑا ہوا تو وہ بڑی عزت و احترام سے ملے۔ ان کا خیال تھا کہ میں شاید موجودہ سیاسی صورتحال پر ان کا کوئی روٹین میں انٹرویو کرنا چاہ رہا تھا۔ میں مسکرایا اور انہیں بتایا کہ چوہدری صاحب یہ انٹرویو تو چلتے رہتے ہیں اور مجھ سے بہت بہتر صحافی یہ کام زیادہ اچھے طریقے سے کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں کچھ اور بات تھی۔ میرے خیال میں لوگ جاننا چاہتے ہوں گے کہ آپ ایک عام سیاستدان سے ایک سیاسی کھلاڑی کیسے بنے۔ وہ شخص جس کے گھر کو 12 اکتوبر کی رات [illegible]

[illegible]

چوہدری شجاعت تھوڑی دیر کے لیے چپ ہوئے اور بولے کہ اس کا مطلب ہے آپ کو خصوصی ٹائم دینا پڑے گا اور یہ گفتگو تو پھر یہاں بیٹھ کر نہیں ہو سکتی۔ تو کیا خیال ہے کل سے کسی اور جگہ ملا جائے۔ ابھی میں کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ اس وقت پیپلز پارٹی کے ایک باغی ایم این اے رضا حیات ہراج کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ مجھے نہیں پہچانتے تھے لہٰذا انہوں نے کھل کر چوہدری شجاعت کو بتایا کہ کیسے پیپلز پارٹی والوں کو ڈنڈا دیا تھا۔ چوہدری شجاعت نے ہاں ہوں میں جواب دیا۔

اگلے دن جب میری ملاقات چوہدری شجاعت سے منسٹرز انکلیو میں رہائش پذیر وزیر صحت نصیر خان کے گھر پر ہوئی تو پھر چوہدری شجاعت نے اپنی زندگی کے اہم رازوں سے پردہ اٹھانا شروع کیا اور ایک نئی کہانی کی ابتدا ہوئی۔

چوہدری شجاعت نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن وہ بھی سیاست کے میدان میں داخل ہوں گے۔ ان کے باپ چوہدری ظہور الٰہی اور ان کے خاندان کی جتنی بھی فیکٹریاں تھیں وہ ذوالفقار علی بھٹو نے 1970ء میں سرکاری کے نام پر اپنے قبضے میں لے لی تھیں۔ یوں بھٹو اور چوہدری خاندان میں دشمنی کی بنیاد پہلے ہی پڑ چکی تھی۔ جب جنرل ضیاء نے بھٹو کا تختہ الٹا تو چوہدری خاندان نے آگے بڑھ کر اس فوجی ڈکٹیٹر کو اپنے گلے سے لگایا کیونکہ دشمن کا دشمن ہمیشہ آپ کا دوست ہوتا ہے۔ ان دنوں جنرل ضیاء اور چوہدری ظہور الٰہی کو پتہ نہیں تھا کہ بہت جلد ان کے خاندانوں میں ایک ایسی مستقل دشمنی کی بنیاد پڑنے والی تھی جس کی بازگشت 27 سال بعد بھی اکتوبر 2007ء میں اس وقت سنی گئی جب بے نظیر بھٹو نے یہ الزام لگایا کہ چوہدری پرویز الٰہی 18 اکتوبر کی رات کراچی میں ہونے والے بم دھماکے میں ملوث تھے [illegible]

[illegible] نواز شریف [illegible] چودھری شجاعت نے [illegible] ایک پیغام لے کر ان کے پاس آئے کہ آپ نواز شریف کا ساتھ چھوڑ دیں [illegible] پنجاب [illegible] آپ اپنی پارٹی کے اندر ایک فارورڈ بلاک بنا لیں۔ چودھری شجاعت کا [illegible] کہ ملاقات کر کے ڈیل کرنے کو تیار تھے مگر شجاعت اور پرویز الٰہی نے [illegible] پارٹی کی حکومت سے جیل میں بیٹھ کر ڈیل کرنے سے انکار کر دیا۔

اس پر میں نے شجاعت سے پوچھا کہ اگر وہ نواز شریف کے اتنے ہی وفادار تھے تو انہوں نے 12 اکتوبر 1999ء کے بعد نواز شریف کا ساتھ چھوڑ کر جنرل مشرف کے ساتھ ڈیل کیوں کر لی تھی۔

شجاعت نے بڑی تلخی سے میری اس بات کو مسترد کیا کہ نواز شریف کے دور اقتدار میں مزے لینے کے بعد انہوں نے برے دنوں میں ان کا ساتھ چھوڑ کر جنرل مشرف سے ہاتھ ملا لیا تھا۔

ان کے بقول نواز شریف نے جیل سے ہی انہیں، میاں اظہر، اعجاز الحق اور چند دوسرے لوگوں کو پارٹی سے نکال دیا تھا۔ اس لیے یہ کہنا غلط تھا کہ انہوں نے پارٹی چھوڑ دی تھی بلکہ حقیقت یہ تھی کہ انہیں پارٹی سے نکالا گیا تھا۔ شجاعت نے الٹا مجھ سے سوال کیا کہ لوگ یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ دراصل اس وقت جو کچھ نواز شریف نے کیا تھا وہ ایک فوجی جنرل سے ڈیل کر کے ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

پھر نواز شریف کے درمیان اندرونی اختلافات کی کہانی سناتے ہوئے شجاعت نے کہا کہ دراصل 1997ء کے بھاری مینڈیٹ نے ان کی شخصیت پر برا اثر ڈالا تھا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ شاید [illegible] کام کرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے اور اسی چکر میں انہوں نے ایسے کام شروع کیے [illegible] 1997ء کے الیکشن کے فوراً بعد ایک [illegible] شجاعت اور [illegible] نواز شریف [illegible]

کی تھی [illegible] شجاعت نے [illegible] نواز شریف [illegible] 1998ء میں نواز شریف کی سربراہی میں ایک میٹنگ [illegible] کے بعد شجاعت نے [illegible] پتا چلا کہ [illegible] کی حکومت [illegible] ہو رہی ہے۔

میرے تجسس کو دیکھ کر چودھری شجاعت نے انکشاف کیا کہ اس میٹنگ کے شروع ہونے سے پہلے نواز شریف نے وہاں موجود تمام لوگوں سے جن میں اس وقت کی اسمبلی کے سربراہان موجود تھے قرآن پر حلف لیا تھا کہ وہ اس میٹنگ کی کسی بات کو باہر نہیں بتائیں گے۔ اس میٹنگ میں بہت ہی خوفناک قسم کے فیصلے کیے گئے تھے۔

میں بڑا حیران ہوا کہ بھلا ایسے وہ کون سے فیصلے تھے جنہوں نے چودھری شجاعت حسین جیسے بندے کو بھی پریشان کر دیا تھا۔

چودھری شجاعت کچھ دیر سوچتے رہے کہ وہ مجھے بتائیں یا نہ بتائیں۔ خاصی دیر بعد انہوں نے ایک اشارہ دیا کہ اس میٹنگ کے فوراً بعد پنجاب اور کراچی میں ماورائے عدالت قتل ہونا شروع ہو گئے تھے۔

شجاعت جو اس وقت وزیر داخلہ تھے، ان کے بقول انہوں نے غیر قانونی فیصلوں کے خلاف مزاحمت کی تھی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ چاہے مجرم ہی کیوں نہ ہو، اس کو بھی عدالت میں اپنے آپ کو دفاع کرنے کا حق دیا جانا چاہیے۔ شجاعت کو اس بات کا دکھ تھا کہ وہ حافظ قرآن کو جیل سے نکال کر ایک جعلی پولیس مقابلے میں گولی مار دی گئی تھی۔

یہ علیحدہ بات ہے کہ چودھری شجاعت ان فیصلوں کے خلاف تھے، لیکن ان کی وزارت ان فیصلوں کی وجہ سے بدنام بھی ہو رہی تھی۔

جب میں نے چودھری شجاعت کی آواز میں افسردگی محسوس کی تو مجھ سے رہا نہ گیا اور پوچھ لیا کہ اگر وہ [illegible] فیصلے انہیں غلط لگے تھے تو انہوں نے [illegible] وزارت سے [illegible]

کیوں دے دیا تھا؟

چوہدری شجاعت نے میری آنکھوں میں دیکھا اور بولے کہ رؤف صاحب ایمان سے بتاؤں کہ مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ میں نواز شریف کی سربراہی میں ہونے والی میٹنگز میں واحد شخص ہوتا تھا جو کھل کر نواز شریف کے اس طرح کے غلط فیصلوں کے خلاف مزاحمت کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہر وقت کہتا تھا کہ اس طرح کے فیصلے وہ کرتے تھے جن سے ان کی اپنی حکومت اور ملک کو شدید نقصان ہوا۔ شجاعت کے بقول جب نواز شریف ملک میں اپنی مرضی سے عدالتیں قائم کرنا چاہ رہے تھے اور یہ بات کابینہ کے سامنے رکھی گئی تو انہوں نے اس کو سارے کابینہ کے سامنے ہی رد کر دیا۔ تاہم نواز شریف اڑے رہے اور انہوں نے اگلی کابینہ میٹنگ میں اس کی منظوری لے لی۔ اس پر چوہدری شجاعت نے نواز شریف کو خبردار کیا تھا کہ ایک دن ہم سب کو ان عدالتوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے لہٰذا بہتر ہے کہ ہم ان کے قیام سے گریز کریں اور پھر ایک دن جنرل مشرف نے نواز شریف کی بنائی ہوئی اسی ایک عدالت سے انہیں عمر قید دی تھی۔

شجاعت کے بقول 12 اکتوبر کی بغاوت سے پہلے نواز شریف ہر قیمت پر فیصلہ کرنا چاہ رہے تھے کہ جو بھی سرعام اسلحہ کی نمائش کرے گا اسے سزائے موت دی جائے گی۔ اس کام کے لیے انہوں نے قانون کو استعمال کرنا تھا اور 14 اکتوبر 1999ء کو ڈیفنس کی کابینہ کمیٹی کی میٹنگ طلب کر لی گئی تھی جس میں یہ فیصلہ کیا جانا تھا۔ تاہم دو دن پہلے ہی ان کا اپنا تختہ الٹ دیا گیا۔ شجاعت کے ذمے ایک کام لگایا گیا تھا کہ وہ اس میٹنگ میں تمام ملٹری کمانڈروں کو اس منصوبے کے بارے میں بریف کریں گے اور آرمی سے کہا جائے گا کہ وہ نہ صرف اس معاملے میں ان سے تعاون کریں بلکہ سرعام اسلحہ کی نمائش کرنے والے لوگوں کو پکڑ کر ان کو سزائیں دی جائیں۔ شروع میں چوہدری شجاعت نے اس پلان کی بڑی مخالفت کی۔ ان کے بقول نہ صرف اس قانون کا غلط استعمال ہوگا بلکہ یہ حکومت کے لیے بھی بہت مشکلات پیدا کرے گا۔ تاہم شجاعت کو کہا گیا کہ وہ 12 اکتوبر کو یہ سارا پلان کابینہ کمیٹی والے اجلاس میں پیش کرنے سے پہلے وزیراعظم سے ڈسکس کر لیں۔ اس میٹنگ میں جنرل پرویز مشرف نے بھی شرکت کرنی تھی اور چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ تاہم سب لوگ اس وقت بڑے حیران ہوئے جب غیر متوقع طور پر سندھ کے وزیراعلیٰ غوث علی شاہ نے وزیراعظم کے حکم کے باوجود اس میٹنگ میں شرکت نہیں کی تھی کیونکہ ابھی غوث علی شاہ پر یہ الزام لگتا ہے کہ انہوں نے فوجی بغاوت کی بو سونگھ لی تھی اور وہ اس میٹنگ میں شریک نہیں ہو رہے تھے۔ شجاعت کے بقول ان کے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس دن نواز شریف بہت خاموش تھے اور پریشانی واضح طور پر ان کے چہرے سے جھلک رہی تھی جیسے ان کے ذہن پر کوئی بہت بڑا بوجھ ہو۔ یہ میٹنگ کوئی دو بجے کے قریب ختم ہوئی اور تمام لوگ نواز شریف کے ساتھ ہی اسلام آباد چلے گئے تاہم چوہدری شجاعت وہاں سے نکل گئے کیونکہ انہوں نے چار بجے کسی کے ساتھ لنچ کرنا تھا۔

اس طرح شاید چوہدری شجاعت تھوڑی دیر کے لیے ایک بڑی مصیبت سے بچ گئے ورنہ اگر 12 اکتوبر والے دن وہ وزیراعظم کے ساتھ چلے جاتے تو وہ بھی وہاں باقی سارے دوسرے لوگوں کی طرح فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے جو وہاں جنرل ضیاء الدین بٹ کو نیا آرمی چیف بنانے کی تقریب میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔

میں نے چوہدری شجاعت سے پوچھا کہ آخر نواز شریف نے جنرل مشرف کو آرمی چیف کے عہدے سے ہٹانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا؟

بغیر کسی ہچکچاہٹ کے شجاعت نے جواب دیا کہ نواز شریف ان دنوں غیر سیاسی لوگوں کے گھیرے میں آئے ہوئے تھے اور انہوں نے ہی ان سے وہ احمقانہ فیصلے کروائے تھے۔ کابینہ کے کسی ایک ممبر کو بھی اس فیصلے کی بھنک نہیں پڑنے دی گئی تھی۔ اور تو اور، شجاعت بھی جنرل مشرف کو ہٹائے جانے کے اس فیصلے سے لاعلم تھے۔ شجاعت کے بقول شریف برادران کا کچھ مزاج ہی ایسا تھا کہ وہ بڑے بڑے فیصلے بغیر سوچے سمجھے یا اپنے قریبی سیاسی ساتھیوں سے مشورہ کیے بغیر کر گزرتے تھے۔ چوہدری شجاعت کا خیال تھا کہ اگر نواز شریف نے مشرف کو ہٹانا ہی تھا تو اگر وہ اپنے قریبی ساتھیوں سے مشورہ کرتے تو اس سارے کام کو بڑے بہتر انداز میں کیا جا سکتا تھا۔ شجاعت کا اپنا خیال تھا کہ سری لنکا سے واپسی پر اگر مشرف کو بلا کر یہ کہا جاتا کہ انہیں آرمی چیف کے عہدے سے ہٹا دیا گیا ہے تو کوئی آسمان نہ گر پڑتا۔ شجاعت کے ذہن میں کوئی ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا کہ جنرل مشرف کے پاور میں آنے کا ذمہ دار اور کوئی نہیں، نواز شریف خود تھے۔ شجاعت اکثر نواز شریف کو بتایا کرتے تھے کہ آپ فوجی

[illegible]

[illegible]

میں نے شجاعت سے پوچھا کہ انہوں نے نواز شریف اور شہباز شریف دونوں کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ ان کے خیال میں دونوں بھائی کس مزاج اور طبیعت کے آدمی تھے۔

شجاعت کے خیال میں نواز شریف [illegible] اور ہر ایک کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آتے تھے۔ تاہم ان کی ساری شخصیت 1997ء کے الیکشن میں بھاری مینڈیٹ ملنے کے بعد بدل گئی تھی۔ نواز [illegible] شہباز شریف [illegible] کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ تاہم چوہدری شجاعت کا میاں شریف کے بارے میں [illegible] خیال تھا۔ ان کے خیال میں شریف [illegible] اور ان کے والد صاحب ان دونوں بھائیوں کے فیصلوں میں [illegible] لانے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کرتے تھے۔ کئی اہم موقعوں پر میاں شریف نے چوہدری شجاعت کی بڑی مدد کی جب انہوں نے ان دونوں بھائیوں کے غلط فیصلوں [illegible] میں بڑا اہم کردار ادا کیا ورنہ ان کی حکومت کے لیے بڑے شدید مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ میاں شریف خاندان کے بڑے کی طرح اپنی ایک رائے دیا کرتے اور یہ دونوں بھائی ان کا احترام کرتے تھے۔

[illegible]

شجاعت نے [illegible]

دراصل چوہدری شجاعت [illegible] تھے۔ [illegible] جنرل مشرف اور چوہدری شجاعت کے [illegible] ایک [illegible] دونوں میں [illegible] کے معاملے میں؟

جب میں نے چوہدری شجاعت سے کارگل کا ذکر کیا تو [illegible] جنرل مشرف اور نواز شریف کی جاری اختلافوں کی جنگ سامنے آ گئی۔ نواز شریف یہ مسلسل کہتے تھے کہ جنرل مشرف نے ان کو بتائے بغیر کارگل کا محاذ شروع کیا جس سے ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں [illegible] جنگ لڑنے کے قریب آ گئی تھیں۔ سب سے بڑھ کر پاکستان اور انڈیا کے درمیان جاری امن عمل [illegible] کو شدید دھچکا لگا اور پوری دنیا میں پاکستان اکیلا رہ گیا جبکہ جنرل مشرف ہمیشہ یہ دعویٰ کرتے رہے کہ کارگل کی جنگ باقاعدہ نواز شریف سے اجازت لے کر شروع کی گئی تھی۔ میں نے اس کو بہترین موقع جانا اور شجاعت سے پوچھ لیا کہ کیا ان کے خیال میں نواز شریف کو کارگل کے منصوبے پر اندھیرے میں رکھا گیا تھا اور ان کو بتائے بغیر ہندوستان سے اتنی بڑی جنگ چھیڑنے کی کوشش کی گئی۔

چوہدری شجاعت نے فوراً اس تاثر کی تردید کی اور بولے کہ نہیں، نواز شریف کو اس معاملے کا سب پتہ تھا۔ اس بات کا ثبوت دینے کی غرض سے شجاعت نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ ایک بریگیڈیئر کارگل پر بریفنگ دے رہے تھے۔ ایک مرحلے پر جنرل مشرف، جو اس میٹنگ میں شریک تھے، نے یہ محسوس کیا کہ نواز شریف کو اس بریگیڈیئر کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور بریگیڈیئر کے ہاتھ سے اسٹک لے کر جنرل مشرف نے کارگل آپریشن کی تمام تفصیلات بتانا شروع کر دیں۔

اچانک نواز شریف نے بڑی اونچی آواز میں کہا کہ جنرل تم نے تو یہ ساری باتیں مجھے کبھی نہیں

[illegible] جنرل مشرف رک گئے۔ انہوں نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی ڈائری نکالی اور بتایا۔ اس ڈائری میں انہوں نے نواز شریف کے ساتھ کارگل پر تفصیل سے تمام میٹنگوں کی [illegible] درج کر رکھی تھیں [illegible] گفتگو درج کی تھی۔ نواز شریف کا خیال تھا کہ اس میٹنگ میں موجود اس کے تمام وزرا ان کا ساتھ دیں گے، مگر [illegible] خاموش رہے اور شجاعت اور [illegible] ان کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔

[illegible]

[illegible] شجاعت نے کہا کہ اب چونکہ معاملہ بہت بگڑ گیا ہے [illegible] اپنے اختلافات بھلا دیں اور پریس کو ایک مشترکہ [illegible] کہ کارگل حل اور عسکری لیڈرشپ کا مشترکہ پلان تھا۔

تاہم نواز شریف نے چوہدری شجاعت کی یہ بات نہیں مانی بلکہ شجاعت کی اس بات سے نواز شریف [illegible] اور جب وہ میٹنگ سے اٹھ کر جانے لگے تو انہوں نے شجاعت سے [illegible] چوہدری شجاعت کے لیے [illegible] تھا کہ وہ کارگل کے مسئلے پر جنرل مشرف کی حمایت کرنے پر [illegible] تھے۔

[illegible] میں نے شجاعت سے پوچھا کہ جنرل مشرف کی حمایت کا سب سے بڑا فائدہ تو ان کے خاندان کو ہوا تھا [illegible] وزیر اعظم نواز شریف کی مخالفت کر کے جنرل مشرف کی حمایت کرتے رہے تھے اس کا انہوں نے بعد میں پورا پورا فائدہ بھی اٹھایا تھا۔

تاہم چوہدری شجاعت حسین اس بات سے متفق نہیں ہوئے اور بولے کہ جب اس ملک میں مارشل لا لگا تو جنرل مشرف کے دور حکومت میں انہیں اور ان کے خاندان کو سب سے زیادہ سیاسی انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ بتانے لگے کہ جونہی بغاوت ہوئی، ایک آرمی میجر لاہور میں واقع ان کے گھر پہنچا۔ اس نے ان کی خواتین کے ساتھ بدتمیزی کی اور ان سب کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ شجاعت حسین کی فیملی کو تنگ کرنے کی غرض سے ایک بہت بڑے لیول کی ٹیم ان کے گھر بھیجی گئی تھی کہ وہ جا کر ان کے ڈرائنگ روم تک چیک کریں تاکہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ وہ کتنے امیر لوگ تھے۔ اس پر اکتفا نہ کیا گیا اور [illegible] قسم کے سوالات کے جواب دینے کے لیے کہا گیا کہ ان کا کچن، باتھ روم، فلش اور اسی طرح

کی دیگر چھوٹی موٹی چیزیں کیسے اور کہاں سے خریدی گئی تھیں۔ باتھ روم میں پڑی [illegible] کی تفصیلات فراہم کرنے کو کہا گیا تھا۔ چوہدری شجاعت سے [illegible] ان سوالات کے جواب دینے [illegible] تاہم [illegible] ایک اور ٹیم وہاں پہنچ گئی جن کے ہاتھ میں وہ فارم موجود تھا اور انہوں نے باتھ روم [illegible] جواب دے سکے تھے۔

جب چوہدری شجاعت کے گھر پر اس طرح کا چھاپہ مارا گیا تو انہوں نے [illegible] طارق عزیز کو ٹیلی فون کیا جو اس وقت جنرل مشرف کے ساتھ تھے۔ طارق عزیز نے مشرف سے یہ پوچھا تو جنرل نے کہا کہ انہوں نے اس طرح کے کوئی آرڈرز جاری نہیں کیے۔ تاہم چوہدری شجاعت کی فیملی کے خلاف اس طرح کے ایکشن ہوتے رہے حتیٰ کہ ان کو [illegible]

جب شجاعت نے طارق عزیز کا نام لیا تو میں نے ان سے یہ پوچھا کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے طارق عزیز کو استعمال کرتے ہوئے جنرل مشرف سے اپنے تعلقات استوار کر کے آنے والے دنوں میں اس ملک کے پہلے سیاسی [illegible] کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

طارق عزیز چوہدریوں کے اس وجہ سے بھی بڑے ممنون تھے کہ جب ایک سول سرونٹ کی حیثیت سے آصف علی زرداری ان سے شدید ناراض ہوئے اور انہوں نے ان کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کی تو ان کی چوہدریوں نے جان بچائی تھی۔ اب وقت آ گیا تھا کہ طارق عزیز چوہدریوں کے ان احسانات کا بدلہ چکاتے۔ تاہم چوہدری شجاعت اس بات سے انکاری تھے کہ طارق عزیز نے ان کو کوئی سیاسی رول دے کر دینے میں کوئی اہم کردار ادا کیا تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے شجاعت نے انکشاف کیا کہ آپ طارق عزیز کی کیا بات کرتے ہیں۔ وہ تو میری جنرل امجد سے ایک میٹنگ بھی کرانے میں ناکام رہے تھے۔ یہ میٹنگ جنرل مشرف کے کہنے پر ہوئی تھی کیونکہ مشرف چاہتے تھے کہ میں ان سے مل کر اپنے خلاف نیب میں رجسٹر کیے گئے تمام کیسز کی وضاحت پیش کروں۔ طارق عزیز کی تمام تر کوششوں کے باوجود جنرل امجد سے ان کی میٹنگ نہیں ہو سکی تھی۔ شجاعت کے بقول جنرل مشرف کی حکومت نے دراصل The Most Wanted کے نام سے سیاستدانوں کی ایک فہرست تیار کی تھی جس کا نام 'Big Heads' رکھا گیا تھا۔ چوہدریوں کے خلاف مقدمات قائم کر کے انہیں ہراساں کرنے کا

حقیقت میں یہ تھا کہ [illegible] سمجھا جا سکے کہ ان کے تعلقات کے [illegible] چوہدری [illegible] کہ انہیں بھی کہیں چھوڑا جائے گا۔

میں نے [illegible] کے عالم میں شجاعت حسین سے پوچھا کہ [illegible] جنرل مشرف سے ملاقات کب ہوئی تھی؟ وہ بتانے لگے کہ دراصل انہوں نے جنرل مشرف سے ملنے کے لیے پیغام دیا تھا تاکہ وہ اپنے خلاف بنائے گئے کیسز کی وضاحت [illegible] تھی۔ اس میٹنگ کے بعد ہی جنرل مشرف نے انہیں یہ کہا تھا کہ وہ جا کر جنرل امجد سے ملیں [illegible] جب جنرل امجد نے چوہدری شجاعت حسین سے ملنے سے انکار کر دیا تھا [illegible] انہیں یہ بتا دیا گیا کہ وہ [illegible] اپنے آپ کو کلیئر کرائیں۔

اگرچہ چوہدری شجاعت حسین یہ بات چھپا گئے لیکن مجھے میرے قابل اعتماد ذرائع نے بتایا تھا کہ ان کی بار بار درخواستوں کے باوجود جنرل مشرف انہیں وقت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ آخر طارق عزیز نے ان کی مشرف سے ملاقات کا ایک طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ راولپنڈی کے پی سی ہوٹل میں کسی [illegible] کے بیٹے کی شادی تھی جہاں جنرل مشرف نے بھی آنا تھا۔ طارق عزیز نے چوہدری پرویز الٰہی اور شجاعت کو پہلے سے وہاں بلا لیا اور ان دونوں کو بھی اس جگہ پر بٹھا دیا جہاں سے مشرف نے گزرنا تھا۔ جونہی شادی کی تقریب ختم ہوئی مشرف اپنے [illegible] کے ساتھ وہاں سے نکلے تو یہ دونوں [illegible] ان کے سامنے آ گئے۔ مجبوراً جنرل مشرف کو ان سے ملنا پڑا اور ان کے اصرار پر انہیں ملاقات کا وقت بھی دیا [illegible] جنرل مشرف نے انہیں یہ کہا کہ وہ جا کر جنرل امجد سے ملیں [illegible] جنرل مشرف نے جنرل امجد کو بھی فون کر کے کہا کہ وہ ان دونوں کو ملنے کا وقت دیں [illegible] چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی [illegible] جنرل امجد نے ان سے ملاقات سے انکار کر دیا [illegible] چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی کے لیے [illegible] تھا۔

[illegible] NRO [illegible] آصف سعید [illegible]

آصف نے انہیں بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا اور بڑے غرور سے [illegible] بتایا کہ [illegible] آپ کاروبار کریں یا پھر سیاست۔ چوہدری شجاعت کی زندگی میں یہ دن بھی آنا تھا کہ انہیں ایک سرکاری افسر نے ایک آپشن دیا کہ سیاست اور کاروبار میں سے ایک کا فیصلہ کر لیں۔ چوہدری شجاعت نے اپنے آپ کو زندگی میں کبھی اتنا ذلیل محسوس نہیں کیا تھا۔ ایک لمحے کے بعد وہ دونوں [illegible] میاں آصف سعید کے گھر سے باہر نکل آئے۔ میاں آصف سعید میں اتنا تکبر بھرا ہوا تھا کہ وہ ان کو گھر سے باہر چھوڑنے بھی نہیں آئے۔

چوہدری شجاعت نے ایک دفعہ پھر میری آنکھوں میں دیکھا اور مجھے کہا کہ ہم دونوں اتنی بڑی بے عزتی اس لیے برداشت کر گئے کیونکہ ہمیں پتہ تھا کہ یہ آصف سعید نہیں بلکہ ان کے پیچھے بیٹھے جنرل محمود اور جنرل امجد بول رہے تھے۔

اگرچہ چوہدری شجاعت نے تو مجھے یہ بات نہیں بتائی لیکن مجھے ان کے لہجے سے یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ وہ لمحہ تھا جب چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی نے سوچا ہوگا کہ میاں آصف سعید جیسے چھوٹے افسر کے ہاتھوں ذلیل ہونے سے بہتر تھا کہ جنرل محمود اور جنرل امجد کے اصل باس جنرل مشرف کے دربار میں حاضری دی جائے [illegible] اگر [illegible] ذلیل اور بے عزت ہونا ہی ہے تو آصف سعید، جنرل محمود اور جنرل امجد جیسے لوگوں سے کیوں ہوا جائے اور یوں شجاعت اور پرویز الٰہی نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا اور کچھ عرصے بعد میاں آصف سعید جیسے لوگ اپنی پوسٹنگ اور [illegible] کے لیے چوہدری شجاعت کے دربار میں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔

چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی [illegible] مشرف سے [illegible] کہ وہ کیسے اپنے [illegible] ہاتھوں [illegible] کے خلاف [illegible] ہو گئے تھے۔

میں نے چوہدری شجاعت سے پوچھا [illegible] جنرل مشرف نے انہیں [illegible] 2002 کے [illegible] الیکشن [illegible] ہاتھوں [illegible] چوہدری شجاعت [illegible]

چوہدری شجاعت اس سے حیران ہوئے اور مجھ سے پوچھا کہ کس کی بات کر رہے ہیں۔ میں نے کہا وہی جو کہ شب میں تحریر ... اور سیف اللہ، سلیم سیف اللہ اور میاں اظہر جیسے بہت سارے سیاسی لیڈروں کی بات کر رہا ہوں جنھوں نے یہ الزامات لگائے تھے کہ انہیں جان بوجھ کر الیکشن میں ہرایا گیا تھا تاکہ چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی کی راہ ہموار ہو سکے اور وہ اپنی مرضی کی گیم کھیل سکیں۔ شجاعت نے میری بات بڑے دھیان سے سنی اور پھر بولے کہ یہ بالکل غلط بات تھی کیونکہ اگر وہ الیکشن جیت جاتے تو آج وہ بھی حکومت کا حصہ ہوتے۔ شجاعت کا خیال تھا کہ ان سیاسی لوگوں میں سے کوئی ایک بھی ان کے لیے کوئی بہت بڑا خطرہ نہیں تھا لہٰذا انہیں ہرانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

تاہم یہ بات بڑی واضح تھی جس کا اقرار اب چوہدری شجاعت نہیں کر رہے تھے کہ اگر میاں اظہر الیکشن جیت جاتے تو پھر یقیناً وہ پی ایم ایل کیو کے صدر ہونے کی حیثیت سے وزارت عظمیٰ پر اپنا حق جتلاتے اور یوں چوہدری پرویز الٰہی کے لیے پنجاب میں وزارت اعلیٰ کا عہدہ لینے میں جہاں دقت پیش آتی وہاں اگر وہ وزیر اعلیٰ بن بھی جاتے تو پنجاب سے ایک اور وزیر اعظم جس کا تعلق بھی لاہور سے تھا، اس کی موجودگی میں شاید وہ اتنی آزادانہ حکومت نہ کر سکتے جو انہوں نے بعد میں کی۔ لہٰذا اس بات میں بڑی حد تک سچائی ہو سکتی ہے کہ چند لیڈروں کو جان بوجھ کر ہرایا گیا تاکہ پنجاب سے کسی وزیر اعظم کو روکا جا سکے اور چوہدریوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنی سیاسی گیم کھیلی اور ظفر اللہ جمالی جیسے کمزور شخص کو وزیر اعظم بنا کر پنجاب پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ یہی نہیں بلکہ جب ظفر اللہ جمالی کا کام ختم ہوا اور ان کی جگہ ہمایوں اختر خان نے آئی ایس آئی اور طارق عزیز کی مدد سے وزیر اعظم بننے کی کوشش کی تو آخری لمحے میں چوہدری شجاعت جیسے زیرک سیاستدان نے میز ان پر الٹ دی اور شوکت عزیز کو وزیر اعظم بنوا دیا کیونکہ چوہدری برادران کسی قیمت پر یہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے کہ پنجاب سے کوئی وزیر اعظم بنے۔ ان کی یہ حکمت عملی بڑی کامیاب رہی اور 15 نومبر 2007ء کو جب قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ کر نئے الیکشن کرانے کے لیے نئی نگران حکومت بنائی گئی تو اس وقت تک پرویز الٰہی اپنے آپ کو بڑی کامیابی سے ملک کا اگلا وزیر اعظم ثابت کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ لیکن تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بینظیر بھٹو ماری گئیں اور یوں ساری گیم پلٹ گئی۔

چوہدری شجاعت ابھی بھی باتیں کر رہے تھے اور میرا ذہن ان کی سیاسی کھیل سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ایک طرف تو چوہدری شجاعت یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ 12 اکتوبر کے بعد ان کی فیملی کے ساتھ انتہائی توہین آمیز رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ ان کے گھروں کے [illegible] چیک کیے گئے۔ جنرل امجد جیسے لوگوں نے ان سے ملنے سے انکار کیا اور اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو میاں آصف جیسے بیوروکریٹ نے انہیں ذلیل کر کے پوری کر دی اور وہ پھر بھی جنرل مشرف کے ساتھ مل گئے۔ میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ یہ سارا کام جنرل مشرف کی ہدایت پر کیا جا رہا تھا تاکہ ان چوہدری برادران کے گلے میں رسی اس طرح ڈالی جائے کہ نہ صرف وہ خود جنرل مشرف کے لیے کام کرنے پر تیار ہو جائیں بلکہ اپنے جیسے سیاستدانوں کا ایک پورا ریوڑ ہانک کر ان کی شکارگاہ میں لے جائیں جنہیں استعمال کر کے وہ اس ملک پر حکومت کریں۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ جنرل مشرف نے نیب کو استعمال کر کے نہ صرف چوہدری شجاعت بلکہ دیگر تمام سیاستدانوں کو نکیل ڈال کر اپنے اقتدار کے لیے استعمال کیا۔

چوہدری شجاعت نے شاید میرے ذہن میں گردش کرتے ان سوالوں کو پڑھ لیا تھا لہٰذا انہوں نے خود ہی مجھے کہا کہ میں نے جنرل مشرف کے اقتدار کی اس لیے حمایت کی تھی کیونکہ ان میں اور مشرف میں ایک چیز بڑی مشترک تھی کہ دونوں نیشنل سیکیورٹی کے بارے میں ایک ہی رائے رکھتے تھے۔ چوہدری شجاعت نے مشرف کے لیے کی جانے والی اپنی حمایت کے جواز ڈھونڈنے جاری رکھے اور مجھے بتایا کہ ماضی کے جرنیلوں کے برعکس جنرل مشرف نے مارشل لا نہیں لگایا تھا بلکہ انہیں یہ کام کرنے پر مجبور کیا گیا۔ تاہم، چوہدری شجاعت مجھے یہ بتانا نہیں بھولے کہ وہ ملک میں فوجی حکومت کے خلاف تھے۔ چوہدری صاحب کے خیال میں ماضی میں جتنے بھی مارشل لاء لگائے گئے وہ سب غلط تھے اور ان کے لیے ان تمام جرنیلوں کو ذمہ دار سمجھنا چاہیے جنہوں نے اپنے ذاتی مفادات کے لیے جمہوریت کی گاڑی کو پٹڑی سے اتارا۔ تاہم، ایک سمجھدار سیاستدان کی طرح چوہدری شجاعت میں بھی اتنی عقل باقی تھی کہ انہوں نے جنرل مشرف کو ہرگز اس فہرست میں شامل نہیں کیا جس میں جنرل ایوب، جنرل یحییٰ اور جنرل ضیاء کے نام تھے۔ چوہدری شجاعت کو یہ پتہ تھا کہ وہ تینوں جنرل تو مر چکے تھے لہٰذا وہ ان کا کچھ

نہیں ہوا کرتے تھے جو جنرل اسلم بیگ نے [illegible] تھے کہ چوہدریوں کے [illegible]
[illegible] تو حسب منشا تھا۔

[illegible] جنرل [illegible] اعلیٰ [illegible]
بیان کی، وہ یہ تھا کہ چوہدری شجاعت [illegible] میں [illegible] آرمی جرنیلوں سے تعلق رکھ کے سیاست میں ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے کیونکہ انہوں نے ان باتوں میں یہ انکشاف کیا کہ کیسے ایک دن جنرل اسلم بیگ نے انہیں ملنے کی دعوت دی۔ جب وہ پرویز الٰہی کے ساتھ وہاں ان سے ملنے کے لیے پہنچے تو بیگ صاحب نے ان دونوں کو کروڑوں روپے کی پیشکش کی۔ یہ بھاری رقم انہیں مہران بینک کے اکاؤنٹ سے ملی تھی۔ یہ وہی مہران بینک اسکینڈل ہے جس کے بارے میں اصغر خان نے سپریم کورٹ آف پاکستان میں ایک درخواست دائر کی تھی کہ کیسے جنرل اسلم بیگ اور ریٹائرڈ ڈی جی آئی ایس آئی اسد درانی نے سیاستدانوں میں چودہ کروڑ روپے کی رشوت بانٹی تھی۔ جن سیاستدانوں کو مہران بینک سے پیسے دیے گئے تھے ان میں نواز شریف، فاروق لغاری، سندھ کے سابق وزیر اعلیٰ جام صادق، ایم کیو ایم کے الطاف حسین، یوسف میمن، جاوید ہاشمی، لیاقت جتوئی، ایم کیو ایم کے آفاق احمد، [illegible]، جام معشوق، [illegible] خان، دوست محمد فیضی، [illegible] والد سرتاج عزیز وغیرہ شامل تھے۔

چوہدری شجاعت کے بقول جب وہ اسلم بیگ کے گھر پہنچے تو وہ ہاف بازوؤں کی شرٹ پہنے بہت ریلیکس نظر آ رہے تھے۔ جنرل بیگ نے ان دونوں چوہدریوں کو بتایا کہ انہوں نے ایک پلان بنایا ہے جس کے تحت آئی جے آئی کے پلیٹ فارم سے لڑنے والے تمام سیاستدانوں کو ان کے الیکشن کے لیے پیسے دیے جائیں گے۔ چوہدری شجاعت حسین ایک سرونگ آرمی چیف کے منہ سے اتنی بڑی بات جو اتنے آرام سے کی گئی تھی سن کر ششدر رہ گئے۔ تاہم، چوہدری شجاعت نے جنرل بیگ سے وہ پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ جنرل اسلم بیگ کو چوہدریوں کا یہ انکار سن کر [illegible] کیونکہ اب تک ان سے [illegible] ملنے والوں میں [illegible] ایسا تھا جس نے پیسے لینے سے انکار کیا تھا۔ مرزا اسلم بیگ نے یہ سمجھا کہ شاید چوہدری صاحبان اپنے نام پر پیسے لینے کے لیے تیار نہیں تھے لہٰذا وہ [illegible] بات کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ چنانچہ جنرل بیگ نے انہیں پیشکش کی کہ وہ اپنے نام سے اکاؤنٹ کھولنے کے بجائے اپنے کسی [illegible] کے نام پر [illegible] اکاؤنٹ کھول کر اس میں پیسے ٹرانسفر کر دیں

جا سکیں گے۔ چوہدریوں کا خیال تھا کہ شاید جنرل بیگ نے یہ بھی [illegible] کی کہ ان کے اکاؤنٹ میں [illegible] پیسے [illegible] ہو گئے [illegible] اور [illegible] پیپلز پارٹی کو الیکشن ہرانے کے لیے استعمال کریں گے۔ تاہم، چوہدری شجاعت نے ایک سمجھدار سیاستدان کی طرح ایک بیوقوف [illegible] بننے سے انکار کر دیا جو پانی میں [illegible] کے [illegible] دریا کے کنارے ایک شکاری کو [illegible] لگتی ہے اور پھر اس کی قسمت کا فیصلہ وہ شکاری کرتا ہے۔ چوہدری شجاعت نے جنرل بیگ کو بتایا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی اس طرح کی گھٹیا سیاست کرنے کا سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ فوجی جرنیلوں سے پیسے لے کر الیکشن لڑیں گے۔ ایک حیران اور پریشان آرمی جنرل کو چوہدری شجاعت نے بتایا کہ وہ کیا بات کر رہے تھے کیونکہ وہ تو اپنی پارٹی کے بہت سارے لوگوں کو الیکشن لڑنے کے لیے خود پیسے فراہم کرتے ہیں۔ بھلا انہوں نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اب وہ ان سے پیسے لے کر الیکشن لڑیں گے۔ انہوں نے جنرل بیگ کو بتایا کہ وہ ان سے ایک روپیہ بھی نہیں لیں گے اور اپنی جیب سے سارا الیکشن لڑیں گے۔

چوہدری شجاعت نے مجھے بتایا کہ جب جنرل بیگ نے یہ محسوس کیا کہ وہ ان سے پیسے لینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں تو یکدم آرمی جنرل کا لہجہ بہت سخت ہو گیا۔ چہرے پر بھی ناراضگی صاف نظر آ رہی تھی۔ جنرل بیگ نے چوہدری شجاعت پر زور ڈالا کہ وہ پیسے لے لیں۔ تاہم، آخری حربے کے طور پر جنرل بیگ نے چوہدری شجاعت کو کہا کہ ٹھیک ہے، اگر وہ خود پیسے لینے کے لیے تیار نہیں ہیں تو وہ ایم این ایز اور ایم پی ایز کا الیکشن لڑنے والے ان لوگوں کی ایک ایسی فہرست تیار کریں جو پیپلز پارٹی کے امیدواروں کے خلاف الیکشن لڑ رہے تھے۔ جنرل بیگ کے بقول ان تمام امیدواروں کو مہران بینک سے پیسوں کی ادائیگی کی جائے گی۔

چوہدری شجاعت نے اس بات کا میرے سامنے اعتراف کیا کہ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک آرمی چیف کو ناراض کرنے کی جرأت کر رہے تھے جس کا نتیجہ کوئی اچھا نہیں نکلتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے بڑی سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنرل اسلم بیگ سے کچھ وقت مانگا اور کہا کہ بہت جلد وہ ایک فہرست بنا کر ان کے حوالے کریں گے جو ان سے پیسے لے کر الیکشن لڑنے پر راضی ہو جائیں۔ تاہم، چوہدری شجاعت نے کہا کہ وہ اس کے بعد کبھی بھی جنرل بیگ سے ملنے نہیں گئے اور نہ ہی انہوں نے اس

[illegible] تھے۔

جب 16 اپریل 2008ء کو چوہدری شجاعت کا یہ تہلکہ خیز انٹرویو دی نیوز میں Shujaat makes startling disclosures کے ٹائٹل سے چھپا تو جنرل مشرف ایک دم [illegible] پریشان ہو گئے کیونکہ چوہدری شجاعت جیسا بندہ اپنے اندر کی کہانیاں باہر لے آئے گا۔ اسی شام مجھے چوہدری شجاعت کا فون آیا وہ اپنے مخصوص پنجابی لہجے میں وہ میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔ ان کی [illegible] سے [illegible] الگ رہی تھی۔ وہ مجھے کہنے لگے کہ آپ نے تو میرے شو کو [illegible] کر کے رکھ دیا ہے [illegible] طرف سے انہیں فون آ رہے تھے۔ تاہم میں نے ایک بات بڑی شدت سے محسوس کی کہ کارگل پر جنرل مشرف کی حمایت کر کے انہوں نے اپنے باس کو بہت خوش کر دیا تھا۔ وہ مجھے کہنے لگے آپ کے اس انٹرویو کا کارگل والا حصہ کسی اردو اخبار میں نہیں چھپ سکتا۔ میں نے کہا بالکل چھپ سکتا ہے اور میں نے انہیں طریقہ بتایا کہ یہ کیسے چھپ سکتا ہے۔ اگلے دن روزنامہ جنگ میں جنگ کے ایک رپورٹر کے نام سے چوہدری شجاعت کا وہ انٹرویو پھر چھپا۔ بعد میں پتہ یہ چلا کہ جنرل مشرف نے چوہدری شجاعت کا میرا لیا ہوا وہ انٹرویو پڑھ کر انہیں فون کر کے بہت سراہا تھا اور انہیں شاباش دی تھی کیونکہ اس انٹرویو سے جنرل مشرف کے اس بیان کی تصدیق ہوتی تھی کہ انہوں نے کارگل آپریشن نواز شریف کی مرضی سے شروع کیا تھا۔ اس کے بعد ہر انٹرویو اور گفتگو میں چوہدری شجاعت نے کارگل والے مسئلے پر یہی لائن لینا شروع کی۔

اس سے پہلے جب میں چوہدری شجاعت کا انٹرویو ختم کر چکا اور اٹھ کر دفتر آنے لگا تو ایک روایتی میزبان کی طرح چوہدری شجاعت نے مجھ سے بھی پوچھا کہ آپ بتائیں میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ میں دوبارہ بیٹھ گیا اور ان سے کہا کہ میرا ایک بڑا ضروری کام ہے۔ اگر آپ وہ کرا دیں تو میں بہت مشکور ہوں گا۔ چوہدری شجاعت نے کہا کہ بالکل! آپ حکم کریں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ان کے پاس جنرل ضیاء کے طیارے کی ایک ایسی انکوائری رپورٹ پڑی تھی جو آج تک بھی نہیں چھپی اور اس کی اکلوتی کاپی ان کے قبضے میں تھی۔ اگر وہ مہربانی کر کے وہ کاپی مجھے دے سکیں تو میرے لیے بہت

[illegible] چوہدری شجاعت نے [illegible] کرنے [illegible] گے۔ ان سے وعدہ [illegible] چوہدری شجاعت سے [illegible] ملاقاتیں ہوئیں [illegible] مجھے [illegible] تک وہ [illegible] آپ کے لیے [illegible] میں [illegible] آپ [illegible] ہی کہتا کہ چوہدری صاحب اس نے تو آپ کی [illegible] انٹرویو [illegible] میں سے آپ سے ایک چھوٹے سے کام کی درخواست کی تھی وہ بھی آپ نہیں کرا سکے۔ چوہدری شجاعت کے اس وعدے کو سات سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے اور چوہدری صاحب میرے لیے اب تک وہ کاغذ نہیں نکال سکے۔ پچھلے دنوں پاکستان کے بہت بڑے صحافی عامر متین کے گھر پھر ملاقات ہوئی جہاں وہ ان کے ظفر عباس کے لیے ہونے والی تقریب میں شریک تھے۔ مجھے دیکھا تو خود ہی انہیں یاد آ گیا اور بولے یار [illegible] ابھی رحمٰن ملک ادھر تھا۔ میں اسے کہتا کہ یہ رپورٹ شاید وزارت داخلہ میں پڑی ہو۔ میں مسکرا پڑا۔

اس سے پہلے میری چوہدری شجاعت سے ملاقات 2008ء میں ہوئی جب میں نے اپنے اخبار دی نیوز میں ایک سنسنی خیز خبر چھاپی کہ کیسے چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی نے صدر آصف زرداری کے معتمد خاص ڈاکٹر قیوم سومرو کے گھر جا کر خفیہ ملاقاتیں کی تھیں۔ یہ ملاقاتیں اس وقت ہوئیں جب آصف زرداری صاحب نے بینظیر بھٹو کے چہلم کے اگلے دن نوڈیرو میں بیٹھ کر اپنی پہلی پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے پی ایم ایل کیو کو قاتل لیگ قرار دیا تھا۔ اس کا مطلب بڑا واضح تھا کہ آصف زرداری اس پارٹی اور اس کے لیڈروں کو بینظیر بھٹو کا قاتل سمجھتے تھے۔ یہ بات چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی کے لیے خطرے کی گھنٹیاں بجا رہی تھی کہ کہیں اقتدار میں آ کر ان دونوں پر بینظیر بھٹو کے قتل کا مقدمہ نہ درج کر لیا جائے۔ اسی اثناء میں شہباز شریف نے بھی چوہدری مونس الٰہی کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کیا، خصوصاً بینک آف پنجاب کے 9 ارب روپے کے اسکینڈل کی کہانیاں اخبارات میں چھپنے لگیں۔ اپنے آپ کو چاروں طرف سے گھیرے میں پا کر سمجھدار سیاستدانوں کی طرح چوہدری شجاعت

اور پرویز الٰہی نے آصف زرداری سے [illegible] کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لیے ڈاکٹر قیوم سومرو کا انتخاب کیا گیا۔ قدرت نے یہ دن دکھانے تھے کہ چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی جن کی مرضی کے بغیر اس ملک میں آٹھ سال تک کوئی پتہ نہیں ہلتا تھا، آج ڈاکٹر قیوم سومرو کے گھر چھپ کر جا رہے تھے تاکہ اپنی اور اپنے بیٹے کی جان بچائی جا سکے۔

اپنے اخبار میں یہ کہانی لکھتے ہوئے مجھے اپریل 2005ء کی ایک صبح یاد آ گئی جب میں بھی دیگر صحافیوں کے ساتھ آصف علی زرداری کے ساتھ دبئی سے آ کر لاہور ایئرپورٹ پر اترا تھا۔ زرداری صاحب کا استقبال کرنے کے لیے ملک بھر سے آئے ہوئے پارٹی ورکرز چوہدری پرویز الٰہی کی پنجاب پولیس کے ہاتھوں [illegible] ایئرپورٹ پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آصف زرداری کو ایجنسیوں نے یقین دلایا تھا کہ اگر وہ لاہور فتح کر لیں تو ملک میں نئے انتخابات کرا لیے جائیں گے اور ان کی پارٹی کو حکومت حوالے کر دی جائے گی۔ آصف علی زرداری صاحب بھی ایجنسیوں کے جھانسے میں آ گئے۔

[illegible] لاہور ایئرپورٹ پر جہاز کے لینڈ کرنے سے پہلے ہی انہیں پتہ چل چکا تھا کہ گیم ختم ہو چکی ہے۔ یہی وجہ تھی جب جہاز کے اندر لاہور کے ایس پی [illegible] نے آ کر آصف زرداری کو سلیوٹ مارا تو انہوں نے اپنی روایتی مسکراہٹ سے اس نوجوان افسر کو کہا کہ تمہارے پاس میری گرفتاری کے وارنٹ ہوں گے، چلو مجھے لے چلو۔ ہم سب صحافی بڑے حیران ہوئے کہ یہ صاحب تو لاہور فتح کرنے آئے تھے لیکن وہ [illegible] گاڑی میں بیٹھ کر زرداری ہاؤس چلے گئے اور پرویز الٰہی کے کارندوں نے ہم صحافیوں کو [illegible] قصور یہ تھا کہ ہم نے زرداری صاحب کے ساتھ دبئی سے [illegible]

آج وہی [illegible] پرویز الٰہی اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لیے ڈاکٹر قیوم سومرو کے [illegible]

کے گرد منڈلاتے تمام خطرات بھی دور ہو گئے۔ اس کے بعد چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی نے آصف زرداری کے صدر بننے کے بعد ایوان صدر میں رات کے اندھیرے میں کئی کھانے کھائے جہاں یہ منصوبے بنائے گئے کہ پنجاب میں نواز شریف اور شہباز شریف کی کمر کیسے توڑی جائے۔ ان ملاقاتوں کے نتیجے میں ہی پنجاب میں گورنر راج لگا۔ پھر جو کچھ ہوا وہ سب لوگوں نے دیکھا کہ کیسے ان سب لیڈروں کو اپنا تھوکا ہوا چاٹنا پڑا۔ نہ صرف نواز شریف اور شہباز شریف عدالتوں سے بحال ہوئے بلکہ پنجاب حکومت بھی واپس کر دی گئی۔

اپنے ایف ایٹ کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی مجھے یہی سمجھا رہے تھے کہ مجھے اس طرح کی خبریں نہیں چھاپنی چاہئیں۔ ایک بات کی میں یقیناً داد دوں گا کہ میں نے چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی کے خلاف ان کے قرضے معاف کرانے سے لے کر فیصل آباد کی سونیا ناز کے ساتھ پنجاب میں ہونے والے ریپ کیس اور اب قیوم سومرو کے ساتھ خفیہ ملاقاتوں کی کئی ایسی خبریں چھاپی تھیں جو یقیناً کوئی بھی حکمران پسند نہیں کرتے، لیکن کسی ایک دن بھی چوہدری شجاعت یا پرویز الٰہی نے میرے ساتھ تلخی یا سختی سے بات نہیں کی بلکہ جب اور جہاں ملے بڑی عزت اور احترام سے ملے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں تمام سیاسی لیڈروں کے برعکس چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی میں ہم صحافیوں کو اپنے خلاف لکھنے کے باوجود برداشت کرنے کی بہت بڑی خوبی ہے۔

یہی وجہ ہے میں چپ چاپ چوہدری شجاعت اور پرویز الٰہی کی باتیں سنتا رہا اور جب اٹھنے لگے تو ان سے ایک ہی بات کی کہ چوہدری صاحب! آپ نے مجھ سے پانچ سال پہلے جنرل ضیاء کی انکوائری رپورٹ دینے کا وعدہ کیا تھا اور آپ نے آج تک وہ وعدہ پورا نہیں کیا۔ چوہدری شجاعت تھوڑے جھینپ سے گئے [illegible]

چوہدری نثار علی خان

اکتوبر 2002ء کے الیکشن کے بعد نئی پارلیمنٹ وجود میں آ چکی تھی۔ چوہدری نثار علی خان کا میں نے اب تک صرف نام سنا تھا، ان سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بدلتے حالات و واقعات کے مطابق میں نے بھی اپنا آپ کو بدلنے کا فیصلہ کیا تھا اور پارلیمنٹ کی رپورٹنگ کے لیے اپنا نام اپنے ایڈیٹر کو جاری کر دیا تھا۔ ہم ہاری اور دی نیوز کے بیورو چیف شکیل شیخ کی مہربانی سے میرا نام پارلیمنٹ کی رپورٹنگ کرنے والے رپورٹروں میں شامل کر دیا گیا تھا۔ یہ بات بتاتے ہوئے بڑا عجیب سا لگ رہا ہے کہ پارلیمنٹ جانے سے پہلے مجھے سیاست اور سیاسی لیڈروں سے بڑی چڑ تھی اور میں حیران ہوتا تھا کہ یہ کیا پارلیمنٹ والے رپورٹر ہیں، بھلا سیاسی رپورٹنگ کرنا بھی کوئی رپورٹنگ ہے۔ سارا دن سیاستدانوں سے گپیں لگاتے ہیں اور شام کو اپنے دو چار دوستوں کی گپ شپ کو اخبار میں چھاپ دیتے ہیں۔ پارلیمنٹ کی رپورٹنگ کرنے کے کچھ عرصے بعد مجھے احساس ہوا کہ سیاسی رپورٹنگ کا اپنا ایک مزا ہے۔ بہرحال میں اب جانتا ہوں کہ صحافت کا علم کیا ہے۔ جب میں نے چوہدری شجاعت کا پہلا سیاسی انٹرویو اپنے اخبار میں چھاپا تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہ سلسلہ رکنا نہیں چاہیے اور باقی کے بڑے اہم لوگوں کا بھی انٹرویو کرنا چاہیے تاکہ ایک پوری سیاسی تاریخ مرتب کی جا سکے۔ میرا خیال ہے کہ یہ پاکستان مسلم لیگ نواز کے خواجہ محمد آصف ہی تھے جنہوں نے مجھے دو تین دفعہ یہ تجویز دی کہ میں چوہدری نثار علی خان سے ملوں اور ان کا انٹرویو کروں۔ خواجہ صاحب کے بقول نثار کے پاس بہت بڑے بڑے راز تھے۔ ایک دن قومی اسمبلی کا اجلاس ختم ہوا تو پارلیمنٹ کیفے ٹیریا میں چوہدری نثار اور خواجہ آصف صحافیوں کے ساتھ ایک میز پر بیٹھے تھے۔ میں اس سے پہلے چوہدری نثار سے کبھی نہیں ملا تھا اور نہ ہی وہ مجھے شکل سے پہچانتے تھے۔ تاہم میں خواجہ صاحب کے قریب گیا ان سے علیک سلیک ہوئی۔ چوہدری نثار علی خان سے بھی ہاتھ ملایا اور وہیں اسی میز کے گرد بیٹھ گیا۔ اچانک خواجہ آصف نے مجھ سے پوچھا کہ رؤف اور کیا نئی تازی ہے۔ میرا نام سن کر چوہدری نثار تھوڑا سا چونکے اور میری طرف دیکھ کر کہا کہ آپ رؤف کلاسرا ہیں۔ میں نے کہا جی بالکل۔ ان کی بڑی مہربانی کہ وہ فوراً کھڑے ہو گئے اور دوبارہ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ جب وہ جنرل مشرف کے مارشل لاء کے بعد فیض آباد میں واقع اپنے گھر میں قید تھے تو انہوں نے پہلی دفعہ دی نیوز میں میرا نام خبروں کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تھا۔ ان کے لیے میری خبریں حیرانی کا سبب تھیں کیونکہ مارشل لاء کے باوجود جنرل مشرف کی حکومت کے خلاف نہ صرف سخت خبریں میرے نام سے چھپ رہی تھیں بلکہ بہت سارے سکینڈلز بھی اخبار کی زینت بن رہے تھے۔ چوہدری نثار کے لیے یہ بات بڑی حیرانی کا موجب تھی کہ اچانک ایک نیا رپورٹر نکلا اور سینہ تانے ہوئے جنرل مشرف کے مارشل لاء کے خلاف خبریں تحریر کر رہا تھا۔

بعد میں مجھے چوہدری نثار نے بتایا کہ ان کی سخت گیری میری تحریروں کی کڑی ہوتی تھیں۔ ان کے خیال میں میں سندھی تھا کیونکہ پنجابی رپورٹر اتنے سخت طریقے سے فوجی مارشل لاء کے خلاف نہیں لکھ سکتے تھے۔ تاہم میں نے چوہدری نثار کو بتایا کہ میں سندھی نہیں بلکہ سرائیکی ہوں۔ اس پہلی ملاقات کے بعد چوہدری نثار سے گپ شپ ہوتی رہی۔ وہ ان چند سیاستدانوں میں سے ہیں جو جب چاہیں اور جس سے چاہیں دوستی قائم کر سکتے ہیں اور جب یہ محسوس کریں کہ اب اس دوستی کی ضرورت نہیں ہے تو بھی وہ ایک لمحے میں اس بندے کو اپنے آپ سے دور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مجھے خود بھی چوہدری نثار کی شخصیت کے اس پہلو کا تجربہ ہوا ہے جسے میں بعد میں بیان کروں گا۔

چوہدری شجاعت کے انٹرویو کے بعد ماحول بڑا سازگار تھا اور بہت سارے سیاستدان مجھ سے بات چیت کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ تاہم میں نے چوہدری نثار علی خان سے درخواست کی کہ میں ان کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔ آپس کی بات یہ ہے کہ مجھے نثار کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں تھا اور

مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ ان کے پاس کس طرح کے راز ہو سکتے ہیں اور وہ کتنی حد تک ان رازوں سے پردہ اٹھا سکتے تھے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جتنے پروفائل اب تک کیے ہیں چوہدری نثار والا سب سے زیادہ دلچسپ اور رازوں کے انکشافات سے بھرا ہوا تھا۔ چوہدری نثار سے کئی ملاقاتیں ان کے گھر پر ہوئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک اچھے میزبان ہیں اور کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا ہو گا کہ دوران کوئی چیز کھانے پینے کے لیے آ جاتی رہی ہو۔ میں ان کے بڑے بیٹے تیمور کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے ان دنوں میں جب میں ان کے والد صاحب سے انٹرویو کرنے گھر جاتا تھا، مجھے بڑی اچھی کمپنی دی اور گپ شپ کی۔ تیمور کو کرکٹ کھیلنے کا بہت شوق ہے اور وسیم اکرم ان کے پسندیدہ کھلاڑی تھے اور مجھے امید ہے کہ چکری کے چوہدریوں کا یہ بیٹا شاید اپنے باپ دادا کے زمیندار اور سیاسی خاندان سے بغاوت کر کے کسی دن کرکٹ میں نام روشن کرے۔

جب میں چوہدری نثار کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تو نثار نے مجھ سے پہلی بات یہی کی کہ والد صاحب جس جگہ آپ بیٹھے ہیں اسی جگہ آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل محمود ان کی منتیں کرتے تھے کہ وہ نواز شریف کو چھوڑ کر جنرل مشرف کے ساتھ مل جائیں تو وہ کون سا بڑا عہدہ ہے جو انہیں نہیں دیا جا سکتا۔ یہ علیحدہ کہانی ہے کہ بعد میں کلثوم نواز کی وجہ سے ان کے اختلافات نواز شریف سے اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ ایک مرحلے پر وہ بڑی سنجیدگی سے [illegible] ہے تھے۔ اس کام کے لیے بینظیر بھٹو کی قریبی ساتھی آمنہ پراچہ سے [illegible] حالات اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ چوہدری نثار نواز شریف کو چھوڑ کر اب بینظیر بھٹو سے سیاسی [illegible] ملیں گے۔

چوہدری نثار [illegible] ان کے چہرے [illegible] ایک کے بعد [illegible] ساتھ کھلتے چلے گئے۔

چوہدری نثار کے [illegible] آفیسر تھے اور چاہتے تھے کہ ان [illegible] کے بعد چوہدری نثار نے سیاستدان [illegible] تو انہیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ [illegible] جہاں وہ آج کھڑے ہیں۔ چوہدری نثار کو

نواز شریف اور محمد خان جونیجو میں سے کسی ایک لیڈر کا انتخاب کرنا تھا اور نثار نے نواز کا کیا۔ نثار کو اس بات کا اندازہ تھا کہ ان کا مزاج سیاسی نہیں تھا لیکن پتہ نہیں کیوں انہیں یہ لگتا تھا کہ وہ ایک پیدائشی سیاستدان تھے۔ جب وہ پہلی دفعہ قومی اسمبلی کی تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کی ٹانگیں نیچے سے کانپ رہی تھیں۔ جب نثار نے اپنی پہلی تقریر ختم کی تو اس وقت کے وزیر خزانہ محبوب الحق نثار کی سیٹ کے پاس آئے اور انہیں کہا کہ نثار آج کے بعد تم میرے پارلیمنٹری سیکرٹری کے طور پر کام کرو گے۔ ڈاکٹر محبوب الحق نے چوہدری نثار کو تمام مالی معاملات پر کھلی آزادی دی۔ نثار نے ڈاکٹر محبوب الحق سے بہت کچھ سیکھا جو ان کی آنے والی سیاسی زندگی کا بہت بڑا اثاثہ ثابت ہوا۔ تاہم بہت جلد جنرل ضیاء اور جونیجو کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے اور ڈاکٹر محبوب الحق کو استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑ گیا۔ یاسین وٹو کو نیا وزیر خزانہ بنا دیا گیا۔ ایک دن جونیجو نے نثار کو بلایا اور اس کے کام کی تعریف کرنے کے بعد یہ انکشاف کیا کہ اسے وزیر بنایا جا رہا تھا۔ نثار نے جونیجو کا شکریہ ادا کیا اور یہ درخواست کی کہ اسے اگر وزیر بنانا ہی ہے تو وزیر مملکت برائے خزانہ بنایا جائے۔ جونیجو صاحب مان گئے۔ تاہم چوہدری نثار کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب وہ حلف لینے کے لیے گئے تو انہیں پتہ چلا کہ انہیں وزارت پٹرولیم کا وزیر بنایا گیا تھا۔ بعد میں نثار کو پتہ چلا کہ یاسین وٹو اپنی وزارت میں ڈپٹی منسٹر نہیں چاہتے تھے۔ تاہم نثار نے نئی وزارت میں دلچسپی لینا شروع کی اور وہ وزارت انہیں اتنی اچھی لگی کہ اس کے بعد جب بھی نثار کے پاس یہ عہدہ آیا وہ ہمیشہ پٹرولیم کے وزیر ہی بنے۔

میں چوہدری نثار سے یہ پوچھنے کے لیے بے تاب تھا کہ آخر جنرل ضیاء اور محمد خان جونیجو کے درمیان ایسے کون سے اختلافات پیدا ہو گئے تھے جن کی بنیاد پر [illegible] پارلیمنٹ توڑ دی گئی تھی۔ چوہدری نثار نے انکشاف کیا [illegible] کہ محمد خان جونیجو [illegible] سے بڑی محنت اور کوشش کے بعد [illegible] یہ کہہ کر جنرل ضیاء کے سامنے پیش کیا تھا کہ اس سے بہتر [illegible] وزیر اعظم کے عہدے کے لیے کوئی اور نہیں مل سکتا ہے۔ تاہم محمد خان جونیجو نے جنرل ضیاء کی ساری خواہش [illegible] وزیر اعظم بنتے ہی جونیجو نے جنرل ضیاء کے قریبی ساتھی اور اس وقت کے وفاقی سیکرٹری اطلاعات جنرل مجیب الرحمن کو برطرف کر دیا۔ آنے والے دنوں میں بات مزید بڑھ گئی جب جونیجو نے ان [illegible] سے انکار کر دیا جنہوں نے [illegible] عدالت کو قبضہ کرنے دیا تھا۔

تاہم چوہدری نثار یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے کہ محمد خان جونیجو اور جنرل ضیاء [illegible] کے بعد [illegible] نثار نے کہا کہ دراصل یہ بھی ایک ڈس انفارمیشن تھی جس کا مقصد [illegible] سیاسی حکومت کو [illegible] محسوس کر رہا تھا۔

[illegible] جنرل ضیاء [illegible] کہ ایک سیاسی حکومت [illegible] ابھی تک مجھے یاد آتا ہے کہ ان دنوں نثار جونیجو حکومت میں وزیر تھے انہی دنوں بینظیر بھٹو بھی [illegible] یہ سوال پوچھتے تھے کہ جنرل ضیاء، بینظیر بھٹو کی وطن واپسی کے راستے زیادہ [illegible] تھے۔ تاہم ضیاء کا یہ خیال تھا کہ پاکستان کا سیاسی اور جمہوری سلسلہ جو ابھی نیا نیا چلا تھا وہ اتنا [illegible] نہیں تھا کہ بینظیر بھٹو کے [illegible] کا سامنا کر سکے۔ تاہم جونیجو نے جنرل ضیاء کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ بینظیر بھٹو کے وطن واپس آنے سے ضیاء کے اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ جونیجو کا یہ بھی خیال تھا کہ [illegible] ہو گا کہ بینظیر بھٹو کا سیاسی طور پر سامنا کیا جائے۔ کچھ دنوں بعد بینظیر بھٹو وطن واپس آ گئیں اور جیسا کہ [illegible] ملک میں فوری طور پر کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی اور سیاسی حکومت بینظیر بھٹو کی وجہ سے نہیں، جنرل ضیاء کی وجہ سے ختم ہوئی تھی۔

29 مئی 1988ء کو جب جونیجو حکومت ختم کی گئی تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بہت سے وزراء جنہیں جنرل ضیاء نے برطرف کیا تھا وہ دوبارہ حلف لے کر ان کی نگرانی میں قائم کی گئی کابینہ میں بیٹھ گئے تھے۔ چوہدری نثار بھی ان وزیروں میں شامل تھے جبکہ پنجاب میں نواز شریف نے نگران وزیر اعلیٰ کا حلف اٹھایا تھا۔ تاہم نثار نے میرے سامنے اس بات کا اعتراف کیا کہ نواز اور انہوں نے جونیجو کے خلاف جنرل ضیاء کی حمایت کر کے غلطی کی تھی۔ تاہم نثار نے کہا کہ شاید اس کے پیچھے یہ وجہ تھی کہ پنجاب میں وٹو صاحب مسلسل نواز شریف کے خلاف ایک سیاسی گروپ کو اپنی حمایت کا یقین دلا رہے تھے۔ یوں ہمارے پاس ایک بڑی وجہ بن گئی تھی کہ ہم اسلام آباد میں [illegible] وزیر اعظم کا ساتھ نہ دیں۔ تاہم نثار نے یہ بات مان لی کہ چاہے وجہ کچھ بھی ہو [illegible] سیاسی قوتوں کو ایک سیاسی وزیر اعظم کا ساتھ دینا چاہیے تھا کہ [illegible] میں [illegible] جنرل ضیاء نے نواز شریف اور جونیجو کے درمیان اختلافات کا بڑا فائدہ اٹھایا اور [illegible] حکومت ختم کر دی۔

تاہم چوہدری نثار کے اندر ابھی بھی ایک سیاسی ورکر زندہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ضیاء نے جونیجو کی حکومت توڑی تو نثار نے اس ایکشن کے خلاف ایک [illegible] بیان دیا۔ یہ بیان پڑھ کر نواز شریف نے نثار کو فون کیا اور یہ ہدایت کی کہ وہ اس طرح کے بیان دینا بند کر دیں اور نثار چپ ہو گئے۔

میں نے نثار سے پوچھا کہ جنرل ضیاء کی شخصیت کس طرح کی تھی۔ وہ بولے ضیاء بڑے نفیس مزاج کے تھے اور بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ تاہم جونیجو حکومت برطرف کرنے کے بعد وہ دوبارہ ایک نارمل زندگی شروع نہیں کر سکے تھے۔ جونیجو حکومت کی برطرفی سے لے کر اپنی موت تک نثار نے شاید ہی جنرل ضیاء کو اچھے موڈ میں دیکھا ہو۔ نثار نے کہا کہ ایک دن کابینہ میٹنگ سے پہلے پی ٹی وی کے کیمرہ مین کے آنے سے قبل جنرل ضیاء نے اپنے تمام وزیروں سے کہا کہ وہ باری باری کیمرے کے سامنے مسکرائیں تاکہ عام پبلک میں یہ تاثر جائے کہ جنرل ضیاء اور اس کے ساتھی ہرگز پریشان نہیں ہیں۔ اس ایک بات سے جنرل ضیاء میں پائی جانے والی ٹینشن اور پریشانی کا اندازہ ہوتا تھا جس کا وہ سامنا کر رہے تھے۔

باتوں باتوں میں نثار نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ جنرل ضیاء کا طیارہ کریش ہونے سے کچھ دن قبل جنرل ضیاء کے سینئر وزیر اسلم خٹک نے انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ ان کی زندگی کو خطرہ ہے لہذا وہ ہوائی جہاز کا سفر ترک کر دیں۔ جنرل ضیاء نے اپنے سینئر وزیر کو بتایا کہ خدا اس کی حفاظت کرے گا۔ نثار کے بقول جنرل ضیاء نے اپنے سینئر وزیر کی بات کو زیادہ سیریس نہیں لیا تھا حالانکہ اسلم خٹک کی بات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے پاس کوئی اندر کی انفارمیشن موجود تھی کہ جنرل ضیاء کو قتل کرنے کا منصوبہ بن چکا تھا۔ پھر ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ جنرل ضیاء پاکستان کی اندرونی اور بیرونی قوتوں کے لیے اب ایک بہت بڑا بوجھ بن چکے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جنرل ضیاء اپنی موت سے قبل یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ ملک میں نئے انتخابات نہیں کروائیں گے اور مختلف آپشنز پر غور ہو رہا تھا۔ ایک دن جنرل ضیاء نے کابینہ میٹنگ بلائی اور اپنے تمام وزیروں سے یہ پوچھا کہ کیا ملک میں نئے الیکشن ہونے چاہئیں۔ وزیروں کی اکثریت نے ملک میں نئے انتخابات نہ کروانے کا مشورہ دیا اور یہ تجویز دی کہ ملک میں صدارتی نظام حکومت رائج کر دیا جائے۔ ان وزیروں نے جنرل ضیاء کو بتایا کہ وہ ابھی بھی ملک میں بہت زیادہ پاپولر تھے اور بینظیر بھٹو کو صدارتی انتخاب میں شکست دے سکتے تھے۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ان وزیروں نے یہ بھی بتایا کہ لوگ ایک عورت کو ووٹ نہیں دیں گے۔ نثار نے جب یہ

[illegible] نے 1991ء میں اپنے [illegible] کے [illegible] [illegible] سے قبل [illegible] [illegible] سے حلف لینی تھی۔ تاہم [illegible] [illegible] غلام اسحاق خان [illegible] [illegible] غلام اسحاق خان نے [illegible] [illegible] سیف اللہ خان [illegible] [illegible] کے لیے [illegible] اور انہوں نے صدر کی یہ بات [illegible] غلام اسحاق خان نے بھی ان وزیروں کو حلف دلوانے سے انکار کر دیا۔ مسلسل ایک ہفتے تک نواز شریف اور غلام اسحاق خان میں بحث ہوتی رہی۔ آخر تنگ آ کر نواز شریف اور سیف اللہ [illegible] ہو گئے تھے لیکن غلام اسحاق خان نے یہ اصرار جاری رکھا کہ ان کے [illegible] جائے۔

اسی دوران بینظیر بھٹو اور نواز شریف کے درمیان بڑھتی ہوئی سیاسی دشمنی پاکستان آرمی کے لیے بھی پریشانی کا سبب بن رہی تھی۔ اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز جنجوعہ نے [illegible] نواز شریف اور بینظیر بھٹو کے درمیان ایک ملاقات کروائی تاکہ وہ بیٹھ کر اپنے اختلافات دور کر سکیں۔ تاہم جب غلام اسحاق خان کو یہ پتہ چلا تو انہوں نے یہ میٹنگ نہیں ہونے دی۔ [illegible] غلام اسحاق خان یہ چاہتے تھے کہ نواز شریف بینظیر بھٹو کو کرپشن کے الزامات پر سیاست سے علیحدہ [illegible] غلام اسحاق خان نے بینظیر بھٹو کے خلاف بہت سارے ریفرنس بھیجے ہوئے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ نواز شریف انہیں عدالتوں میں دائر کریں۔ غلام اسحاق نواز شریف سے [illegible] تھے کہ ان کی حکومت بینظیر بھٹو کے خلاف کیسز میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ [illegible] بینظیر بھٹو کے خلاف اپنی ذاتی دشمنی پوری کرنے کے لیے نواز شریف کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ [illegible] بینظیر بھٹو کے خلاف جام صادق کی حکومت کے اقدامات کو پوری طرح تحفظ فراہم کرتے تھے۔ [illegible] کے بقول اس میں کوئی شک نہیں کہ غلام اسحاق خان بہت محنتی اور ذہین شخص تھے اور [illegible] پر ان کی بڑی گرفت تھی۔ تاہم وہ ایک بہت ضدی شخص تھے۔ غلام اسحاق کی ساری [illegible] کے خلاف [illegible] اور وہ اس معاملے پر نواز شریف کی کوئی بھی بات سننے کو تیار

نہیں تھے۔ نواز شریف اور غلام اسحاق کے درمیان [illegible] جنرل آصف نواز کی اچانک موت واقع ہو گئی۔ [illegible] میں ایک میٹنگ کال کی گئی جس میں جنرل آصف نواز کے مرنے کے بعد آرمی چیف کے نام پر [illegible] نواز شریف چاہتے تھے کہ [illegible] وقت سب سے سینئر جرنیل تھے [illegible] غلام اسحاق خان جنرل فرخ کو [illegible] بنانا چاہتے تھے۔ صدر اور وزیر اعظم کے درمیان بہت تلخی ہو گئی۔ نواز شریف اس میٹنگ کو درمیان میں چھوڑ کر واپس آ گئے۔

حالات اچانک خراب ہو گئے تھے۔ بات یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ جنرل آصف نواز کے جنازے میں غلام اسحاق خان اور نواز شریف ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے تھے لیکن دونوں نے بات چیت نہیں کی۔ اس ڈیڈ لاک کو توڑنے کے لیے چوہدری نثار نے کوششیں شروع کر دیں اور انہوں نے روئیداد خان سے ایک ملاقات کی جس کا غلام اسحاق خان پر بڑا اثر و رسوخ تھا۔ آخر جنرل وحید کاکڑ کے نام پر معاملہ طے ہو گیا۔ اگرچہ نواز شریف جنرل کاکڑ کے نام پر بھی راضی نہیں تھے کیونکہ ان کے خیال میں ابھی ان کی عمر چیف آف آرمی سٹاف بننے کی نہیں تھی۔ تاہم چوہدری نثار نے نواز شریف کو منا لیا تاکہ صدر اور وزیر اعظم کے درمیان جاری اس جنگ کو ختم کیا جائے۔ اسی دوران میں نواز شریف تک یہ خبر پہنچی کہ غلام اسحاق خان اور پیپلز پارٹی کے لیڈروں کے درمیان [illegible] تھے۔ [illegible] لیڈر محمود خان اچکزئی [illegible] نے چوہدری نثار [illegible] نواز شریف کو بتایا کہ [illegible] اس سب کے پیچھے غلام اسحاق خان اور پیپلز پارٹی [illegible] سازش میں مصروف ہیں۔ محمود اچکزئی یہ چاہتے تھے کہ بینظیر بھٹو اور نواز شریف اپنے اختلافات بھلا کر اسٹیبلشمنٹ کو شکست دیں۔ چوہدری نثار نے نواز شریف سے بات کی [illegible] بینظیر بھٹو [illegible] تیار نہیں تھے۔

چوہدری نثار نے محمود خان اچکزئی کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ وہ پاکستان کے ایک ایسے لیڈر تھے جنہیں ہمیشہ [illegible] کیا گیا۔

چوہدری نثار نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ اس موقعے پر اپنے قریبی ساتھیوں سے ایک میٹنگ میں نواز شریف نے انہیں بتایا کہ وہ قومی اسمبلی کو تحلیل کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ تمام لوگوں نے اس بات کی مخالفت کی۔ تاہم نواز شریف نے کہا کہ وہ اسٹیبلشمنٹ کی طاقتوں کے آگے نہیں جھکیں گے

[illegible] غلام اسحاق خان بھی استعفیٰ دے کر گھر جائیں [illegible] غلام اسحاق خان بھی اپنے گھر چلے گئے [illegible] ہو جائیں گے کہ وہ ایوان صدر چھوڑ دیں۔

میں نے چوہدری نثار سے پوچھا کہ ایم کیو ایم کے خلاف فوجی آپریشن کی کیا حقیقت تھی تو انہوں نے ایک لمبی کہانی سنائی۔ وہ کہنے لگے کہ میں 1992ء میں ہونے والے ملٹری آپریشن کی بات بعد میں بتاؤں گا اس سے پہلے میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پاکستان سیکرٹ ایجنسیاں اور فوجی اسٹیبلشمنٹ جس ایم کیو ایم کو ملک دشمن، غدار اور بھارت کا ایجنٹ قرار دیتی تھیں اسے 2002ء کے الیکشن کے بعد مرکز میں فوجی اقتدار میں لے کر آئیں۔ چوہدری نثار نے 1999ء کے اوائل میں ایک ایسی میٹنگ کا ذکر کیا جس میں نواز شریف اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل پرویز مشرف موجود تھے۔ آئی ایس آئی کے ایک بریگیڈیئر نے ان دونوں کی موجودگی میں کہا کہ چوہدری نثار کی الطاف حسین سے لندن میں ملاقاتیں ان کے لیے پرابلم پیدا کر رہی ہیں۔ نواز نے بڑے غصے میں اس بریگیڈیئر کو جواب دیا کہ ملک کے لیے پالیسی بنانا آئی ایس آئی کے آفیسر کا کام نہیں ہے۔ اس کا کام محض احکامات پر عملدرآمد کرنا تھا۔ اسی میٹنگ میں ہی 72 سیاستدانوں کے نام پیش کیے گئے تھے جو [illegible] کر رہے تھے۔

چوہدری نثار کو یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جب وہ ایم کیو ایم کو قومی دھارے میں لانے میں مصروف تھے اس وقت نواز شریف کو یہ بتایا گیا کہ ایم کیو ایم ایک ملک دشمن جماعت تھی اور یہ بھارت کی [illegible] پر کام کر رہی تھی۔ آئی ایس آئی، فوج اور سیکرٹ ایجنسیاں الطاف حسین کی [illegible] تھیں۔ نثار کے بقول انہوں نے ہمیشہ ایم کیو ایم کی وجہ سے [illegible]

[illegible] نہیں نکلوائیں اور نہ پیچھے سے آ کر جنرل مشرف کی حکومت کو [illegible]۔

میں اب بھی چوہدری نثار سے 1992ء کے ملٹری آپریشن کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا۔ نثار کو ابھی تک یاد تھا کہ جنرل آصف نواز پاکستان ٹیلی ویژن پر بھی یہ دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ ایم کیو ایم کے خلاف ہونے والے آپریشن کی تفصیلات ٹیلی ویژن کے ذریعے پوری قوم کو دکھائیں۔ نواز شریف اس وقت لندن میں الطاف حسین سے ملاقات کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ تاہم نثار نے پی ٹی وی کو آپریشن کی ویڈیو دکھانے سے منع کر دیا۔ جب نواز شریف لندن سے پاکستان لوٹے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک ملاقات کی اور اس میں فوجی قیادت کے خلاف خاصی سخت زبان استعمال کی۔ فوج کے خلاف ہونے والی اس تنقید کو کسی نے اخبارات کو لیک کر دیا اور جنرل آصف نواز نے اس کا سخت برا منایا۔ چوہدری نثار نے اس برے وقت میں نواز شریف کے ساتھ کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا جس پر غصے میں آ کر جنرل آصف نواز نے سیکرٹ ایجنسیوں کو ان کے پیچھے لگا دیا۔ چوہدری نثار علی کے بھائی جنرل افتخار علی خان اور ان کے ایک اور عزیز پر بڑا دباؤ ڈالا گیا۔ کچھ دنوں بعد چند مشترک دوستوں نے جنرل آصف نواز اور چوہدری نثار کے درمیان ایک ملاقات کا اہتمام کیا۔ جنرل آصف نے چوہدری نثار سے شکایت کی کہ ان کے خاندانوں کے تعلقات بہت پرانے تھے، پھر بھی وہ شخص ایک تاجر (نواز شریف) کے لیے ان تعلقات کا خیال بھی نہیں کر رہے تھے۔ نثار نے جنرل آصف کو جواب دیا کہ جناب کس میں اتنی جرأت ہے کہ کوئی آرمی چیف کے خلاف اپنی توپوں کا رخ کر سکے۔ جہاں تک ان کی نواز شریف کے ساتھ دوستی کا تعلق ہے تو وہ اسے نہیں چھوڑیں گے۔

میں نے نثار سے پوچھا کہ فاروق لغاری اور نواز شریف کے درمیان بینظیر بھٹو کے خلاف معاہدہ

[illegible]

چوہدری نثار کی یہ باتیں سن کر نواز شریف ہکا بکا رہ گئے۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ نواز شریف نے اپنے ہاتھ سے ایک چٹ لکھی اور چوہدری نثار کو پکڑائی جس میں اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے نواز شریف نے یہ لکھا تھا کہ وہ یہ ساری باتیں ان سے علیحدگی میں بھی کر سکتے تھے۔ نواز شریف نے اپنی چٹ میں لکھا تھا کہ نثار نے انہیں اپنی کابینہ کے تمام ساتھیوں کے سامنے بے عزت کیا ہے۔

[illegible]

... جائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی مقرر کرنا چاہتے تھے۔ تاہم، عام توقعات ریٹائرمنٹ کے بعد واشنگٹن میں ... کے برعکس جنرل کرامت کا نیشنل سیکیورٹی کونسل بنانے کا مشورہ ہی ان کے نواز شریف کے ساتھ اختلافات کی کوئی ایک وجہ نہیں تھا۔ نواز شریف کے علم میں یہ بات لائی گئی تھی کہ جب جنرل کرامت اپنے دل کے ایک ایسے دوست سے ملے جو نواز شریف کے بھی دوست تھے تو انہوں نے وزیراعظم کے بارے میں کچھ ایسے ریمارکس دیے جنہیں پسند نہیں کیا گیا۔ نواز شریف نے جنرل جہانگیر کرامت سے اپنے بارے میں کہے گئے ریمارکس کے بارے میں وضاحت طلب کی تو وہ اپنی بات سے مکر گئے۔ نواز شریف اور جنرل کرامت میں بات اتنی بڑھ گئی کہ حتیٰ کہ عرب امارات کے شاہی خاندان کے ایک فرد کو بھی مداخلت کر کے دونوں میں صلح کرانی پڑی۔

نواز شریف اور جنرل جہانگیر کرامت کے درمیان رنجش کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ جنرل جہانگیر کرامت اپنی مرضی کے ایک جنرل علی قلی خان کو اپنے بعد آرمی چیف لگوانا چاہتے تھے اور اس کام کے لیے وہ لابنگ بھی کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں وزیراعظم نواز شریف کو سیکرٹ ایجنسیوں نے کچھ ایسی رپورٹس بھی بھیجی تھیں جو متوقع آرمی چیف کے خلاف تھیں۔ اس وقت کے ڈی جی آئی ایس آئی جنرل نسیم رانا بھی نواز شریف کے پاس نئے چیف آف آرمی سٹاف کے متوقع امیدواروں کے بارے میں کچھ ایسی باتیں لے کر آتے تھے جو چونکا دینے والی تھیں۔ جرنیلوں کی حرکتوں اور ان کے کرتوتوں کے بارے میں سیکرٹ ایجنسیوں کی تیار کی ہوئی رپورٹس دیکھ کر چوہدری نثار پہلی دفعہ بڑے متعجب ہوئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سیکرٹ ایجنسیاں اپنے سروِنگ جرنیلوں کے بارے میں بھی اس طرح کی چیزوں کا خفیہ ریکارڈ رکھتی ہیں۔

اس سے پہلے جب نواز شریف اور صدر فاروق لغاری کے درمیان تعلقات خراب ہوئے تھے تو جنرل کرامت نے بھی ایک خط وزیراعظم کو لکھا تھا جس پر نواز شریف خوش نہیں تھے۔ جنرل کرامت نے لغاری کی کمر پر آخری تنکا اس وقت رکھا جب انہوں نے نیول وار کالج لاہور میں نیشنل سیکیورٹی کونسل بنانے کی تجویز پیش کی۔ ان کے اس خطاب سے اسلام آباد میں بیٹھے سب لوگ چونک گئے۔ وجہ یہ تھی کہ جہانگیر کرامت نے نیشنل سیکیورٹی کونسل کا نام اپنی تقریر میں نہیں لیا تھا لیکن جب آئی ایس پی آر نے خصوصی طور پر نیشنل سیکیورٹی کونسل کا لفظ پریس ریلیز میں شامل کر کے پی ٹی وی کو بھجوایا تو اس سے حکومت کو احساس ہوا کہ معاملہ بہت سیریس ہے۔

نواز شریف نے سوچا کہ اب کافی ہو گیا ہے۔ جنرل کرامت نے اپنی حدود سے تجاوز کر لیا تھا۔ نواز نے ہر قیمت پر جنرل کرامت کو گھر بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ چوہدری نثار اور شہباز شریف نے جنرل جہانگیر کرامت کو ہٹانے کی مخالفت کی لیکن نواز شریف نے یہ کہہ کر ان کی بات مسترد کر دی کہ وقت آ گیا ہے کہ ملک میں اب سویلین لوگوں کی رٹ قائم کی جائے۔ نواز نے جنرل جہانگیر کرامت کو وزیراعظم ہاؤس بلوایا اور غیر متوقع طور پر کرامت نے مستعفی ہونے کی پیشکش کر دی۔ اسی شام ڈی جی آئی ایس آئی رانا نسیم جنرل جہانگیر کرامت کا استعفیٰ نواز شریف کو آ کر دے گئے۔



اب نواز شریف کو ایک دفعہ پھر ایک نئے آرمی چیف کی تلاش تھی جو ان کے خیال میں ایک سویلین حکومت کو جوابدہ ہو اور وہ نہ تو وزیراعظم کو کسی صدر کے حق میں خط لکھے اور نہ ہی اپنی تقریروں میں کھلے عام نیشنل سیکیورٹی کونسل بنانے کی تجویز پیش کرے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ پیٹھ پیچھے ملک کے وزیراعظم کے خلاف گفتگو بھی نہ کرے۔ جنرل علی قلی خان کے خلاف چوہدری نثار اور جنرل افتخار علی خان پہلے ہی محاذ بنا چکے تھے اور نواز شریف چوہدری نثار سے پوچھے بغیر کوئی نیا آرمی چیف نہیں لگانا چاہتے تھے۔

جب میں نے نثار سے پوچھا کہ جنرل مشرف کو کس نے آرمی چیف بنوایا تھا تو انہوں نے مجھے کہا کہ نواز شریف نے خود ہی مشہور صحافی سہیل وڑائچ کو جدہ میں دیئے گئے اپنے ایک انٹرویو میں یہ کہا تھا کہ انہوں نے چوہدری نثار کے کہنے پر انہیں آرمی چیف لگایا تھا۔

چوہدری نثار نے مجھے جنرل مشرف کو آرمی چیف بنوانے کی کہانی سنانا شروع کی۔

جس شام ڈی جی آئی ایس آئی جنرل رانا نسیم جنرل جہانگیر کرامت کا استعفیٰ نواز شریف کے حوالے کر گئے تو نواز شریف نے اپنے ملٹری سیکرٹری سے کہا کہ وہ کور کمانڈر منگلا لیفٹیننٹ جنرل پرویز مشرف کو کال کریں اور اس سے کہیں کہ وہ رات کے نو بجے سے پہلے پہلے انہیں آ کر ملیں۔ جنرل مشرف کو جب یہ ٹیلیفون کال ملی تو وہ بڑے حیران ہوئے کہ ملک کا وزیراعظم جس نے کچھ دیر پہلے آرمی چیف

سے اختلاف کیا تھا وہ انہیں اس طرح برطرف کر دیں گے جیسا کہ ہوا ہے۔ جنرل مشرف سری لنکا گئے ہوئے تھے اور انہوں نے جاتے وقت ان سے پوچھا کہ کیا جس دن وزیراعظم سے ملے تو ان کا رویہ کیسا تھا اور کیا وہ ان سے ناراض تو نہیں ہیں۔ جنرل مشرف کے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ کیا وزیراعظم ان سے ناراض ہیں، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ ان سے کافی عرصے سے ناراض چلے آ رہے تھے کہ اس فوج کی اعلیٰ قیادت کو نکال دیں گے۔ جنرل مشرف کو بتایا گیا کہ وہ ایسا کوئی پروگرام نہیں رکھتے اور وزیراعظم سے ملنے آئے گی۔

تاہم جنرل پرویز مشرف دو بجے تک ابھی ہوا میں تھے اس وقت وزیراعظم ہاؤس نے تبدیلی کی۔ پی ٹی وی نے تو بجے کی خبروں میں جنرل جہانگیر کرامت کے استعفیٰ کی خبر چلا دی تھی اور ساتھ میں جنرل پرویز مشرف کو نیا آرمی چیف بنانے کا بھی اعلان انہی خبروں میں کیا گیا۔ اس وقت جنرل مشرف اسلام آباد ایئرپورٹ پر پہنچ چکے تھے جب انہیں موبائل پر ان کے کسی دوست کا فون آیا کہ انہیں نیا آرمی چیف بنا دیا گیا ہے۔ اسی وقت جنرل مشرف کو یہ احساس ہوا کہ انہیں ایمرجنسی میں وزیراعظم ہاؤس کیوں بلایا جا رہا ہے۔

چوہدری نثار کے مطابق فوج میں ہر آرمی جنرل کی اپنی ایک لابی ہوتی ہے۔ اگر جنرل کی لابی پہلے نہ ہو تو آرمی چیف بننے کے بعد خود بخود بن جاتی ہے۔ تقرری نے جنرل مشرف کو آرمی چیف بنایا تھا جبکہ اب یہ کہا جا رہا ہے کہ ان کا نام نواز شریف کو کس نے دیا تھا۔

نئے آرمی چیف کی تقرری کے وقت نواز شریف کے پاس تین جرنیلوں کے نام موجود تھے جن میں جنرل علی قلی اور جنرل پرویز مشرف بھی تھے۔ سینیارٹی کے بعد مقابلہ جنرل علی قلی اور پرویز مشرف میں تھا۔ نواز شریف علی قلی خان سے خوش نہیں تھے کیونکہ شہباز صاحب سے جنرل کرامت کے ساتھ ان کی میٹنگز شروع ہوئی تھیں۔ جنرل علی قلی نے فوج کی ایک میٹنگ میں کچھ ایسی باتیں کی تھیں جو نواز شریف کو پسند نہیں آئی تھیں۔ اس کے علاوہ جنرل جہانگیر کرامت بھی علی قلی خان کے حق میں تھے تو یہ بات بھی ان کے خلاف چلی گئی اور یوں جنرل مشرف کو آرمی چیف بنا دیا گیا۔

○○○

نواز شریف کو شاید یہ اندازہ نہیں تھا کہ جنرل پرویز مشرف جیسا شخص ان کے لیے بے خطر آنے والا جنرل ہے۔ انہوں نے علی قلی خان کو نظرانداز کر کے آرمی چیف بنایا تھا وہ ایک دن ان کے اقتدار کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن کر سامنے آئے گا۔ کارگل کا آپریشن نواز شریف کے لیے ایک جھٹکے سے کم نہیں تھا۔ انہوں نے جن دنوں بھارتی وزیراعظم واجپائی کو لاہور بلایا ہوا تھا اس وقت ان کے اپنے آرمی چیف انہیں بتائے بغیر کارگل پر قبضہ کر چکے تھے۔ نواز شریف کو جنرل مشرف کے اس خفیہ پلان کا اس وقت پتہ چلا جب واجپائی نے ایک رات خود ٹیلی فون پر نواز شریف کو بتایا کہ ان کی آرمی بھارت کے ساتھ کارگل کے محاذ پر باقاعدہ جنگ کر رہی ہے۔

جب نواز شریف کے نوٹس میں یہ بات آئی تھی اس وقت اگر وہ چاہتے بھی تو وہ کارگل کی اس جنگ کو نہ تو روک سکتے تھے اور نہ ہی اسے Reverse کر سکتے تھے۔ معاملات ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے اور جنرل مشرف کے اس ایڈونچر کا نواز شریف کی حکومت پر بہت برا اثر پڑنے والا تھا۔

نواز شریف اور ان کی حکومت کو فوجی قیادت نے کارگل آپریشن کے بارے میں صرف اتنا کچھ بتایا جو ان کے خیال میں سیاسی قیادت کو بتانا چاہیے تھا۔ ساری بات اس وقت کھل کر سامنے آئی جب گورنر ہاؤس لاہور میں نواز شریف کو جنرل پرویز مشرف نے کارگل آپریشن پر بریفنگ دی جس میں اس وقت کے نیول چیف فصیح بخاری اور ایئر چیف پرویز مہدی بھی شامل تھے۔ جب جنرل پرویز مشرف نے اس آپریشن کی تفصیلات بتائیں تو اس میٹنگ کے باقی شرکاء کو تو چھوڑیں، وہاں بیٹھے فصیح بخاری اور پرویز مہدی بھی ہکا بکا رہ گئے۔ ان دونوں نے شدید حیرانی کا اظہار کیا اور بولے کہ انہیں تو کبھی بھی اس آپریشن سے پہلے اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ بھارت کے ساتھ ایک کھلی جنگ کی صورت میں ان دونوں نے اپنی جو رائے دی اس سے وہاں بیٹھے تمام لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ان دونوں کی باتوں سے سب کو پتہ چلا کہ اگر بھارت نے کارگل کو بنیاد بنا کر پاکستان پر فضائی اور بحری راستوں سے حملہ کیا تو شاید صورتحال بہت خراب ہو جائے۔ اس میٹنگ میں بیٹھے ہوئے تمام شرکاء کو پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ کارگل کی وجہ سے پاکستان ایک بہت بڑے خطرے میں گھر گیا تھا۔

میں نے چوہدری نثار سے پوچھا کہ جنرل مشرف یہ دعویٰ کرتے آئے ہیں کہ انہوں نے کارگل کا آپریشن نواز شریف کی منظوری سے شروع کیا تھا۔ چوہدری نثار ہنسے اور بولے کہ نواز شریف نے اگر کوئی منظوری دی تھی تو کیا وہ اتنے بیوقوف تھے کہ وہ ایک طرف کارگل کا آپریشن شروع کراتے اور دو

ہونے کے اندر اندر چوہدری کو لاہور بلا لیجیے۔

گورنر ہاؤس لاہور میں ہونے والی اس میٹنگ کے بعد چوہدری نثار کو وزیر اعظم نواز شریف نے فون کیا اور کہا کہ وہ فوری طور پر ان کے ساتھ امریکہ جانے کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ یہ پاکستانی فوج کی عزت بچانے کا وقت ہے۔ نواز شریف اس وقت حیران رہ گئے جب چوہدری نثار نے انہیں امریکہ جانے سے منع کیا اور کہا کہ میاں صاحب انہی لوگوں نے اپنے سویلین لیڈروں کو اعتماد میں لیے بغیر کارگل کا ایڈونچر شروع کیا ہے انہیں اب اس کے نتائج بھی بھگتنے دیں۔

نواز شریف نے تب یہ جواب دیا کہ چوہدری صاحب میں اپنے ملک کی فوج کو بھارتی افواج کے سامنے ذلیل ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔

نثار نے مجھے بتایا کہ انہوں نے جس طریقے سے نواز کے امریکہ جانے کی مخالفت کی تھی اس کے گواہ شہباز شریف خود ہیں۔

نثار نے اس موقع پر گہرا سانس لیا اور مجھے دیکھ کر بولے کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ جس فوج کو نواز شریف نے ذلیل ہونے سے بچایا تھا اسی نے انہیں اٹک قلعے میں ڈال دیا۔

نثار مجھے بتانے لگے کہ یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ جس سیاسی وزیر اعظم نے فوج کے ساتھ اچھائی کی اسی فوج نے انہیں [illegible] اٹک قلعے میں قید کر دیا۔

اپنی بات میں وضاحت پیدا کرنے کے لیے نثار نے کہا کہ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جو پاکستانی فوجی بھارتی قید سے رہا کرائے تھے اسی آرمی نے انہیں پھانسی دی۔ ٹھیک تیس سال بعد اسی فوج نے یہی کچھ نواز شریف کے ساتھ کیا۔ اپنی فوج کی عزت بچانے کے لیے نواز شریف اپنے اوپر تمام تر تنقید سہتے ہوئے 4 جولائی 1999ء کو امریکی صدر بل کلنٹن سے ملنے گئے۔ انہوں نے وہاں امریکی مداخلت کے ذریعے ہماری فوج کی عزت بچائی جو اس وقت بھارتی افواج کی وجہ سے نہایت خطرے میں تھی۔ ٹھیک تین ماہ بعد اسی فوج نے نواز شریف کو ہتھکڑیاں لگا کر وزیر اعظم ہاؤس سے گرفتار کر لیا۔

نواز شریف اور جنرل مشرف میں بھی تنازعات پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان اختلافات میں اصل تیزی اس وقت آئی جب یہ خبریں سامنے آنے لگیں کہ جنرل مشرف کوئٹہ کے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل طارق پرویز کو نواز شریف سے ملاقات کرنے پر برطرف کرنے والے تھے۔

شہباز شریف، چوہدری نثار اور جنرل مشرف ڈنر پر اکٹھے ہوئے۔ جنرل مشرف نے انہیں بتایا کہ وہ جنرل طارق کو برطرف کرنے والے ہیں۔ نثار نے جنرل مشرف کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر ان کے خیال میں جنرل طارق کے خلاف ایکشن لینا بہت ضروری ہے تو انہیں برطرف کرنے کے بجائے ان کا کہیں ٹرانسفر کر دیں۔ جنرل مشرف نے چوہدری نثار کی اس تجویز سے اتفاق کیا۔

نثار نے شہباز شریف سے بھی کہا کہ وہ نواز شریف کو مت بتائیں کہ ان کی جنرل پرویز مشرف سے جنرل طارق کے معاملے پر کیا بات ہوئی تھی کیونکہ وزیر اعظم پہلے ہی خاصے ناخوش تھے۔ تاہم شہباز شریف کے پیٹ میں یہ بات نہ رہ سکی اور انہوں نے جاتے ہی نواز شریف کو یہ بات فوراً بتا دی کہ جنرل مشرف جنرل طارق پرویز کو ان سے ملاقات کرنے کے الزام میں کوئٹہ کے کور کمانڈر کی پوزیشن سے ٹرانسفر کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب نواز شریف کی سسرال میں ہونے والی کسی کی موت پر جنرل مشرف ان سے تعزیت کے لیے ان سے ملنے گئے تو وزیر اعظم نے جنرل طارق کا معاملہ ان کے سامنے اٹھایا جس سے ان دونوں کے درمیان تلخی مزید بڑھ گئی۔ اگر ابھی بھی کوئی کسر رہ گئی تھی تو اخبار میں یہ خبر چھپ گئی کہ جنرل طارق کو وزیر اعظم نواز شریف سے ملاقات کرنے پر جنرل مشرف نے برطرف کر دیا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر نواز شریف خاصے اشتعال میں آ گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ فوری طور پر آئی ایس پی آر اس کی ایک وضاحت جاری کرے۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ کور کمانڈر راولپنڈی جنرل محمود نے یہ تجویز پیش کی کہ آئی ایس پی آر کے بجائے وزارت دفاع اپنی طرف سے ایک وضاحت جاری کر دے۔ تاہم غصے سے بھرے نواز شریف نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔

اسی اثناء میں فوج میں یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ نواز شریف چار جرنیلوں کو کارگل آپریشن کے متعلق وزیر اعظم کو بے خبر رکھنے کے الزام میں برطرف کرنا چاہتے ہیں جن میں جنرل محمود، جنرل عزیز، کور کمانڈر ناردرن ایریاز جنرل جاوید حسن اور ڈی جی ملٹری آپریشنز جنرل توقیر ضیاء شامل ہیں۔

نثار نے کہا کہ اس طرح کا تاثر فوج میں جان بوجھ کر پھیلایا گیا تھا تاکہ ایک سیاسی حکومت کو برطرف کر کے مارشل لاء لگایا جائے جیسا کہ جنرل ضیاء نے 1988ء میں جونیجو حکومت کو برطرف کرنے کے لیے اسی طرح کا بہانہ تراشا تھا کہ وزیر اعظم جونیجو اوجڑی کیمپ کے ذمہ دار جرنیلوں کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تھے۔

جنرل مشرف نے فوری طور پر چوہدری نثار اور شہباز شریف سے رابطہ کیا اور ان سے پوچھا کہ کیا نواز شریف ان جرنیلوں کو برطرف کرنا چاہتے ہیں؟ جس پر ان دونوں نے انہیں یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ مشرف کو ذرا اطمینان دلانے کے لیے انہیں نواز شریف سے ملا کر جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کا عہدہ بھی دلوا دیا گیا۔

اسی دوران میں جنرل مشرف کے قریبی جرنیلوں نے نواز شریف کو برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان کا پلان یہ تھا کہ اگر نواز شریف نے جنرل مشرف کو ہٹانے کی کوشش کی تو وہ اس پر ری ایکشن دیں گے۔ ان جرنیلوں نے سیاسی حکومت کو ایک باقاعدہ پیغام بھی بھجوا دیا تھا کہ اگر جنرل مشرف کو ہٹانے کی کوشش کی گئی تو وہ اس پر شدید ردعمل ظاہر کریں گے۔ نواز شریف کے گرد بیٹھے سازشیوں نے انہیں تجویز دی کہ اگر انہوں نے جنرل مشرف کو برطرف نہیں کیا تو فوج انہیں برطرف کر دے گی۔ دونوں اطراف نے اپنے جرنیلوں برطرفی سے بچنے کے لیے اپنے اپنے انداز میں ایک ردعمل ظاہر کیا اور نتیجہ ان کے حق میں ہوا جن کے پاس ٹینک اور توپیں تھیں۔

میں نے نثار سے پوچھا کہ سننے میں تو یہ بھی آیا تھا کہ جنرل مشرف چاہتے تھے کہ نواز شریف وزارت عظمیٰ کا عہدہ اپنے چھوٹے بھائی شہباز شریف کو دے دیں کیونکہ وہ انہیں زیادہ بہتر لیڈر سمجھتے تھے۔

میری بات سن کر چوہدری نثار مسکرائے اور بولے کہ دراصل شہباز شریف کو تھوڑی سی غلط فہمی ہوئی تھی۔ اگر آپ نواز شریف کے اقتدار کے آخری دن یاد کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ آرمی قیادت اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ وہ نواز شریف کو کسی بات پر ڈکٹیشن دیتی۔ جنرل مشرف نے دراصل مذاق میں یہ بات کی تھی۔ اصل واقعہ کچھ یوں تھا کہ جنرل مشرف، نثار اور شہباز اکٹھے لنچ کر رہے تھے جب جنرل مشرف نے مذاق کے انداز میں شہباز شریف سے کہا کہ آپ پنجاب پر حکمرانی کرنے کی بجائے اسلام آباد کیوں نہیں آ جاتے۔ مشرف کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اسلام آباد آ کر ایک طرح سے ڈپٹی پرائم منسٹر کا رول ادا کریں اور نواز شریف کو ان کے مسائل سلجھانے میں ان کی مدد کریں۔

○○○

12 اکتوبر 1999ء کی شام چوہدری نثار علی خان وزیراعظم ہاؤس میں سو رہے تھے جب نواز شریف نے جنرل پرویز مشرف کو برطرف کر کے جنرل ضیاء الدین بٹ کو آرمی چیف مقرر کر دیا۔ اس سے پہلے 9 اکتوبر کو چوہدری نثار علی خان ولی خان سے ملنے کے لیے لندن گئے تھے تاکہ وہ انہیں دوبارہ حکومت میں واپس لا سکیں۔ وہ لندن میں دس دن رہنا چاہتے تھے اور 19 اکتوبر کو پاکستان واپس لوٹنے تھے۔ چوہدری نثار نے 11 اکتوبر کو نواز شریف سے ملنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ وہ ملتان گئے ہوئے تھے۔

12 اکتوبر والے دن شہباز شریف نے چوہدری نثار کو وزیراعظم ہاؤس لنچ پر بلایا۔ دونوں نے وزیراعظم ہاؤس میں شہباز شریف کے کمرے میں بیٹھ کر لنچ کیا۔ ان دونوں کو بتایا گیا کہ وزیراعظم ابھی ملتان سے واپس لوٹے ہیں اور کسی میٹنگ میں مصروف ہیں۔ نثار اور شہباز نے وزیراعظم کو پیغام بھجوایا کہ وہ ساتھ والے کمرے میں موجود ہیں۔ جب وہ فارغ ہو جائیں تو انہیں بلا لیا جائے۔

اسی اثناء میں شہباز شریف سو گئے اور چوہدری نثار ٹی وی دیکھتے رہے۔ اچانک چوہدری نثار نے پی ٹی وی پر جنرل مشرف کی برطرفی کی خبر سنی اور فوری طور پر شہباز شریف کو جگایا۔ شہباز شریف کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ نواز شریف نے جنرل مشرف کو برطرف کر دیا ہے۔ انہوں نے بڑے غصے میں چوہدری نثار سے کہا کہ وہ ابھی جا کر وزیراعظم کو پنجاب کی وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیں گے کیونکہ اگر وہ اپنے سگے بھائی پر بھروسہ نہیں کر سکتے تو اس کے بعد وزیراعلیٰ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں!

نثار نے بپھرے ہوئے شہباز کو ٹھنڈا کیا اور کہا کہ ان کے لیے پہلے ہی بہت بڑے مسائل کھڑے ہو گئے ہیں، وہ اب نئے مسائل نہ کھڑے کریں۔ چوہدری نثار وزیراعظم ہاؤس سے نکلے اور راولپنڈی میں واقع اپنے گھر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہیں شہباز شریف کا فون آیا کہ چند فوجی افسران نے پی ٹی وی پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی، انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ نثار نے دوبارہ اپنی گاڑی نکالی اور وزیراعظم ہاؤس کی طرف دوڑا دی لیکن اب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ فوجی وزیراعظم ہاؤس کو گھیرے میں لے چکے تھے اور کسی نے انہیں اندر نہیں جانے دیا۔

چوہدری نثار کو سمجھ آ گئی کہ سارا کھیل ختم ہو گیا ہے۔

○○○

چوہدری نثار جب اپنے گھر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ فوجیوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ پہلے تو انہوں نے انہیں گھر کے اندر جانے کی اجازت نہیں دی۔ آخرکار منت کے بعد انہیں اندر جانے دیا گیا وہ دو سال تک اسی گھر میں قید رہے۔

ایک رات انہیں اچانک کسی کا [illegible] وہ ساری رات [illegible] نے انہیں علاج کے لیے باہر جانے دیا ... کے وقت کہیں جا کر ان کا آپریشن ہوا۔

وہ چوہدری نثار علی خان کی زندگی کے سب سے مشکل ترین دن تھے۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن یہ فوجی ان کے گھر سے گرفتار کر کے انہیں اپنے ہی گھر میں قید کر لیں گے۔ یہ فوجی ان کی اور ان کے بچوں کی ڈاک کو چیک کرتے تھے۔

ایک دن ایم آئی اور ایف آئی اے کے دو افسر چوہدری نثار سے ملنے کے لیے گھر آئے۔ ان دونوں نے نثار سے کہا کہ وہ نواز شریف کے خلاف ایک تحریری بیان دیں کیونکہ انہوں نے ان سے رابطہ کے لیے جنرل کی منظوری لی تھی۔ نثار نے ان سے کاغذ چھین لیا اور نواز شریف کے حق میں بیان لکھ کر دے دیا۔

جنرل مشرف کو چوہدری نثار کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ جس دن مشرف نے رفیق تارڑ کو ہٹا کر خود صدر بننے کا فیصلہ کیا، اس سے ایک دن پہلے غیر متوقع طور پر اس وقت کے ڈی جی آئی ایس آئی جنرل محمود ان کے گھر پر تشریف لائے۔ جنرل محمود تین گھنٹے تک چوہدری نثار کے ساتھ رہے۔ وہ دو گھنٹے پچاس منٹ تک بولتے رہے اور جنرل محمود سنتے رہے۔ ان تین گھنٹوں میں جنرل محمود صرف دس منٹ کے لیے بول پائے۔

جونہی جنرل محمود چوہدری نثار سے ہاتھ ملا کر صوفے پر بیٹھے نثار نے ان کے بولنے سے پہلے ہی ان پر تین باتیں بڑی واضح کر دیں۔ انہوں نے جنرل کو بتایا کہ وہ نواز شریف کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے، پی ایم ایل کیو کو جائن نہیں کریں گے اور جنرل مشرف کی حکومت کے حق میں کوئی بیان جاری نہیں کریں گے۔

جنرل محمود نے مسکراتے ہوئے کہا کہ بالکل ٹھیک ہے کہ آپ نواز شریف کو نہیں چھوڑنا چاہتے ہیں لیکن نواز شریف کے بارے میں کیا خیال ہے جو انہیں چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں جدہ چلے گئے تھے۔

نثار نے جنرل محمود سے کہا کہ اگر آج انہوں نے نواز شریف سے بے وفائی کر کے اس قید سے رہائی پا بھی لی تو وہ ساری عمر اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکیں گے۔

یہ بات سن کر جنرل محمود واپس چلے گئے۔

فوجیوں کے ہاتھوں اپنے گھر میں ہی دو سال تک قید رہنے کی وجہ سے چوہدری نثار کے بچوں پر بڑا گہرا نفسیاتی اثر پڑا۔ اس دوران وقت میں چوہدری نثار کے بچوں کو سب سے [illegible] کا سامنا کرنا پڑا۔

جب چوہدری نثار اپنے گھر میں قید تھے تو جنرل مشرف نے انہیں اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ انہیں مختلف قسم کی آفرز دی جاتی رہیں۔ انہیں پی ایم ایل کیو کا صدر بنانے سے لے کر وزیر اعظم بنانے تک کی بھی پیشکش کی گئی۔

اسی اثناء میں پی ایم ایل نواز کے لیڈروں کی طرف سے چوہدری نثار علی خان پر انگلیاں اٹھائی جانے لگیں۔ سب کو اس بات کا پتہ تھا کہ جنرل مشرف کو آرمی چیف بنوانے والے چوہدری نثار تھے لہٰذا حکومت کی برطرفی کا ذمہ دار ایک لحاظ سے انہیں بھی ٹھہرایا جا رہا تھا۔ ان دنوں کلثوم نواز اور تہمینہ دولتانہ نے جنرل مشرف کی حکومت کو مشکل میں ڈالا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ بات مشہور ہونا شروع ہو گئی کہ جنرل مشرف نے نواز شریف، شہباز شریف، خواجہ آصف، اسحاق ڈار اور پارٹی کے دیگر ٹاپ لیڈروں کو تو جیلوں اور اٹک قلعے میں رکھا ہوا تھا جبکہ چوہدری نثار وہ واحد لیڈر تھے جنہیں گھر پر قید کیا گیا تھا۔ بہت سارے سوالیہ نشانات چوہدری نثار علی خان کی نواز شریف اور پارٹی سے وفاداری پر اٹھائے جا رہے تھے۔ اور تو اور کلثوم نواز کی بھی یہی سوچ تھی کہ چوہدری نثار جنرل مشرف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور اس کے بدلے میں انہیں جیل کے بجائے گھر میں رکھا گیا ہے۔ یہ ساری باتیں کلثوم نواز، نواز شریف کے کانوں میں ڈال رہی تھیں جب وہ ان سے ملنے جیل جاتیں۔ اسی اثناء میں یہ بات بھی مشہور کی گئی کہ کسی نے رات کے اندھیرے میں چوہدری نثار کو باقاعدہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے چکری کی طرف جاتے ہوئے موٹروے پر دیکھا تھا۔ ان تمام باتوں کا نواز شریف پر بڑا اثر ہو رہا تھا۔ انتہائی غیر محسوس طریقے سے نواز شریف ان باتوں پر قائل ہونا شروع ہو گئے تھے کہ چوہدری نثار علی خان بھی جنرل مشرف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ نواز شریف کا ان باتوں پر فوراً یقین کرنے کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ

جنرل مشرف اور چوہدری نثار اچھے [illegible] ایک دوسرے کے [illegible] دوست تھے [illegible] انہیں [illegible] کر دیا گیا تھا۔

چوہدری نثار کو ان باتوں کا علم نہیں تھا۔ انہیں بعد میں نواز شریف کا ان کی ذات پر شک کرنے کا اس وقت پتہ چلا جب ان کی قید ختم کی گئی۔ چوہدری نثار رہائی کے بعد سیدھے لندن پہنچے تو وہاں انہیں نواز شریف کا فون آیا۔ انہوں نے پوچھا کہ انہوں نے رہائی کے بعد یہاں دیگر لوگوں کا نام لے کر شکریہ ادا کیا، لیکن انہوں نے ان کا نام کیوں نہیں لیا۔ اس پر چوہدری نثار نے انہیں جواب دیا کہ میاں صاحب! مجھے ان تمام لوگوں نے فون کر کے مبارکباد دی تھی۔ میں آپ کے فون کا انتظار کرتا رہا لیکن آپ نے مجھے فون کر کے مبارکباد نہیں دی تھی۔ میں نے بھی آپ کا شکریہ ادا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

چوہدری نثار اور نواز شریف کے درمیان ٹیلی فون پر ہونے والی اس مختصر گفتگو کے بعد یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اب دونوں کے سیاسی اور ذاتی تعلقات جو 1985ء میں شروع ہوئے تھے، وہ سترہ سال بعد آخرکار شکوک و شبہات کی نذر ہو گئے تھے۔ چوہدری نثار نے سیاست چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جب وہ واپس آئے تو انہوں نے اپنے قریبی ساتھیوں کو بتایا کہ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ سیاست کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیں گے۔ چوہدری نثار کے ساتھیوں نے اس پر بڑا شدید ردعمل ظاہر کیا۔ انہوں نے چوہدری نثار کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب نثار کے لیے ایک اور بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ وہ کس پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں کیونکہ وہ اپنی مسلم لیگ نواز کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ چکے تھے جس کی قیادت نے انہیں اس بات پر سراہنے کی بجائے کہ انہوں نے پارٹی سے برے وقتوں میں غداری نہیں کی تھی، ان پر شک کیا تھا کہ وہ شاید جنرل مشرف کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور ان کی نگرانی کی گئی تھی۔

چوہدری نثار نے مجھے بتایا کہ اپنی سیاسی تاریخ کے اس اہم مرحلے پر میرے پاس دو راستے تھے: یا تو میں پی ایم ایل نواز کے ساتھ چلتا رہوں یا پیپلز پارٹی کو جائن کروں۔

انہوں نے بینظیر بھٹو کی قریبی ساتھی آمنہ پراچہ جو ان کی جیل فرینڈ تھیں، کے ذریعے پیپلز پارٹی جائن کرنے کے لیے بات چیت بھی شروع کرا دی تھی۔

جب اس بات کا پتہ شہباز شریف کو چلا کہ چوہدری نثار نے سیاست ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو انہوں نے فوری طور پر چوہدری نثار کو اس سے روکا۔ اکتوبر 2002ء کے الیکشن سر پر تھے۔ شہباز شریف نے چوہدری نثار کو اپنی پرانی پارٹی [illegible] اپنی پارٹی کی طرف سے الیکشن لڑنے پر راضی کر لیا۔

نواز شریف نے فون کر کے چوہدری نثار علی خان کو جدہ آنے کی دعوت دی۔ جب تین سال بعد نواز شریف اور چوہدری نثار کی ملاقات ہوئی تو نثار نے گلہ کیا کہ جنرل مشرف کی برطرفی سے پہلے ان سے مشورہ کیوں نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر نواز شریف نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اگر وہ انہیں اور شہباز شریف کو یہ بات بتاتے تو شاید وہ انہیں جنرل مشرف کو برطرف نہ کرنے دیتے اور وہ ہر قیمت پر جنرل کو گھر بھیجنا چاہتے تھے۔ چوہدری نثار نے نواز شریف سے یہ بھی شکایت کی کہ وہ ان تین سالوں میں اچھے برے حالات سے گزرے لیکن انہوں نے کبھی ان سے یا پارٹی سے بے وفائی نہیں کی لیکن اس کے باوجود بھی پارٹی کے لیڈران ان کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھے۔

چوہدری نثار علی خان کا اشارہ کلثوم نواز کی طرف تھا جن سے کئی برسوں سے ان کی بول چال تک بند تھی اور آج تک ہے۔

○○○

جب میں چوہدری نثار علی خان سے 2003ء میں ان کے گھر پر ملا تھا، اس وقت پاکستان کا نیوکلیئر ایشو ایک دفعہ پھر تنازعات میں گھر چکا تھا۔ باتوں باتوں میں چوہدری صاحب نے اس بات کا انکشاف کیا کہ 1991ء میں ایک دن اس وقت کے آرمی چیف چوہدری نثار سے ملے اور انہیں وزیراعظم نواز شریف کے نام ایک بڑا خفیہ پیغام دیا۔ جنرل اسلم کے بقول کہ اگر پاکستان ایک مسلم ملک کو نیوکلیئر ٹیکنالوجی فراہم کرنے پر تیار ہو جائے تو وہ اس کے بدلے میں بارہ ارب ڈالر دینے کو تیار تھا۔

یہ سن کر چوہدری نثار علی خان جو اس وقت وزیر پٹرولیم کے علاوہ نواز شریف کے اسپیشل اسسٹنٹ بھی تھے، ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ انہوں نے جنرل کو بتایا کہ اس طرح کی

ہونے والی پاکستان کے مفاد میں ہرگز نہیں ہے۔ حیرانی میں ڈوبے چوہدری نثار نے جنرل سے پوچھا کہ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ وہ وزیراعظم کے نام کس طرح کی تجویز بھیج رہے ہیں اور پاکستان جیسا مسلم ملک کو نیوکلیئر ٹیکنالوجی ایکسپورٹ کرنے کے الزامات کی بنا پر کس طرح کے سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

آرمی چیف چوہدری نثار کی یہ بات سن کر پھر بھی اپنی بات پر ڈٹے رہے اور انہوں نے کہا کہ آپ ایک دفعہ وزیراعظم نواز شریف سے بات تو کریں۔ وہ اس ڈیل کے ذریعے پاکستان کو بڑی آسانی سے بارہ ارب ڈالر دلوا سکتے تھے۔

جب چوہدری نثار نے نواز شریف کو جنرل کی اس پیشکش کے بارے میں بتایا تو وہ بھی ششدر رہ گئے اور انہوں نے نہایت نفرت بھرے لہجے میں اس تجویز کو نہ صرف مسترد کیا بلکہ کہا کہ کس طرح آرمی چیف کسی بھی ملک کو نیوکلیئر ٹیکنالوجی فروخت کرنے کی اس طرح کی احمقانہ تجاویز اپنے دماغ میں لیے گھوم رہا ہے۔

یہ واقعہ سنا کر چوہدری نثار نے مجھے کہا کہ عمومی طور پر ہمارے یہ فوجی جرنیل سیاسی قیادت کو نااہل سمجھتے ہیں کہ شاید یہ ملک چلانے کے قابل نہیں ہوتے۔ اب بھلا بتائیں کہ ایسے آرمی چیف کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو محض امریکہ کو سبق سکھانے کے نام پر ایک اسلامی ملک کو بارہ ارب ڈالر کے عوض ایٹم بم فروخت کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھے ہیں۔

میں چوہدری نثار کی یہ بات سن کر یہ سوچتا اور مسکراتا ہوا ان کے گھر سے باہر آ گیا کہ جنرل اسلم بیگ پہلے آرمی چیف نہیں تھے جن کے ذہن میں ایسے بڑے بڑے اعلیٰ خیالات پرورش پا رہے تھے۔ جنرل بیگ سے بڑا کام تو جنرل مشرف نے کر دکھایا تھا جنہوں نے نہ صرف کارگل پر حملہ کر دیا اور نواز شریف کو واشنگٹن بھجوا کر امریکہ کو بیچ میں ڈال کر بھارت کا حملہ کرنے سے بچایا اور اسی کارگل کو استعمال کر کے وزیراعظم کو اقتدار سے ہٹا کر جانے کے عرصے سے اس ملک پر حکمرانی کی اور سب سے بڑھ کر انہوں نے چوہدری نثار کو استعمال کر کے اپنے آپ کو آرمی چیف بھی بنوایا تھا۔

جب انہوں نے مجھے کہا کہ ان کو ملک کون چلا رہا ہے اور سب سے اہم فوجی دماغوں کے کہنے پر چلتے ہیں

رہے ہیں۔ آپ تصور کریں کہ اگر سیاسی طور پر چالاک اور سمجھدار یہ فوجی جرنیل ہمارے سیاستدان ہوتے اور محبوب اور اوسط درجے کی ذہانت رکھنے والے یہ سیاستدان ان کی جگہ فوجی جنرل ہوتے تو شاید پاکستان آج ایک ترقی یافتہ ملک بن چکا ہوتا!

○○○

میرا چوہدری نثار علی خان کے بارے میں تجربہ اچھا تھا۔ تاہم، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مجھ جیسے سیاسی رپورٹنگ کے شوقین بہت جلد ان لیڈروں کی باتوں میں آ جاتے ہیں اور انہیں پتہ نہیں کیا کچھ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ جونہی چوہدری نثار نے قومی اسمبلی میں اپنے پر پرزے پھیلانا شروع کیے تو یہ وہ شخص نہیں تھے جن سے مل کر میں نے ان کا انٹرویو کیا تھا۔ ان کی آواز اور رویے میں رعونت اور تکبر آ چکا تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کسی سے ہاتھ بھی ملائیں تو اس کے بعد واش روم جا کر اپنے ہاتھ دھوتے ہیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے بلا کر جنرل مشرف کے ایک وزیر کے سکینڈل کے دستاویزی ثبوت دیے۔ وہ وزیر ان کے حلقے میں ان کا روایتی حریف تھا۔ خبر اچھی تھی لہٰذا میں نے فائل کر دی۔ کچھ دنوں بعد ان کا مجھے پھر فون آیا۔ وہ بڑے پریشان تھے۔ چکری کے قریب واقع ان کے گاؤں سے ملحقہ زمینوں کو فوجیوں نے ایکوائر کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ وہاں کوئی فوجی تنصیب بنانا چاہتے تھے۔ چوہدری نثار کی اپنی زمینیں بھی ان میں آ رہی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں اس پر ایک سٹوری فائل کروں۔ انہوں نے مجھے کچھ کاغذات بھی دیے۔ میں نے اپنے ایڈیٹر سے بات کی تو انہوں نے زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بہرحال، میں نے بمشکل اپنے ایڈیٹر کو راضی کر لیا کہ ہمیں یہ خبر شائع کرنی چاہیے۔ اس کام میں دو تین دن لگ گئے۔ ایک شام مجھے چوہدری نثار کا بڑے غصے میں فون آیا کہ میں نے اب تک وہ خبر کیوں نہیں فائل کی۔ میں ان کی فون سن کر بڑا حیران ہوا۔ وہ ایسا ظاہر کر رہے تھے جیسے وہ میرے باس ہوں اور میں کسی سرکاری محکمے کا ملازم۔ اس دن کے بعد میرے ان سے کچھ تعلقات ٹھیک نہیں رہے ہیں نہ میں نے کبھی ان سے ہاتھ ملانے کا سوچا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ سب سیاستدان صحافیوں کو محض استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ ان کی مرضی کی خبر کر دے رہے ہیں تو آپ بڑے اچھے اور دوست صحافی ہیں۔ اگر آپ اپنے پروفیشنلزم کو فالو کریں گے تو پھر یہ ایک لمحے میں اپنی اوقات پر آ جاتے ہیں۔ میں نے چوہدری نثار کے اس رویے سے سبق سیکھا اور اس کے بعد میں

نے کسی سیاستدان کو اپنا دوست کہنے کی حماقت نہیں کی۔ چوہدری نثار سے رہی سہی امید بھی اس وقت ختم ہو گئی جب ان ہی دنوں کے دوران اعزاز سید نے اپنے چینل پر یہ خبر بریک کی کہ چوہدری نثار اور شہباز شریف آرمی چیف اشفاق پرویز کیانی سے اب تک چھ خفیہ ملاقاتیں کر چکے تھے۔ اس خبر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جیلوں میں مار کھانے کے باوجود بھی یہ سیاستدان فوج کے ساتھ مل کر اس ملک اور اس کی سیاست کے خلاف سازشیں کرنے سے باز نہیں آتے۔ جنرل مشرف کے دور میں ماضی سے سبق حاصل کرنے کے دعویدار ایک دفعہ پھر سے آرمی چیف کے دروازے پر رات کو چوروں کی طرح دستک دے رہے تھے۔

جنرل علی قلی خان

جس دن میں نے چوہدری نثار علی خان کا انٹرویو کیا تھا اور انہوں نے جنرل علی قلی کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کی تھیں جس کے بعد مجھے یہ یقین تھا کہ اس سابق جنرل سے اب گفتگو کرنا شاید اتنا مشکل نہیں رہ گیا ہے۔ ایک دن میں اسلام آباد میں واقع فرانسیسی سفارتخانے کی کسی تقریب میں شامل ہونے کے لیے گیا تو وہاں علی قلی کے بھائی رضا علی خان سے ملاقات ہوئی۔ پتہ چلا وہ پشاور میں فرانسیسی قونصل خانے میں اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ میرے لیے یہ بڑا سنہری موقع تھا کہ میں جنرل قلی کے بھائی کے ذریعے ان کا انٹرویو کرنے کی کوشش کروں کیونکہ نثار کے انٹرویو کے بعد مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جنرل علی کے پاس بتانے کو بہت کچھ ہوگا۔

دو تین بعد آخر میرا جنرل علی قلی سے رابطہ ہو گیا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ انہوں نے چوہدری نثار کا انٹرویو پڑھ لیا تھا اور اب وہ مجھے گفتگو کرنے کا وقت دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

میں جنرل علی قلی سے ملنے کے لیے ان کے راولپنڈی میں جی ایچ کیو کے قریب واقع گھر میں گیا۔ جنرل قلی اس وقت گھر پر اکیلے تھے۔ انتہائی عزت واحترام اور شائستگی کے ساتھ وہ مجھے اندر لے گئے اور بتانے لگے کہ ساتھ والا گھر سابق آرمی چیف جنرل وحید کاکڑ کا ہے۔ جونہی انہوں نے جنرل کاکڑ کا نام لیا تو میرے اندر ایک رپورٹر کا لالچ پھر جاگ پڑا اور میں نے ان سے اسی وقت درخواست کر

[illegible] ابھی میں جنرل علی قلی کے [illegible] ان کے گھر [illegible] جنرل علی قلی کے گھر [illegible] جنرل حبیب [illegible] کے بیٹے ہیں۔ میں دل ہی دل میں [illegible] ہے کہ بہت جلد [illegible] کے [illegible] 1965 [illegible] سیاست کے [illegible] اہم [illegible] اہم [illegible] جنرل علی قلی وہ ایک ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے اور [illegible] کے لیے [illegible] تھے۔

میں نے باتوں باتوں میں جنرل علی قلی کو تھوڑا سا جذباتی پایا۔ اپنے ساتھ ان ہونے والی ناانصافی پر وہ کئی سال بعد بھی ناراض تھے۔ باپ سے بیٹا اور بیٹے سے پوتے تک فوج میں جانے کی روایت ڈالی گئی تھی۔ علی قلی کا بیٹا فوج میں چھ سال نوکری کرنے کے بعد کیپٹن کے عہدے پر ریٹائر ہو کر گھر آ گیا تھا۔ یوں جنرل حبیب اور جنرل علی قلی کی روایت تیسری نسل پر آ کر ختم ہو گئی تھی۔

علی قلی نے مجھے جو اصل بات بتائی وہ یہ تھی کہ انہیں سینئر موسٹ ہونے کے باوجود بھی آرمی چیف نہیں بنایا گیا تھا۔ یوں ان کا حق مارا گیا تھا۔ جب جنرل علی قلی نے یہ خبر سنی کہ جنرل مشرف کو چیف آف آرمی سٹاف بنا دیا گیا تھا تو انہوں نے اسی وقت خدا کا شکر ادا کیا کہ آج ان کا باپ جنرل حبیب یہ خبر سننے کے لیے زندہ نہیں تھا۔

جنرل حبیب ایک پروفیشنل اور قابل جنرل تھے۔ جنرل حبیب اور جنرل موسیٰ دونوں ہم عصر بھی تھے۔ جنرل موسیٰ ایک رنگروٹ تھے جبکہ ان کے برعکس جنرل حبیب نے باقاعدہ انڈین ملٹری میں کمیشن لے کر اپنے آرمی جوائن کی تھی۔ اگرچہ جنرل موسیٰ اس وجہ سے سینئر تھے کہ ان کا پاس آؤٹ جنرل حبیب سے پہلے ہوا تھا لیکن جہاں تک اہلیت اور خوبیوں کا تعلق تھا ان کا جنرل حبیب سے کوئی جوڑ نہیں بنتا تھا۔ جنرل ایوب کو اصل ایک ایسا وفادار کے جنرل کی ضرورت تھی اور جنرل موسیٰ ان کی ذات کے لیے بہت موزوں تھے۔ یوں 1959 میں صرف 55 سال کی عمر میں جنرل ایوب نے جنرل حبیب کو ریٹائر کر دیا۔

جب جنرل حبیب ایک عمر رسیدہ باپ کے ساتھ ریٹائر ہو کر گھر آئے تو انہوں نے اپنے بیٹے علی قلی کو بلایا اور اسے کہا کہ جاؤ آرمی جوائن کرو کہ تم نے ایک دن آرمی چیف بننا ہے۔

اپنے باپ کے بارے میں بات کرتے ہوئے علی قلی تھوڑے سے جذباتی ہوئے اور ماضی میں کھو گئے۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ جب ان کی سب سے پیاری بیٹی کی زیب (جو 2003 میں انتقال کر گئی) تھیں۔ وہ گوہر ایوب کی بیوی اور عمر ایوب خان کی والدہ ہیں۔ ان سے ملنے کراچی گئیں تو وہ اپنے بیٹے علی قلی کے فوج میں مستقبل کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ اگرچہ وہ بستر پر بیمار پڑے تھے لیکن وہ اپنے بیٹے کے فوج میں مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ جنرل حبیب نے اپنی بیٹی کو بتایا کہ ان سے انتہائی ضروری بات کرنی ہے۔ اپنے باپ کی یہ بات سن کر زیب تھوڑی پریشان ہو گئیں۔ وہ اپنے باپ کی طرف جھکیں تاکہ وہ سن سکیں کہ وہ ایسی کون سی خاص بات ان سے کرنا چاہتے تھے۔

جنرل حبیب نے اپنی بیٹی کے کانوں میں سرگوشی کی اور بولے کہ زیب دیکھو تمہارا بھائی جنرل علی آج اپنی محنت اور قابلیت کی بنیاد پر اتنے بڑے عہدے پر پہنچا ہے۔ تمہارے شوہر گوہر ایوب خان کی سیاست اس کے آرمی چیف بننے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننی چاہیے۔ تم لوگوں کی وجہ سے علی قلی کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہونا چاہیے۔

ایک بیٹی نے اپنے باپ کو حیران بھری نظروں سے دیکھا اور بولی کہ بابا! آپ یہ کیسے سوچ سکتے ہیں کہ ایک سگی بہن اپنے میاں کی سیاست کی وجہ سے اپنے بھائی کو مسائل میں گھرے دیکھ سکتی ہے۔

زیب نے اپنے باپ کو تسلی دی کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا۔

جنرل قلی اب اپنے باپ کی یادوں میں کھو چکے تھے۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد جنرل حبیب کی زندگی اتنی آسان نہیں رہی تھی۔ وہ نوجوان تھے۔ انھوں نے کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا۔ جونہی ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت آئی تو جنرل حبیب پر کرپشن کے الزامات لگا کر انہیں جیل بھیج دیا گیا۔

اصل وجہ کچھ اور تھی۔

دراصل جنرل حبیب اور جنرل یحییٰ خان ایک دوسرے کے بڑے قریب تھے۔ جنرل یحییٰ نے کسی دور میں جنرل حبیب کے ساتھ کام کیا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یحییٰ چاہتے تھے کہ جنرل حبیب [illegible] کو چلائیں۔ شروع میں جب حبیب صاحب نے مزاحمت کی تو ان کا خیال تھا کہ ان کے پاس کسی

انتظامی ادارے کو چلانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ تاہم جنرل پیچھے نہیں ہٹے۔ وہ چاہتے تھے کہ جنرل حبیب اس ادارے کے مالی معاملات کو سنبھالیں۔ مشہور صحافی اور کالم نگار زیڈ اے سلہری کو این پی ٹی کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ انہی دنوں پاکستان ٹائمز میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ایک خبر چھپی۔ اس خبر کا جنرل حبیب سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ وہ اخبار کے ایڈیٹر تو نہیں تھے۔ تاہم ذوالفقار علی بھٹو اس خبر سے بڑے ناراض ہوئے اور انہوں نے یہ بات دل میں رکھ لی۔ ان دنوں پاکستان میں نئے الیکشن ہونے والے تھے۔ ایک دن ذوالفقار علی بھٹو [illegible] اور مصطفیٰ کھر کے ساتھ جنرل حبیب سے ملنے آئے اور ان سے اپنی پارٹی کے لیے چندہ مانگا کیونکہ جنرل حبیب اپنا ذاتی کاروبار کرتے تھے۔

جنرل علی قلی کے لبوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے مجھے کہا کہ دراصل ان کے والد کا مزاج ایک فوجی کا تھا کہ ایک دفعہ جس کو [illegible] انہوں نے بھٹو صاحب کو ان کی پارٹی کے لیے چندہ دینے سے انکار کر دیا۔ بات اگر یہیں تک رہتی تو بھی معاملہ ٹھیک تھا۔ جنرل حبیب نے بھٹو صاحب کو یہاں تک کہہ دیا کہ کیونکہ وہ ذاتی طور پر مسلم لیگ کے ساتھ ہیں لہٰذا وہ اس پارٹی کو انتخابات جیتنے کے لیے اپنی جیب سے چندہ دے چکے ہیں۔

جنرل علی قلی کے بقول ان کے والد صاحب کو بھٹو صاحب کے مزاج کا اندازہ نہیں تھا۔ بھٹو صاحب نے ان کے باپ کی اس بات کو اپنے دل میں محفوظ کر لیا اور جونہی وہ اقتدار میں آئے جنرل حبیب کو گرفتار کر کے جیل پہنچا دیا گیا۔ جونہی جنرل حبیب کی گرفتاری کی خبر پھیلی تو سب لوگوں نے بھٹو صاحب کے اس فیصلے کی مذمت کی اور صرف چند دنوں بعد جنرل حبیب کو رہا کر دیا گیا۔

اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ بھٹو صاحب نے جنرل حبیب کی تمام جائیداد ان سے چھین لی تھی۔ اگرچہ جنرل حبیب نے بھٹو صاحب کے ہاتھوں بہت نقصان اٹھایا اور تکلیفیں دیکھیں لیکن انہوں نے کبھی بھٹو صاحب کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

اپنی گرفتاری اور رہائی کے بعد جنرل حبیب واپس [illegible] چلے گئے۔ [illegible] بھٹو صاحب کو جنرل حبیب کی [illegible] جنرل [illegible] بھٹو صاحب [illegible] جب کہ

انہوں نے ان کے بھائی جنرل حبیب کو جیل میں ڈالا تھا۔
جنرل مجید ہو کر بھٹو صاحب نے لندن جنرل حبیب کو ایک پیغام بھیجا۔ بہت ساری کوششوں کے بعد بھٹو صاحب اور جنرل حبیب میں اختلافات ختم کرائے گئے۔

میں نے جنرل علی قلی سے پوچھا کہ جب ان کے والد جنرل حبیب کو بھٹو کی پھانسی کی خبر ملی تو ان کا اس پر کیا ردعمل تھا؟

جنرل علی نے کہا کہ اب تو اس بات پر سب لوگ متفق ہیں کہ بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کا فیصلہ بہت غلط تھا۔ جنرل ضیاء کو انہیں پھانسی نہیں دینی چاہیے تھی۔ جنرل قلی کے خیال میں یہ بھی ایک تکلیف دہ حقیقت تھی کہ جنرل ضیاء اور بھٹو صاحب کے درمیان معاملات اتنی دور تک چلے گئے تھے جہاں ان میں سے صرف ایک ہی زندہ رہ سکتا تھا۔ تاہم، جنرل قلی کے خیال میں جنرل ضیاء نے بھٹو کو پھانسی دے کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔

میں نے جنرل علی قلی کو اپنے باپ کے ساتھ جڑی ماضی کی یادوں سے نکالنے کی خاطر ٹاپک چینج کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ وہ پاکستان آرمی میں کیسے آئے تھے؟

جنرل علی قلی نے کہا کہ اس میں کوئی اتنی بڑی نئی بات نہیں تھی کیونکہ وہ ایک فوجی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور وہ شروع سے ہی فوج میں جانے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے 20 پی ایم اے میں کمیشن لیا اور اپنی اچھی پرفارمنس کی وجہ سے انہیں لندن کے Sand Hurst School بھیجا گیا۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ وہاں بھی جنرل علی قلی نے اعلیٰ قابلیت کا مظاہرہ کیا اور انہیں بہترین غیر ملکی کیڈٹ کا ایوارڈ دیا گیا۔ بہت کم لوگوں کو پتہ ہوگا کہ جنرل مشرف اور علی قلی کلاس میٹ تھے۔ علی قلی خان نے اپنے کورس میں ٹاپ کیا جبکہ جنرل مشرف کی گیارہویں پوزیشن تھی۔ ان کے ایک اور کلاس میٹ شمیم شریف تھے۔ وہ بھی ایک شاندار آرمی آفیسر تھے جو بعد میں قطر میں شہید ہو گئے۔ تیسرے اہم کلاس میٹ کرنل افضل تھے جو اس وقت (2003) پاکستان اسٹیل ملز کے چیئرمین تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل خالد لطیف مغل، جنرل زیدی اور سابق ڈی جی آئی ایس آئی جنرل ندیم بھی ان کے کورس میٹ تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جب 1998ء میں ایک نئے آرمی چیف کی تقرری کا سوال اٹھا تو اس وقت کی سنیارٹی لسٹ پر وہ سرفہرست تھے۔ ان کے بعد جنرل خالد نواز، جنرل پرویز مشرف اور جنرل نسیم رانا

تھے۔ جنرل ضیاء الدین بٹ ان سے جونیئر تھے اور فہرست میں پانچویں نمبر پر تھے۔

جنرل قلی مجھے بتانے لگے کہ فوج میں میجر، کرنل، بریگیڈیئر اور میجر جنرل کی ترقی ایک سلیکشن بورڈ کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی جب جنرل جہانگیر کرامت نے جو اس وقت آرمی چیف تھے، چیف آف جنرل سٹاف کی تقرری کرنی تھی تو جنرل علی قلی کو یہ عہدہ دیا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک ان کے کورس میٹ جنرل زیدی پہلے ہی ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ اب اس پوسٹ کے لیے مقابلہ جنرل علی قلی، جنرل خالد نواز اور جنرل پرویز مشرف کے درمیان تھا جو تینوں کورس میٹ تھے۔ جنرل جہانگیر کرامت نے علی قلی کی پروفیشنل قابلیت اور اہلیت کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں جنرل پرویز مشرف اور جنرل خالد نواز پر فوقیت دی۔ جنرل نسیم رانا کی ترقی ان سے کچھ دن بعد ہوئی تھی لہٰذا وہ اس دوڑ سے نکل چکے تھے۔ چند دنوں بعد اس وقت کے چیف آف جنرل سٹاف جنرل افتخار علی خان (چوہدری نثار علی خان کے بڑے بھائی) ریٹائرڈ ہونے والے تھے۔ جنرل قلی اس وقت راولپنڈی کے کور کمانڈر تھے۔ اپنی پروموشن پر جنرل جہانگیر کرامت کا شکریہ ادا کرنے وہ ان سے ملنے گئے تو جنرل کرامت نے انہیں کہا کہ انہیں چیف آف جنرل سٹاف بنا کر انہوں نے کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ایک حقدار کو صرف اس کا حق دیا تھا۔

جنرل جہانگیر کرامت سے ملنے کے بعد علی قلی خان اپنے قریبی دوست جنرل افتخار علی خان جن کی جگہ اب ان کی تعیناتی ہوئی تھی سے ملنے کے لیے گئے تاکہ وہ ان کا بھی شکریہ ادا کریں۔ وہ جنرل افتخار کا رویہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جنرل قلی جنرل افتخار کو اپنا ذاتی دوست سمجھتے تھے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا دوست ان کی ترقی پر خوش نہیں ہوگا۔ جنرل افتخار کا یہ رویہ دیکھ کر جنرل علی قلی کو بڑا صدمہ ہوا۔ جنرل قلی کو اس وقت یہ احساس ہو گیا کہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے کیونکہ اگر جنرل افتخار جیسا پرانا دوست بھی ان کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش نہیں آ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ معاملات درست نہیں ہیں۔ جنرل علی قلی اور جنرل افتخار کی دوستی دو نسلوں سے چلی آ رہی تھی کیونکہ ان دونوں کے والد انڈین آرمی کے دنوں سے ایک دوسرے کے دوست تھے۔

جب جنرل علی قلی جنرل افتخار کے دفتر میں داخل ہوئے تو جنرل افتخار نے کہا کہ ہاں مجھے تمہاری چیف آف جنرل سٹاف کے عہدے پر تعیناتی کی خبر پہلے ہی مل چکی ہے۔ جنرل افتخار نے انتہائی بے مروتی سے کہا کہ میں نے تین سال بعد یہ کرسی چھوڑنی ہے۔ تم صرف اس وقت ہی آ کر میری اس کرسی پر بیٹھ سکتے ہو۔

جنرل علی قلی کو ایک شدید دھچکا لگا کیونکہ وہ تو اپنے اس دوست کے پاس Courtesy call کرنے گئے تھے۔ انہیں بھی پتہ تھا کہ انہوں نے چیف آف جنرل سٹاف کی کرسی پر تین سال بعد بیٹھنا ہے۔

جنرل علی قلی خان کو جنرل افتخار علی خان کے اس سرد رویے کا معمہ فوراً سمجھ میں آ گیا جب انہوں نے جنرل افتخار کے دفتر کی کھڑکی سے باہر جنرل پرویز مشرف کو چلتے پھرتے دیکھا۔ جنرل علی قلی بڑے حیران ہوئے کہ جنرل مشرف جو اس وقت منگلا کے کور کمانڈر تھے وہ وہاں کیا کر رہے تھے؟

جنرل علی قلی نے اپنی حیرانی پر قابو پایا اور جنرل افتخار سے کہا کہ آپ جنرل پرویز مشرف کو اندر بلا لیں اور تینوں بیٹھ کر گپ شپ کریں۔

جب جنرل پرویز مشرف کمرے میں داخل ہوئے تو جنرل قلی بڑے گرم جوش انداز سے آگے بڑھ کر جنرل پرویز مشرف سے ملنے لگے تو انہوں نے محسوس کیا کہ جنرل مشرف کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ جنرل مشرف یہ توقع کر رہے تھے کہ انہیں چیف آف جنرل سٹاف بنایا جائے گا۔

جب جنرل جہانگیر کرامت کو غیر معمولی طور پر یہ پتہ چلا کہ جنرل پرویز مشرف چیف آف جنرل سٹاف جنرل افتخار کے پاس اس دن دفتر میں موجود تھے تو انہوں نے جنرل افتخار کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ جنرل صاحب! مجھے یہ بتائیں کہ مشرف آپ کے دفتر میں کیا کر رہے تھے؟ آپ نے انہیں بلایا تھا یا پھر وہ چھٹی لے کر آپ سے ملنے آئے تھے۔ جہانگیر کرامت نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جنرل افتخار سے پوچھا کہ آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے کور کمانڈر منگلا جنرل مشرف کو اپنے دفتر میں کیوں بلایا تھا؟

جنرل افتخار نے جہانگیر کرامت کو بتایا کہ دراصل جنرل مشرف چیف آف جنرل سٹاف نہ بننے پر خاصے ڈسٹرب تھے۔

یہ بات اتنی آسان نہیں تھی جتنی جنرل قلی سمجھ رہے تھے۔

کھچڑی پکنا شروع ہو چکی تھی۔

کچھ دنوں بعد جنرل جہانگیر کرامت کو پتہ چلا کہ جنرل محمود نے جنرل پرویز مشرف سے [illegible] شریک ہونے کی اجازت مانگی ہے۔ جنرل کرامت نے جنرل محمود کو بلایا اور ان کی سخت سرزنش کی [illegible] جنرل مشرف [illegible] ہے۔ ایک دفعہ جنرل محمود کو جنرل جہانگیر کرامت نے [illegible] کہ تم آپ [illegible] افسران کے معاملات میں مداخلت نہ کرو۔

جنرل جہانگیر کرامت کی دانست میں جنرل محمود صاف [illegible] ہوئے کہ دراصل وہ اور جنرل مشرف ایک ہی رجمنٹ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان دنوں مشرف چیف آف جنرل سٹاف بنے بیٹھے ہیں [illegible] بعد وہ محض ان کی دلجوئی کرنا چاہ رہے تھے۔

تاہم جہانگیر کرامت نے بڑے واضح لفظوں میں جنرل محمود کو بتایا کہ آج کے بعد تم اس طرح کے کسی کام میں ملوث نہیں ہو گے کیونکہ اس سے ملٹری کے کمانڈ سسٹم میں شدید مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس واقعے کے ایک ہفتے بعد جنرل جہانگیر کرامت نے مین کور کا دورہ کرنا تھا جہاں انہیں ایک بریفنگ دی جانی تھی۔ جب جنرل جہانگیر کرامت آئے تو بریفنگ روم میں جانے کے بجائے انہوں نے جنرل قلی سے کہا کہ وہ انہیں اپنے دفتر لے کر چلیں۔ وہ ابھی دفتر میں بیٹھے ہی تھے کہ اس وقت کے جنرل رانا نسیم جو ڈی جی آئی ایس آئی تھے، وہ اپنی بغل میں ایک فائل لیے آئے اور جنرل جہانگیر کرامت سے کہا کہ یہ فائل کلیئر ہو گئی ہے۔

علی قلی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد انہیں پتہ چلا کہ دراصل اس وقت کے وزیراعظم نواز شریف نے جنرل علی قلی کے چیف آف جنرل سٹاف کی تقرری کے احکامات روک لیے تھے۔ جب جنرل جہانگیر کرامت کو اس بات کا پتہ چلا کہ ان کے احکامات پر عمل نہیں ہو رہا ہے تو انہوں نے ڈی جی آئی ایس آئی رانا نسیم کو نواز شریف کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا تھا کہ وہ فوری طور پر اس فائل کو کلیئر کریں۔ ان دنوں نواز شریف کے پاس وزارت دفاع کا عہدہ بھی تھا۔

بعد میں بات کچھ یوں کھلی کہ جنرل افتخار چیف آف جنرل سٹاف کے طور پر اپنی مدت ملازمت میں توسیع چاہتے تھے۔ ان کی مدت ملازمت میں توسیع کرنے کا کیس جنرل جہانگیر کرامت کو بھی بھیجا گیا تھا۔ ایک عام فوجی کے برعکس جہانگیر کرامت ایک سافٹ مین تھے۔ جنرل کرامت نے نواز شریف

کو بتایا تھا کہ اگر انہوں نے جنرل افتخار کو ان کی ملازمت میں توسیع دی تو پھر ان کے بعد [illegible] کے ساتھ زیادتی ہو گی جو ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی پروموشن کا انتظار کر رہے تھے۔ نواز شریف کو بتایا گیا کہ اگر جنرل افتخار کی توسیع کا احترام کیا گیا تو کم از کم پانچ سینئر [illegible] آرمی چھوڑنی پڑے گی۔ جنرل قلی اور جنرل پرویز مشرف [illegible] گھر جانا پڑ جائے گا۔ یوں جنرل جہانگیر کرامت نے جنرل افتخار کو ملازمت میں توسیع دینے سے انکار کر دیا۔ جب چوہدری نثار علی خان اور جنرل افتخار علی خان کو اس بات کا علم ہوا تو ان دونوں نے اپنے دل میں یہ بات بٹھا لی کہ دراصل یہ جنرل قلی ہی تھے جنہوں نے جہانگیر کرامت پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے انہیں مدت ملازمت میں توسیع نہیں لینے دی۔

جنرل قلی مجھے بتانے لگے کہ اگرچہ ان کی پروموشن سے جنرل افتخار، چوہدری نثار اور جنرل مشرف کو تکلیف ہوئی تھی لیکن انہیں میرٹ کی بنیاد پر یہ ترقی دی گئی تھی کیونکہ وہ سینیارٹی لسٹ پر نمبر ون تھے۔

میں نے جنرل قلی سے پوچھا کہ آخر نواز شریف اور جہانگیر کرامت کے درمیان وہ کون سے اختلافات تھے جن کی وجہ سے آخر چیف آف آرمی سٹاف کو استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑا تھا۔

جنرل قلی نے آخر اس راز سے پردہ اٹھانا شروع کیا۔

نواز شریف اور جنرل جہانگیر کرامت کے درمیان معاملات اس وقت بگڑ گئے جب چیف آف آرمی سٹاف نے نیول ڈیفنس کالج لاہور میں اپنے خطاب میں نیشنل سیکورٹی کونسل بنانے کی تجویز پیش کی۔ جنرل قلی اس وقت چیف آف جنرل سٹاف تھے۔ آئی ایس پی آر براہ راست ان کے ماتحت تھا۔ ڈائریکٹر جنرل آئی ایس پی آر سلیم اللہ نے جنرل قلی کو چیف کی تقریر کے متن کے بارے میں بتایا۔ تاہم علی قلی اس وقت اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ اس متنازعہ تقریر پر کوئی بات کرتے کیونکہ اس وقت وہ وہاں موقع پر موجود نہیں تھے۔

اگلے دن جنرل جہانگیر کرامت علی قلی کو اعتماد میں لیے بغیر نواز شریف سے ملنے چلے گئے۔ اخبارات میں پہلے ہی وزیراعظم اور چیف آف آرمی سٹاف کے درمیان اس تقریر کے بعد بڑھتے ہوئے اختلافات کی خبریں چھپ چکی تھیں۔ نواز شریف سے ملنے کے بعد جب جنرل جہانگیر کرامت جی ایچ کیو واپس آئے تو جنرل علی قلی چیف آف جنرل سٹاف کی حیثیت سے ان سے ملنے کے لیے آرمی

[illegible]

جنرل قلی اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے رات کو [illegible] سن رہے تھے

جب یہ اعلان ہوا کہ جنرل جہانگیر کرامت نے استعفیٰ دے دیا ہے۔

اس واقعہ کے پانچ سال گزرنے کے بعد بھی جنرل علی قلی کو اس بات کا [illegible] کہ جنرل جہانگیر کرامت نے [illegible]

[illegible] کے جنرل پرویز مشرف کو چیف آف آرمی سٹاف لگایا گیا ہے۔

آج کا دن اور آج کی رات جنرل علی قلی کی زندگی کی سب سے زیادہ مایوس کن اور طویل رات تھی۔ ان کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا تھا جو ٹھیک 38 سال قبل ان کے والد جنرل حبیب کے ساتھ جنرل ایوب نے کیا تھا۔ تاریخ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا تھا۔ ٹھیک 38 سال بعد بیٹے کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا تھا جو باپ کے ساتھ ہوا تھا۔

اس کے بعد جنرل جہانگیر کرامت جنرل قلی اور جنرل خالد نواز سے ملے۔ وہ دونوں جنرل [illegible] تھے۔ جنرل جہانگیر کرامت کے منہ سے صرف اتنا نکلا:

"Gentlemen, I am sorry."

[illegible]

"As it was never like that as I told you earlier."

[illegible]

"Sorry JK. Do not even think of it. If you did resign, which of people will be that you will never live it down."

[illegible]

بنا دیا تھا۔

جنرل قلی نے ایک اور نئی کہانی سنائی۔

جنرل جہانگیر کرامت کے استعفیٰ دینے سے کچھ عرصہ پہلے ہی یہ باتیں شروع ہو گئی تھیں کہ ان کے بعد نیا آرمی چیف کون ہو گا۔ ایک دن جنرل علی قلی کی حیرانی کی حد نہ رہی جب نواز شریف کے ایک بڑے قریبی معتمد خاص نے ان سے رابطہ کیا اور یہ پیغام دیا کہ وہ ان کی نواز شریف سے ایک خفیہ ملاقات کرانا چاہتے ہیں تا کہ کل کو وہ آرمی چیف کی تقرری کے وقت زیر غور لائے جا سکیں۔ علی قلی کو یہ بتایا گیا کہ اگر وہ نواز شریف سے خفیہ ملاقات کے لیے راضی ہو جائیں تو پھر انہیں ایک عام سی کار میں بٹھا کر سادہ کپڑوں میں پرائم منسٹر ہاؤس لے جایا جائے گا۔ علی قلی کو تسلی دینے کے لیے یہ بھی بتایا گیا کہ ان سے پہلے جنرل آصف نواز کی بھی اسی طرح خفیہ ملاقات کرائی گئی تھی اور انہیں بھی سادہ کپڑے پہنا کر ایک عام سی گاڑی میں وہاں لے جایا گیا تھا۔ نواز شریف کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد جنرل آصف نواز کو آرمی چیف بنانے کی کمٹمنٹ دے دی گئی تھی۔ جنرل علی قلی کو بتایا گیا کہ یہ بات ان کے اپنے فائدے میں ہے اور انہیں جہانگیر کرامت کے بعد آرمی چیف بنایا جا سکتا ہے۔

اس پیغام کے کچھ دن بعد ایک اور بڑے سرکاری افسر جو نواز شریف کے قریب تھے، نے ایک دفعہ پھر علی قلی سے رابطہ کیا اور نواز شریف سے ملانے کی پیشکش کی۔ اس بڑے سرکاری افسر نے جنرل علی قلی کو بتایا کہ وہ ذاتی طور پر انہیں چیف آف آرمی سٹاف بنوانے میں ان کی مدد کریں گے۔ وہ پہلے ان کی نواز شریف سے خفیہ ملاقات کرائیں گے اور پھر انہیں آرمی چیف بنانے کا کیس تیار کر کے پیش کریں گے۔

لیکن نواز شریف کیمپ کی توقعات کے برعکس جنرل قلی نے سادہ کپڑے پہن کر نواز شریف سے خفیہ ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ جنرل قلی نے انہیں بتایا کہ وہ آرمی چیف بننے کے لیے اس طرح کی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ انہوں نے پیغام رساں کو کہا کہ خدا نے انہیں بہت عزت دی ہے اور اگر ان کی قسمت میں آرمی چیف بننا ہوا تو انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ اگر خدا انہیں آرمی چیف نہیں بنانا چاہتا تو پھر نواز شریف سے خفیہ ملاقاتیں کر کے بھی وہ آرمی چیف نہیں بنائے جا سکتے۔

میں نے جنرل قلی سے کہا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ نواز شریف نے جنرل مشرف کو آرمی چیف بنانے سے پہلے ان سے بھی خفیہ ملاقاتیں کی ہوں گی۔ جنرل قلی نے میرے اس سوال کا یہ کہہ کر جواب دیا کہ وہ اس طرح کی خفیہ ملاقاتوں پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔

میں نے کہا لیکن جنرل صاحب! شیخ رشید نے تو اپنے انٹرویو میں مجھے بتایا تھا کہ جنرل قلی کو آرمی چیف نہ بنانے کی وجہ ان کے برادر ان لا گوہر ایوب تھے جو اس وقت نواز شریف کی حکومت میں وزیر خارجہ تھے۔ جنرل قلی نے اس بات سے اتفاق کیا۔ قلی نے مجھے کہا کہ وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ گوہر ایوب خان انہیں آرمی چیف بنانے کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ گوہر ایوب خان نے کبھی بھی انہیں آرمی چیف بنانے کے لیے نہ تو لابی کی تھی اور نہ ہی انہوں نے کسی سے اس پر بات چیت کی تھی۔ قلی کے بقول نواز شریف گوہر ایوب خان پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔ جنرل قلی نے بھی کبھی گوہر ایوب خان سے یہ بات نہیں کی تھی کہ وہ انہیں آرمی چیف بنوائیں۔ قلی کے بقول اگرچہ وہ اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کے لیے ساری باتیں کر سکتے ہیں لیکن وہ خاموش رہیں گے کیونکہ ان کی بہن گوہر ایوب کی بیوی ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا ہو۔

قلی نے کہا کہ مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ گوہر ایوب خان شاید میرے لیے لابنگ کر رہے تھے۔ وہ یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان کے والد جنرل حبیب خان کو آرمی چیف نہ بنانے والے جنرل ایوب خان اسی گوہر ایوب کے ہی والد تھے۔ قلی نے کہا میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔

جنرل قلی نے اس بات کو دہرایا کہ دراصل نواز شریف کو آرمی ہاؤس میں ان کی جہانگیر کرامت کے ساتھ ہونے والی میٹنگ کے بارے میں جان بوجھ کر غلط خبریں دی گئی تھیں۔ علی قلی نے اس بات کو مسترد کیا کہ جب جنرل وحید کاکڑ نے نواز شریف اور غلام اسحاق خان سے ملاقات کی تھی جس کے بعد انہوں نے استعفے دے دیے تھے تو شاید وہ اس میٹنگ میں موجود تھے۔ قلی نے کہا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت وہ ڈی جی ایم آئی تھے اور انہوں نے نواز شریف کو دھمکی دے کر استعفیٰ دینے پر مجبور کیا تھا۔ جنرل قلی کے بقول یہ بات غلط تھی۔ وہ نہ تو اس میٹنگ میں شریک ہوئے تھے اور نہ ہی انہوں نے نواز شریف کو کوئی دھمکی دی تھی۔ جنرل کاکڑ کے ساتھ اس وقت جنرل جاوید اشرف گئے تھے۔ جنرل قلی نے کہا کہ نواز شریف کو ہر وقت ان کے قریبی لوگ پٹھانوں سے ڈراتے بھی رہتے تھے اور ایک پروپیگنڈہ جاری رہتا کہ پٹھان اچھے لوگ نہیں ہیں اور ان سے ڈیل کرنا بہت مشکل کام ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر

[illegible] سے حلف لے لیا گیا۔

جنرل علی قلی [illegible] جنرل پرویز مشرف [illegible] جنرل [illegible]

[illegible]

ان دنوں کے بعد جنرل قلی کبھی جی ایچ کیو نہیں گئے۔

کیا جنرل مشرف نے آرمی چیف بننے کے بعد ان سے کبھی رابطہ کیا؟

”نہیں“ علی قلی نے ایک مختصر سا جواب دیا۔

تاہم کچھ مشترکہ دوستوں کے فنکشن میں آتے جاتے ایک دوسرے سے حال چال پوچھ لیتے ہیں۔

"Hello PM, how are you?" جنرل پرویز مشرف ان سے یہ پوچھ لیتے ہیں۔

"Hello Ali, how are you doing?"

اس سے زیادہ دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔

تاہم جس رات جنرل پرویز مشرف کو آرمی چیف بنانے کا اعلان کیا گیا جنرل افتخار نے ان کے گھر فون کیا اور بولے

"Ali, do not do any thing (resign) now. I am trying something for you."

جنرل افتخار انہیں دراصل [illegible] جوائنٹ چیفس آف سٹاف [illegible] بنوانا چاہتے تھے۔

قلی نے مجھے بتایا کہ انہوں نے جنرل افتخار سے کہا

"Leave it General. If the man (Nawaz Sharif) could not see me as Army Chief then how could he see me as Chairman Joint chiefs of Staff committee."

تھوڑی دیر بعد جنرل افتخار نے علی قلی کو دوبارہ فون کیا [illegible]

[illegible] کے لیے تیار نہیں تھے۔

نواز شریف انہیں [illegible]

جب جنرل علی قلی [illegible]

علی قلی نے مجھے نواز شریف کے [illegible]

[illegible]

قلی نے کہا کہ دراصل چوہدری نثار علی خان اور جنرل افتخار علی خان نے نواز شریف کو انہیں آرمی چیف نہیں بنانے دیا تھا۔

جنرل قلی چوہدری نثار اور افتخار سے خاصے ناراض تھے۔ قلی نے بتایا کہ وہ ان دونوں بھائیوں سے اس طرح کے سلوک کی توقع نہیں رکھتے تھے کیونکہ ان دونوں کے خاندانی تعلقات دو نسلوں سے چلے آ رہے تھے۔ اس سے پہلے ان دونوں کے والد انڈین آرمی کے دنوں سے ایک دوسرے کے دوست تھے۔

میں نے جنرل قلی سے کہا کہ یہ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ آپ نے ریٹائرمنٹ کے بعد کوئی ملٹری سویلین عہدہ نہیں لیا جیسے آجکل دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر دوسرا فوجی بھی کچھ کرتا ہے۔ قلی نے کہا کہ انہوں نے اس طرح کے عہدوں کے لیے کبھی بھیک نہیں مانگی۔ دوسرے کراچی میں ان کا اپنا بزنس تھا جس کی دیکھ بھال انہوں نے کرنی تھی۔

میں نے علی قلی سے پوچھا کہ ان کے خیال میں جنرل مشرف اور نواز شریف کے درمیان کونسی ایسی بات ہوئی تھی جس سے ان میں ٹکراؤ ہوا تھا۔ قلی نے بتایا کہ دراصل کارگل آپریشن کے بعد معاملات سویلین اور فوجی قیادت کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے۔ پوری دنیا کو وزیر اعظم اور آرمی چیف کے درمیان انتہائی خوفناک اختلافات کا پتہ چل گیا تھا۔ پھر قلی نے کہا کہ وہ اس وقت فوج میں نہیں تھے لہٰذا وہ ان ساری باتوں پر تبصرہ نہیں کر سکتے۔

قلی نے ایک بات ضرور کہی کہ جس طرح پہلے سے جنرل مشرف کو برطرف کیا گیا تھا وہ غلط طریقہ کار تھا۔ سیاسی قیادت سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ جب آرمی چیف ملک سے باہر ہو تو اس وقت اسے

برطرف کیا جائے۔

قلی نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ ان کے پاس اس طرح کی رپورٹس بھی تھیں کہ جب جنرل مشرف آرمی چیف ہے اور انہوں نے مختلف کور کمانڈروں سے کہا کہ بہت سارے فوجی افسران نے انہیں یہ کہا تھا کہ وہ نواز شریف کو اپنے ساتھ وہ سب کچھ کرنے کی اجازت نہ دیں جو انہوں نے جنرل جہانگیر کرامت کے ساتھ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب 12 اکتوبر کو جنرل مشرف کو واپس کیا گیا تو ان کے ذہن میں پہلے ہی فوجی افسروں کا یہ مطالبہ ضرور ہوگا۔

میں نے جنرل قلی سے پوچھا کہ آخر فوج سیاست میں کیوں مداخلت کرتی آئی تھی تو وہ بولے کہ ان کی اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ فوج کو سیاست میں نہیں پڑنا چاہیے چاہے اس کے پیچھے کتنی بڑی وجہ ہی کیوں نہ ہو۔ تاہم قلی نے کہا کہ جب بھی فوج نے کسی بھی سویلین حکومت کو گرایا تو اس وقت کی سیاسی لیڈر شپ نے باقاعدہ طور پر انہیں اس کے جواز پیش کیے۔ جو مسائل سیاسی انداز میں حل ہو سکتے تھے وہ سیاسی لوگ فوجی لیڈروں کے سامنے لے کر آتے تھے اور یہ بہت غلط اپروچ تھی۔ جنرل قلی کا خیال تھا کہ سیاستدان اپنے مقاصد کے لیے فوج کو استعمال کرتے تھے جس سے فوجیوں کو بھی یہ بہانہ ملتا تھا کہ وہ سیاسی معاملات میں دخل اندازی کریں۔ قلی نے انکشاف کیا کہ جب وہ ڈی جی ایم آئی تھے تو بہت سارے سیاستدان ان سے ملنے جی ایچ کیو آتے اور وہ چاہتے تھے کہ فوج اس وقت کی حکومت کو گرانے میں رول ادا کرے۔ تاہم قلی کے بقول سویلین حکومتوں کو گرانے کے لیے یہ وجوہات مناسب نہیں تھیں۔ قلی کا خیال تھا کہ اگر فوجی قیادت کے پاس کسی سیاسی حکومت کو ہٹانے کی کوئی ایسی ضروری وجہ ہو تو کیوں نہ وہ پھر بھی فوری طور پر ملک میں نئے الیکشن کر کے اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیا جائے کیونکہ ملک پر حکمرانی کرنا فوج کا کام نہیں ہے۔ جنرل وحید نے بالکل یہی کام 1993ء میں کیا تھا جب انہوں نے نئے انتخابات کرا کے اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیا۔ یوں ملک میں جمہوریت واپس لوٹی۔ قلی نے کہا کہ پاکستان میں فوجی مداخلتوں سے نہیں بلکہ جمہوریت کے مسلسل چلتے رہنے سے ہی جمہوریت آئے گی۔ جمہوریت ایک مسلسل نظام ہے اور اسے چلتے رہنا چاہیے۔ آرمی کو سویلین حکمرانوں اور پارلیمنٹ کے نیچے ہونا چاہیے کیونکہ اس وقت دنیا میں جمہوریت ہی ایک ایسا نظام ہے جس کے ذریعے کسی بھی ملک کو چلایا جا سکتا ہے۔

شاہد حامد

یہ چودہ اگست 2003ء کا دن تھا۔ اس دن میری سالگرہ تھی۔ میں نے گھر پر رہ کر سالگرہ منانے کی بجائے نتھیا گلی جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ دن قبل اسلام آباد میں واقع فرانس کے سفارت خانے میں میری پنجاب کے سابق گورنر اور فاروق لغاری کے انتہائی قریبی دوست اور ان کے ایڈووکیٹ شاہد حامد سے ایک کھانے پر ملاقات ہوئی تھی۔ انہی دنوں میں نے چوہدری شجاعت والے شگفتہ فیچر پر وہ کل انٹرویو کے بعد ان تمام لوگوں سے ملنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا جو میرے خیال میں اس وقت بعض اہم جگہوں پر موجود تھے جب اس ملک میں یا تو سازشیں ہو رہی تھیں یا سیاسی نظام کی بساط لپیٹی جا رہی تھی۔ میں شاید کبھی شاہد حامد کے بارے میں نہ سوچتا لیکن انہیں فرانس کے سفیر کے گھر کے سرسبز و شاداب لان میں اس شام میں اپنی خوبصورت بیوی کے ساتھ گھومتے دیکھ کر رہا نہیں گیا اور میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ مجھے اس شخص سے ملنا چاہیے کیونکہ وہ بڑے اچھے طریقے سے ان تمام واقعات سے پردہ اٹھا سکتے ہیں کہ کیسے اور کن حالات میں 5 نومبر 1996ء کو بے نظیر بھٹو کی حکومت ان کے دوست فاروق لغاری نے توڑی اور آرمی چیف جہانگیر کرامت کا اس میں کیا کردار تھا۔ یہ اسٹیبلشمنٹ نے ہوا دیا۔ ہم کھیل رہے تھے اور شریف کے ساتھ مستقبل کے معاملات طے کیے اور ان سے کہ... اور سب سے بڑھ کر فاروق لغاری نے کن حالات میں ملک کی صدارت سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ بات بھی کہ... اہم تھی کہ

شاہد حامد کیسے بچ پائے، دوست فاروق لغاری تو نیا چھوڑ کر پہلے سے نواز شریف کیمپ میں شامل ہو گئے اور لغاری نے ... کے بعد ... خدمات ... ہو گئے۔

جب میں نے شاہد حامد کو اپنا تعارف کروایا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ان کا اپنے ریڈیو کے لیے انٹرویو کرنا چاہتا ہوں تو مجھے بہت خوشگوار حیرت ہوئی کہ شاہد حامد سے زیادہ ان کی بیگم نے ... اس سے پہلے کہ شاہد حامد کوئی ... انہوں نے دوسرے دن کا وقت دے دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اگر میں ان کا انٹرویو کرنا چاہ رہا ہوں تو مجھے نتھیا گلی آنا پڑے گا جہاں وہ اس وقت کے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری کی عالیشان کوٹھی میں اپنے بچوں اور نواسے نواسیوں کے ساتھ چھٹیاں منانے گئے ہوئے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک مہذب اور اچھی گفتگو کرنے والی بیگم شاہد حامد چاہتی تھیں کہ ان کے میاں دوبارہ پاکستانی سیاست میں شامل ہوں اور ان کی باتیں پوری فیملی کو ایک نئے سرے سے سیاسی ابھار سے جوڑ سکتی ہیں۔

دوسرے دن میں نے اپنے ایک پیارے دوست ڈاکٹر ظفر الطاف سے گاڑی اور ڈرائیور مانگا اور نتھیا گلی چلا گیا۔ میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ اچھے، خوبصورت اور مسحور کر دینے والے ماحول میں کبھی کسی کا انٹرویو نہیں کیا جو خورشید قصوری کی کوٹھی کے عقب میں واقع بالکونی میں بیٹھ کر، ہلکی ہلکی بارش اور دور سے ٹکراتی سرد ہوا میں بیٹھ کر شاہد حامد کا کیا تھا۔ یہ کیا بات ہے کہ اس بالکونی میں بیٹھ کر دور تک پھیلی سرسبز و شاداب وادی جیسے گھرے بادلوں میں اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا، میں کہیں نہیں بھولا اور دنیا میں جہاں بھی گیا وہاں اس گھر میں گزرے ہوئے چند گھنٹے میری یادوں میں ہمیشہ شامل رہے ہیں۔

پانچ گھنٹے بعد جب میں اس ٹھنڈے اور خوبصورت موسم میں مری کے پہاڑوں پر ڈھلتی شام میں اسلام آباد کی طرف واپس روانہ ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ اس ملک میں رہنے والے مجھ جیسے عام لوگ اپنے حکمرانوں اور ان کی سازشوں اور خواہشوں کی قیمت کیسے ادا کرتے آئے ہیں۔ یقین جانیے اگر میں شاہد حامد سے نہ ملتا اور وہ بھی بڑی ایمانداری سے مجھے بینظیر بھٹو، فاروق لغاری، نواز شریف، [illegible] اور جنرل جہانگیر کرامت کی اندرونی باتیں نہ بتاتے تو شاید میں اس ملک کی سیاست کو

اس طرح [illegible] انداز میں نہ دیکھ پاتا جتنا کہ آج دیکھ سکتا ہوں۔

یہ بڑا عجیب سا اتفاق ہے کہ شاہد حامد کے والد میجر جنرل حامد پاکستان کے [illegible] جنرل ضیاء کے دور میں [illegible] اور وہ اپنے آپ کو [illegible] تصور کرتے تھے۔ [illegible] وقت کیسے [illegible] ہیں کہ اسی جنرل حامد کے بیٹے شاہد حامد نے 5 نومبر 1996 کی رات اسی جمہوری بینظیر کی حکومت توڑنے کے لیے اپنے دوست فاروق لغاری کو ایک صدارتی حکمنامہ تیار کر کے دیا۔ شاہد حامد کے ذریعے تیار کیے ہوئے اس صدارتی حکمنامے نے اس ملک کی تاریخ بدلنے کے لیے [illegible] اس کی بدولت آصف زرداری جیل میں گئے جہاں سے وہ 2004ء میں تقریباً آٹھ سال بعد رہا ہو کر ملک چھوڑ گئے۔ اس سے پہلے بینظیر بھٹو مارچ 1999ء میں ملک چھوڑ کر جلاوطن ہوئیں اور جب آٹھ سال بعد وہ ملک لوٹیں تو راولپنڈی کے بازار میں سرعام ماری گئیں۔ اگر اس رات بینظیر بھٹو کی حکومت نہ توڑی جاتی تو شاید یہ سب کچھ مختلف ہو سکتا تھا۔

خورشید قصوری کی درختوں میں گھری اس خوبصورت کوٹھی کے عقبی حصے کی بالکونی میں بیٹھے بارش کے قطروں کی دھیمی دھیمی سرسراہٹ میں شاہد حامد کو ابھی بھی وہ 5 نومبر کی رات سات سال بعد بڑی اچھی طرح یاد تھی جب ہر پانچ منٹ بعد فاروق لغاری ان کے کمرے میں آتے اور کہتے "شاہد جی! اب اسمبلی توڑنے کے آرڈرز جلدی تیار کرو۔"

یہ شاید اس خوبصورت ماحول کا اثر تھا جس نے مجھے چاروں اطراف سے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا یا پھر شاہد حامد جیسا ایک نفیس لیکن زیرک انسان اپنا دل کھولنے پر تلا ہوا تھا یا پھر فاروق لغاری کے اس پرانے دوست کو اس بات کا احساس تھا کہ رؤف اسلام آباد سے آج صرف اس کا انٹرویو کرنے آیا ہے لہذا اس سے کچھ نہ چھپایا جائے۔ بہر حال، جو بھی وجہ تھی شاہد حامد نے بڑی ایمانداری سے اس دور کے اہم واقعات کو بڑی تفصیل سے میرے سامنے ایک ایک کر کے بیان کرنا شروع کیا اور میں نے اپنے آپ کو اس شخص کی طرح محسوس کیا جسے وقت بڑی تیزی سے سات سال پیچھے لے گیا ہو جب کچھ طاقتور لوگ محض مزید طاقت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کر رہے تھے اور آج وہ اس عالم برزخ کا حصہ بن چکے ہیں اور ان کی جگہ جنرل مشرف صدر اور جمالی وزیر اعظم ہیں۔

جس دن فاروق لغاری اس ملک کے صدر بنے انہوں نے اسی لمحے اپنے ایچی سن کالج کے دوست شاہد حامد کو اپنا سیکرٹری مقرر کر لیا۔ فاروق لغاری نے شاہد حامد سے جو پہلی لیگل ایڈوائس لی وہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے بارے میں تھی جس میں ججوں کی سینیارٹی کا فیصلہ دیا گیا تھا۔ بینظیر بھٹو سپریم کورٹ کے اس فیصلے پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری نے ایک اہم میٹنگ بھی کی تھی جس میں یہ گفتگو ہوئی تھی کہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر کس طرح عملدرآمد کیا جائے۔ اس اہم میٹنگ میں فاروق لغاری اور بینظیر بھٹو کے علاوہ صدر کے پرنسپل سیکرٹری شمشیر علی خان، شاہد حامد، رضا ربانی، مرحوم جسٹس شمیم اور ڈپٹی اٹارنی جنرل بھی موجود تھے۔ بینظیر بھٹو نے فاروق لغاری کو صاف لفظوں میں بتا دیا کہ وہ چیف جسٹس سجاد علی شاہ کو برطرف کر دیں۔ فاروق لغاری نے بینظیر کی بات سن کر شاہد حامد کی طرف دیکھا اور ان کی رائے مانگی۔ شاہد حامد نے بتایا کہ ججوں کی سینیارٹی کا کیس حتمی طور پر نمٹایا گیا ہے اور تمام جج اس پر عملدرآمد چاہتے ہیں لہٰذا یہ کوئی سمجھداری کی بات نہیں ہوگی اگر ہم نے سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل کرنے کی بجائے چیف جسٹس کو ہٹا دیا۔

صدر لغاری نے شاہد حامد کی اس ایڈوائس سے پورا اتفاق کیا اور بینظیر بھٹو کی اس بات کو ٹھکرا دیا کہ وہ چیف جسٹس کو فارغ کر دیں۔

یہ وہ پہلا واقعہ تھا جس نے بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک ایسی خلیج حائل کر دی تھی جو آخرکار بینظیر حکومت کے ٹوٹنے اور کچھ ماہ بعد فاروق لغاری کے استعفیٰ دینے پر ختم ہوئی۔

اپنی یادوں میں کھوئے شاہد حامد نے یاد کیا کہ یہ اگست 1996ء کی بات ہے۔ وہ اپنے گھر میں چھٹیاں منانے آئے ہوئے تھے اب صدر پاکستان فاروق لغاری نے انہیں ٹیلی فون کیا اور کہا کہ وہ فوری طور پر اسلام آباد واپس آ جائیں۔ وہ جونہی اسلام آباد پہنچے تو فاروق لغاری نے شاہد حامد کو چیف جسٹس سجاد علی شاہ کا ایک خط دکھایا جس میں انہوں نے یہ شکایت کی تھی کہ پیپلز پارٹی کی حکومت نے اب تک ججوں کے سینیارٹی والے کیس پر عمل نہیں کیا تھا۔ اس خط میں چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے یہ بھی وارننگ دی تھی کہ ان کی ججمنٹ پر عمل نہ کرنے سے ایک بہت بڑا آئینی بحران پیدا ہو رہا ہے۔ اس خط کے ملنے کے بعد فاروق لغاری بڑے پریشان تھے اور انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جسٹس سجاد علی شاہ اس

خط کے ذریعے انہیں کیا پیغام بھیجنا چاہ رہے ہیں۔

شاہد حامد نے لغاری کو بتایا کہ چیف جسٹس انہیں بڑے واضح الفاظ میں یہ بات بتا رہے ہیں کہ ججز کیس پر عملی طور پر نہیں چلایا جا رہا ہے۔ چیف جسٹس نے صدر پاکستان کو ان کی آئینی ذمہ داریاں یاد دلائی ہیں جو ان کو آئین کی شق 58(2)b کے تحت حاصل ہیں۔ اس آئینی شق کے ذریعے صدر منتخب حکومت اور اسمبلی توڑ سکتا تھا۔ لغاری نے شاہد حامد سے پوچھا کہ وہ چیف جسٹس کے اس خط پر کیا ردعمل ظاہر کریں۔ شاہد حامد نے لغاری کو مشورہ دیا کہ وہ سپریم کورٹ کو ایک ریفرنس بنا کر بھیجیں جس میں ان سے یہ رائے لی جائے کہ ان حالات میں کیا صدر پاکستان کوئی بھی ایکشن لے سکتے ہیں۔

فاروق لغاری کو شاہد حامد کی یہ تجویز بہت پسند آئی اور فوری طور پر انہیں کہا گیا کہ وہ سپریم کورٹ آف پاکستان کو ایک ریفرنس بھیجنے کی تیاری کریں۔

شاہد حامد نے مجھے بتایا کہ جب بینظیر بھٹو کو فاروق لغاری کے اس فیصلے کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ سپریم کورٹ کو ریفرنس بھیجنے والے ہیں تو وہ بڑے شدید دباؤ کا شکار ہوئیں اور انہوں نے فوری طور پر ججز کیس کے فیصلے پر عمل کر دیا۔

تاہم، فاروق لغاری مطمئن نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ بینظیر بھٹو حکومت کی خراب کارکردگی سے ناخوش تھے۔ صدر لغاری کے خیال میں اگر بینظیر بھٹو کی حکومت زیادہ دیر تک چلنے دی گئی تو پاکستان معاشی دیوالیہ پن کا شکار ہو جائے گا۔

آخر ایک دن صدر لغاری نے شاہد حامد کو بلایا اور پہلی دفعہ یہ اظہار کیا کہ وہ بینظیر بھٹو حکومت کو برطرف کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ یہ بات سن کر شاہد حامد چونک گئے اور انہوں نے صدر لغاری کو بتایا کہ بینظیر حکومت کو توڑنے کے لیے محض ایک وجہ ناکافی ہے۔ سپریم کورٹ کبھی بھی صدر لغاری کے حکومت اور اسمبلیوں کو برطرف کرنے کے فیصلے کو قبول نہیں کرے گی محض اس بنیاد پر کہ صدر کا نشانہ بینظیر بھٹو ہیں۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ اگر ریاست کے ایک سے زیادہ ادارے کرپشن میں ملوث ہیں تو پھر بینظیر بھٹو حکومت کو برطرف کرنے کی بہت ساری وجوہات کورٹ کے سامنے پیش کی جا سکتی ہیں۔

شاہد حامد نے صدر لغاری کو یہ تجویز 1988ء سے لے کر 1993ء تک برطرف ہونے والی حکومتوں اور ان کے عدالتوں میں چلنے والے کیسوں اور ان کے فیصلوں کی روشنی میں دی تھی۔ 1988ء

میں حاجی سیف اللہ نے جنرل ضیاء کے جونیجو کی حکومت توڑنے کے فیصلے کو چیلنج کیا تھا۔ 1990ء میں خواجہ طارق رحیم نے غلام اسحاق خان کی بے نظیر بھٹو کی حکومت کی برطرفی کے خلاف پٹیشن دائر کی تھی جبکہ 1993ء میں نواز شریف نے غلام اسحاق خان کے اپنی حکومت توڑے جانے کے خلاف سپریم کورٹ میں پٹیشن دائر کی تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ سپریم کورٹ نے سندھ کے دو وزرائے اعظم جونیجو اور بے نظیر بھٹو کی حکومتیں بحال نہیں کیں جبکہ پنجاب سے آنے والے وزیر اعظم نواز شریف کی حکومت بحال کی گئی تھی۔ بے نظیر بھٹو [illegible] ان فیصلوں [illegible] رہی تھیں۔

بے نظیر بھٹو [illegible] شروع ہو چکا تھا۔ شاہد حامد کے بقول ایک دن صدر لغاری نے 27 ستمبر 1996ء کو انہیں اپنے پاس بلایا اور حکومت کی کرپشن سے بھری ہوئی فائلوں کا ایک انبار ان کے حوالے کیا۔ شاہد حامد کو کہا گیا کہ وہ بے نظیر بھٹو کی برطرفی کے آرڈر تیار کریں۔ دو دن رات ایک کر کے آخر شاہد حامد نے ان فائلوں میں سے [illegible] صدر لغاری کو حکومت کی برطرفی آرڈر کے ساتھ چارج شیٹ کے طور پر پڑھنا تھا۔ اس چارج شیٹ میں جو الزامات لگائے گئے تھے ان میں سے [illegible] پی آئی اے [illegible] [illegible] شامل تھے۔ شاہد حامد نے ان تمام [illegible] کے ناموں کی فہرست بھی [illegible] اس وقت کے [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] حکومت توڑنے کی [illegible] ہو سکتا تھا۔

اس پر شاہد حامد نے ایک نئی کہانی سنائی۔

دراصل صدر لغاری اس بات پر بضد تھے کہ حکومت کی برطرفی کو ہر صورت میں [illegible] سے پہلے [illegible] ہونا چاہیے۔ [illegible] صرف چار لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ 4 نومبر 1996ء کی رات بے نظیر بھٹو حکومت توڑ دی جائے گی۔

میں نے پھر پوچھ لیا کہ وہ چار لوگ کون تھے۔ تو شاہد حامد بولے کہ ایک تو خود صدر پاکستان، دوسرے ان کے پرنسپل سیکرٹری شمشیر خان، آرمی چیف جہانگیر کرامت اور چوتھے وہ (شاہد حامد) خود تھے۔

منصوبے کے مطابق بے نظیر بھٹو حکومت کی برطرفی کے آرڈر جنرل جہانگیر کرامت [illegible] جانے تھے تاکہ وہ [illegible] ہدایات جاری کر سکیں۔ تاہم جب شاہد حامد بے نظیر بھٹو کی برطرفی کے آرڈر تیار کر رہے تھے تو اسی وقت [illegible] عارف نظامی شمشیر خان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر شاہد حامد گھبرا گئے کیونکہ اس مرحلے پر کسی بھی اخبار نویس کی [illegible] گھبراتے ہوئے شاہد حامد نے [illegible] اپنے کاغذات [illegible] عارف نظامی کی ان پر [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] کے بعد شاہد حامد نے بے نظیر بھٹو کی برطرفی کا آرڈر مکمل کیا اور صدر لغاری نے اس پر دستخط کر

'Shahid Hamid unfolds palace intrigues'

میرے خیال میں فاروق لغاری چاہتے تھے کہ ان تمام صحافیوں کو کابینہ میں وزیر بنایا جائے جن کی کریڈیبلٹی تھی اور جو بینظیر بھٹو حکومت سے کرپشن کی وجہ سے نفرت کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر وہ اپنے اخبارات و جرائد میں مسلسل حکومت کی نااہلی کے خلاف مضمون لکھتے رہے تھے اور فاروق لغاری اور جنرل جہانگیر کرامت کو ایک مسیحا کے طور پر پیش کرتے رہے تھے۔ نجم سیٹھی اور ارشاد احمد حقانی تو اس بہانے میں آ گئے جبکہ عارف نظامی زیادہ پروفیشنل اور ایماندار صحافی ثابت ہوئے اور انہوں نے فاروق لغاری اور شاہد حامد کی دی ہوئی پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

تقریباً گیارہ بجے رات میں خطرناک حد تک سردی شروع ہو گئی تھی لیکن مجھے احساس تھا کہ ابھی شاہد حامد سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔ میں نے ایک نئے رخ سے سوالات کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

میرے لیے اہم بات یہ تھی کہ بینظیر بھٹو کی برطرفی سے پہلے آخر کابینہ کے ناموں کو کس نے حتمی شکل دی تھی۔

شاہد حامد نے بتایا کہ جب سے فاروق لغاری نے بینظیر بھٹو حکومت برطرف کرنے کا فیصلہ کیا تھا اس کے بعد وہ اپنے ذہن میں کابینہ کے ان وزیروں کی فہرست بنا چکے تھے جنہیں انہوں نے حلف دلوانا تھا۔ اہم عہدوں کا فیصلہ برطرفی آرڈر پر دستخط کرنے کے بعد کیا گیا۔

حکومت برطرف کرنے کے بعد فاروق لغاری نے ورلڈ بینک کے ایک ملازم شاہد جاوید برکی کو فون کیا اور انہیں ملک کا وزیر خزانہ بنانے کی پیشکش کی۔ ورلڈ بینک کے صدر جیمز ولفنسن نے بعد میں فون کر کے صدر لغاری کو پاکستان میں ایک منتخب سیاسی حکومت برطرف کرنے پر مبارکباد پیش کی۔

شاہد حامد کی اس بات سے یہ بھی ثابت ہو رہا تھا کہ میاں نواز شریف، عابدہ حسین، شہباز شریف، چوہدری نثار علی خان اور آئی ایس آئی اور جنرل جہانگیر کرامت بینظیر بھٹو حکومت برطرف کرنے کی سازش میں شامل تھے۔ یہاں بالکل اسی طرح کا کردار ادا کر رہے تھے۔ بعد میں مجھے بینظیر بھٹو اور ان کے اتحادی وزیر کی زبانی پتہ چلا کہ دراصل ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف بینظیر بھٹو کو ہٹانا چاہتے تھے کیونکہ پاکستان میں بجلی اور گیس کے نرخ بڑھائے جائیں۔ جب بینظیر بھٹو نے ان کی یہ شرائط ماننے سے انکار کر دیا تو انہیں ہٹانے میں ورلڈ بینک اور اس

کے ملازم بھی پیش پیش تھے۔

بینظیر بھٹو حکومت برطرف ہونے کے بعد بہت سارے لوگوں کی لاٹری کھل گئی تھی۔ شاہد حامد کو بھی اہم وزارتوں کی ذمہ داری سونپی گئی۔ انہیں سوچ سمجھ کر وزارت دفاع، قانون اور اسٹیبلشمنٹ کی وزارتیں دی گئیں تاکہ وہ فوج، عدلیہ اور سول بیوروکریسی کو اپنے حق میں کر سکیں۔ صدر لغاری چاہتے تھے کہ سیاسی جماعت سے ان کے دو نمائندے بھی کابینہ میں لیے جائیں۔ عابدہ حسین اور شفقت محمود کے ناموں پر بھی غور کیا گیا۔ کچھ ناموں کا فیصلہ تو بہت پہلے ہو چکا تھا۔ دو اہم صحافیوں نجم سیٹھی اور ارشاد حقانی کو بھی وزیر بنایا گیا کیونکہ انہوں نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعے بینظیر بھٹو کے خلاف صدر لغاری کے ہاتھ مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ملک معراج خالد لاہور میں واقع اپنے گھر میں سو رہے تھے جب آدھی رات کو انہیں ٹیلی فون کر کے بتایا گیا کہ انہیں ملک کا نگران وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا ہے۔

شاہد حامد نے یہ دعویٰ کیا کہ معراج خالد کو بینظیر بھٹو کی برطرفی کے منصوبے کا پیشگی علم نہیں تھا۔

تاہم مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر ایک دوسرے کے دشمن لغاری اور نواز بینظیر بھٹو حکومت کو برطرف کرنے کے لیے ایک نکتے پر کیسے راضی ہو گئے تھے۔

شاہد حامد نے گہرا سانس لیا اور مجھے بتایا کہ دراصل پہلے دن سے ہی لغاری اپنی حیثیت صدر پاکستان کے طور پر منوانا چاہ رہے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ لوگ انہیں صدر پاکستان سمجھیں نہ کہ پیپلز پارٹی حکومت کا جیالا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپوزیشن کے ساتھ بھی رابطہ کرنے کی کوئی صورت ڈھونڈ رہے تھے۔ تاہم نواز شریف زیادہ محتاط تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ اگر فاروق لغاری اور ان کے درمیان کوئی ملاقات ہو تو اس میں کوئی اہم باتیں یا ایجنڈا ڈسکس ہونا چاہیے۔ محض چائے پینے یا کھانا کھانے کے لیے وہ ملاقات نہیں کریں گے۔ اس پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ دونوں اطراف سے پہلے ایک ٹیم ملا کرے جو نواز اور لغاری کے درمیان ملاقات کے ایجنڈے کے لیے تیاری کرے۔ شاہد حامد کو صدر لغاری نے نامزد کیا کہ وہ نواز شریف کی ٹیم سے مذاکرات کریں گے جبکہ نواز شریف نے مرحوم جنرل (ر) مجید ملک، چوہدری نثار علی اور شہباز شریف کو اپنی طرف سے نامزد کیا۔ یوں ان لیڈروں کی پہلی ملاقات عابدہ حسین کے اسلام آباد میں واقع گھر میں ہوئی۔ شاہد حامد عابدہ حسین کے گھر گئے جہاں نواز شریف کے علاوہ چوہدری نثار، عابدہ اور شہباز شریف موجود تھے۔ ملاقات کے دوران شاہد حامد نے یہ

تجویز دی کہ نواز شریف کو لغاری سے ملنا چاہیے۔ تاہم سیاسی طور پر بکھرے نواز اور ان کے ساتھیوں کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے لہٰذا وہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔ بینظیر بھٹو سے 1993ء میں نواز شریف کے بجائے اسحاق خان کا ساتھ دینے پر اسے سزا دینے کا سنہری موقع ان کے ہاتھ آ رہا تھا۔ لہٰذا نواز اور ان کے ساتھیوں نے شاہد حامد سے پوچھا کہ اگر ان کی فاروق لغاری سے ملاقات ہوتی بھی ہے تو اس کے بدلے میں انہیں کیا ملے گا۔ شاہد حامد نے ان سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں تو نواز نے بتایا کہ سب سے پہلے لغاری کو پاکستان مسلم لیگ نواز کے بینظیر بھٹو حکومت کے خلاف لیے گئے سٹینڈ کی تائید کرنی چاہیے۔ اگر ان دونوں کے درمیان ملاقات بھی ہو تو اس ملاقات کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ بھی نکلنا چاہیے۔

ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ان میں سے کسی نے شاہد حامد سے یہ پوچھ لیا کہ کیا ان کے پاس واقعی فاروق لغاری کی اتنی اتھارٹی موجود ہے کہ وہ اتنے بڑے اہم فیصلے بیٹھ کر ان سے ڈسکس کر سکیں۔

اس خفیہ ملاقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ نواز شریف شاہد حامد سے چند مضبوط یقین دہانیاں لینے کے بعد صدر لغاری سے ملاقات کے لیے تیار ہو گئے۔ شاہد حامد نے صدر پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے سب سے بڑی گارنٹی یہ دی کہ اس ملک میں جب بھی الیکشن ہوں گے وہ آزادانہ اور شفاف ہوں گے۔

میں نے شاہد حامد سے پوچھ لیا کہ جب عابدہ حسین کے گھر پر یہ خفیہ ملاقاتیں ہو رہی تھیں تو کیا ان میں یہ بات بھی چھیڑی گئی تھی کہ اگر الیکشن کے بعد نواز شریف اس ملک کے وزیراعظم بنتے ہیں اور ان کی ٹرم کے دوران ہی فاروق لغاری دوبارہ صدارتی انتخاب کے لیے امیدوار بنتے ہیں تو کیا مسلم لیگ نواز انہیں سپورٹ کرے گی۔

شاہد حامد نے جواب دیا کہ جب نواز اور لغاری کے درمیان پہلی ملاقات ہوئی تو اس میں اس طرح کی کوئی بات نہیں کی گئی۔ تاہم شاہد حامد نے اس بات کا انکشاف کیا کہ جب نواز شریف کے ساتھی صدارتی نمائندوں کے ساتھ بینظیر بھٹو حکومت توڑنے کے لیے صلاح مشورے میں مصروف تھے تو انہوں نے یقیناً صدر لغاری کو دوسری دفعہ صدر بنانے کی پیشکش ضرور کی تھی۔ چوہدری نثار علی خان اور شہباز شریف دونوں نے باقاعدہ طور پر فاروق لغاری کو صدر بنانے کے حوالے سے شاہد حامد کو آفر کی تھی۔ اس کے بعد جب لغاری اور نواز شریف کی مزید ملاقاتیں ہوئیں تو نواز شریف نے براہ راست بھی

فاروق لغاری کو خود پیشکش کی تھی۔ تاہم، فاروق لغاری نے ہر دفعہ دوسری ٹرم کے لیے صدر بننے سے انکار کیا۔ لغاری کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ اس ملک کو آئینی تقاضوں کے مطابق چلایا جائے۔ شاہد حامد نے یہ بھی انکشاف کیا کہ بینظیر بھٹو حکومت کی برطرفی کے بعد عابدہ حسین خود ایک پیشکش لے کر آئی تھیں کہ پاکستان مسلم لیگ نواز نئے انتخابات میں فاروق لغاری کے امیدواروں کو 20% ٹکٹیں دینے کے لیے تیار تھی۔ تاہم لغاری نے انکار کر دیا۔

میرا اپنا یہ خیال تھا کہ نواز شریف، شہباز شریف اور چوہدری نثار علی خان صدر لغاری کے ساتھ وہی کھیل کھیل رہے تھے جو بینظیر بھٹو نے فاروق لغاری اور آفتاب شیر پاؤ کے ساتھ مل کر 1993ء میں اسحاق خان کے ساتھ کھیلا تھا۔ جب نواز شریف اور اسحاق خان میں اقتدار کے لیے کشمکش بڑھی تو دونوں نے اس وقت کی اپوزیشن لیڈر بینظیر بھٹو سے رابطہ کیا کیونکہ یہ طے تھا کہ جس کے پلڑے میں بینظیر بھٹو اپنا وزن ڈالیں گی وہ جیت جائے گا۔ بینظیر کو نواز شریف یہ آفر کر رہے تھے کہ اگر وہ ان کی حکومت ڈس مس کرانے میں حصہ دار نہ بنیں تو ان پر اور آصف زرداری پر قائم ہونے والے مقدمات جو 1990ء میں اسحاق خان کے کہنے پر قائم کیے گئے تھے انہیں ختم کر سکتے ہیں اور ایک نیا آزاد الیکشن کمیشن بھی بنایا جا سکتا ہے تاکہ جب نواز شریف کے پانچ سال پورے ہوں تو انتخابات آزاد اور شفاف ہوں۔ دوسری طرف اسحاق خان اپنے داماد انور سیف اللہ کے ذریعے یہ آفر کر رہے تھے کہ اگر وہ قومی اسمبلی کی نشستوں سے مستعفی ہو جائیں جو صدر کو اسمبلیاں توڑنے کا جواز فراہم کریں گی تو وہ نئے الیکشن کے بعد انہیں دوبارہ وزیراعظم قبول کرنے پر تیار ہوں گے۔ اس کے بدلے میں بینظیر بھٹو سے یہ یقین دہانی چاہتے تھے کہ 1993ء میں ان کی صدارتی معیاد ختم ہو رہی تھی لہٰذا انہیں پانچ سال کے لیے مزید صدر بنایا جائے گا۔ صدر اسحاق اور نواز شریف میں اختلافات اس وجہ سے بھی پیدا ہوئے تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ نواز شریف صدارتی انتخابات سے چھ ماہ پہلے ہی باقاعدہ یہ اعلان کر دیں کہ وہ ان کے صدارتی امیدوار ہوں گے۔ نواز شریف حکومت کے انٹیلی جنس بیورو کے سربراہ بریگیڈیئر امتیاز احمد نے بھی یہ بات مجھے خود بتائی تھی کہ نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان اصل اختلافات اسی بات سے شروع ہوئے تھے کہ وزیراعظم اسحاق خان کو پانچ سالوں کے لیے مزید صدر بنانے کی گارنٹی دینے کو تیار نہیں تھے۔ یوں غلام اسحاق خان نے نواز شریف کو سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کام کے لیے وہ بینظیر

جھونکی دے چکے تھے۔ بینظیر بھٹو کے لیے یہ بڑا مشکل وقت تھا کہ وہ کس کا ساتھ دیں۔ ایک طرف اگر وہ صدر اسحاق کا ساتھ دیتیں تو نہ صرف نواز شریف کو 1990ء میں اسی صدر اسحاق، اسلم بیگ اور جنرل حمید گل کے ساتھ مل کر ان کی 6 اگست کو حکومت برطرف کرانے پر نہ صرف اب ان کی حکومت واپس کرا کے سزا دی جا سکتی تھی بلکہ نئے انتخابات کی وجہ سے وہ فوری طور پر ملک کی وزیراعظم بھی بن سکتی تھیں اور آصف زرداری بھی فوری طور پر رہا ہو سکتے تھے جبکہ نواز شریف کا ساتھ دینے میں بینظیر کو دو سال مزید انتخابات کا انتظار کرنا پڑتا۔ یوں غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ صدر اسحاق کا ساتھ دے کر ایک تیر سے کئی شکار کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم، کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ صدر اسحاق خان کا ساتھ دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ پیپلز پارٹی نے اصولوں پر سمجھوتا کر کے ایک ایسے شخص کا ساتھ دیا جس نے بینظیر بھٹو اور آصف زرداری کو کرپشن چارجز پر برطرف کر کے جیل میں ڈال دیا تھا۔ کسی سیانے نے مشورہ دیا کہ اتنی معمولی سی بات کو اتنے بڑے کاز کے سامنے رکاوٹ نہ بننے دیں اور یوں یہ طے پایا کہ اسی کرپٹ شخص کو صدر اسحاق اپنی کابینہ کا ممبر بنا کر اور اس سے حلف لے کر ایک طرح کی اسے کلین چٹ فراہم کر دیں گے۔ یوں آسمان نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ جس آصف زرداری کو اسحاق خان کے کہنے پر کرپشن الزامات میں تین سال جیل میں رکھا گیا تھا اسی صدر نے اسے اپنے ہاتھوں سے حلف دیا۔ ان مذاکرات کے درمیان صدر اسحاق یہ گارنٹی چاہتے تھے کہ انہیں دوبارہ صدر بنایا جائے گا۔ بینظیر بھٹو نے بھی یہ گولی صدر اسحاق کو دی کہ وہ انہیں دوبارہ صدر منتخب کریں گی۔ صدر اسحاق بھی یہ گولی اس لیے نگل گئے کیونکہ 1988ء میں بینظیر بھٹو نوابزادہ نصر اللہ خان کے مقابلے میں انہیں اپنا صدارتی امیدوار بنا چکی تھیں لہٰذا شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ تاہم، صدر اسحاق خان یہ بات بھول گئے تھے کہ ان پانچ سالوں میں بینظیر بھٹو نے بھی بہت کچھ سیکھا اور سمجھ لیا تھا۔ انہیں بھی اب سیاست کے گر آ گئے تھے۔ اسحاق خان یہ بھول گئے تھے کہ 1988ء میں جنرل اسلم بیگ اور جنرل حمید گل پاکستان کو چلا رہے تھے اور پانچ سال بعد پلوں کے نیچے سے بہت سارا پانی بہہ چکا تھا۔ اگرچہ اسحاق خان کو یقین تھا کہ فوج کے ایک پٹھان سپہ سالار عبدالوحید کاکڑ اپنے ایک پٹھان بھائی غلام اسحاق خان کا ساتھ دیں گے تاہم یہ ممکن نہ ہو سکا۔ یوں نواز شریف کی برطرفی اور ملک میں نئے انتخابات کے بعد جب نئے صدر کے انتخابات کا مرحلہ آیا اور غلام اسحاق خان پشاور سے دوڑے دوڑے اپنے کاغذات نامزدگی داخل کرانے آئے تو پتہ چلا کہ

[illegible] چکی تھی۔ اپنے داماد انور سیف اللہ کے ایف سیون میں واقع گھر میں بیٹھ کر اس زمانے کی بے پناہ دھوکے بازی اور سیاسی چالبازیوں کو روتے رہے۔ تاہم، وہ یہ بھول گئے تھے کہ ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا تھا جو وہ دوسروں کے ساتھ کرتے آئے تھے۔ سیاست کے سینے میں نہ دل ہوتا ہے اور نہ خون کے رشتے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ تو چالیں ہوتی ہیں۔ جو چل گیا وہ جیت گیا جو پیچھے رہ گیا وہ اپنی باری کا انتظار کرے یا پھر پشاور میں واقع اپنے گھر کی لائبریری میں بیٹھ کر ٹالسٹائی کا مشہور ناول War and peace کو نئے سرے سے پڑھے اور اپنی یادداشتوں کو قوم کی امانت سمجھ کر قلمبند کرنے کی بجائے ایک رات خاموشی سے اپنے بستر میں خدا کو پیارا ہو جائے۔

یہی وجہ تھی کہ نواز شریف بھی فاروق لغاری کے ساتھ وہی کھیل کھیل رہے تھے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ لغاری کے ساتھ وہی کچھ ہو رہا تھا جو انہوں نے اسحاق خان کے ساتھ ہوتے ہوئے اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔ تاہم، انسان میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ ابھی حالات میں برا کسی اور شخص کے ساتھ ہوا تھا وہ اس کے ساتھ نہیں ہوگا یا اپنے اوپر بڑھتے ہوئے غیر ضروری اعتماد کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کے بعد سب سے طاقتور شخص سمجھنا شروع کر دیتا ہے اور جب منہ کے بل گرتا ہے تو اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ یہی کچھ نواز شریف کے وزیراعظم بننے کے بعد فاروق لغاری کے ساتھ ہوا۔ وہی نواز شریف جو بینظیر حکومت گرانے کے لیے فاروق لغاری کو دوسری مرتبہ صدر بنانے کے لیے تیار تھے، ان ہی شاہد حامد کے ہاتھ انہوں نے پیغام بھجوایا تھا کہ بہتر ہے کہ وہ صدارت سے مستعفی ہو جائیں ورنہ پارلیمنٹ کے ذریعے ان کا احتساب کر کے انہیں گھر بھیج دیا جائے گا۔

صدر غلام اسحاق خان اور فاروق لغاری ایک بات بھول گئے تھے کہ ان کے بارے میں یہ بات طے تھی کہ اگر وہ ان لوگوں کے وفادار ثابت نہیں ہوئے جنہوں نے انہیں صدر بنوایا تھا تو بھلا ان سے دوسرے لوگ وفا کی کیا توقع رکھیں۔ شاید یہ بات چنگیز خان کے بارے میں مشہور ہے کہ جب بغداد شہر کے حکمران کے خلاف چند لوگوں نے اس کے فوجیوں کی مدد کی اور فتح کے بعد ایک قطار میں کھڑے ہو کر اپنے انعام کا انتظار کرنے لگے تو اس نے ایک تاریخی فقرہ کہہ کر ان سب کی گردنیں اڑانے کا حکم دیا تھا کہ جو لوگ اپنی مٹی اور اپنے لوگوں کے وفادار نہیں وہ بھلا کسی اور کے کیا وفادار ہوں گے۔

نتھیا گلی کے خوبصورت جنگلوں اور پہاڑوں پر سے دھیرے دھیرے گزر رہے تھے۔ بالخصوص شام ابھی بھی اس کشش کا منظر تھا کہ آخر فاروق لغاری بطور صدر ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور بینظیر بھٹو کو اپنی بہن سمجھتے تھے، پھر بھی وہ کیوں اتنے بڑے انتہائی اقدام اٹھانے پر تیار ہو گئے تھے۔

شاہد حامد نے اپنے مخصوص دھیمے انداز میں مجھے بتانا شروع کیا کہ ماضی کے ان دو پرانے دوستوں کے درمیان اختلافات کی کوئی ایک وجہ نہیں تھی۔ پتہ نہیں کہاں سے صدر لغاری کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ مہران بینک اسکینڈل کے پیچھے آصف زرداری کا ہاتھ تھا جس کی وجہ سے ان کا عوام کی آنکھوں میں جو ایک صاف ستھرا امیج تھا وہ بری طرح متاثر ہوا تھا۔ وہ انکوائری کمیشن جو اس اسکینڈل کی تحقیقات کر رہا تھا اس نے فاروق لغاری کو بیگناہ قرار دے دیا تھا لیکن اس کمیشن کی رپورٹ ابھی میڈیا یا عوام کو ریلیز نہیں کی گئی۔ اس سے یہ تاثر ملا کہ بینظیر حکومت نہیں چاہتی تھی کہ لغاری پر لگنے والے کرپشن کے اس دھبے کو صاف کیا جائے۔ فاروق لغاری اس وجہ سے بھی بینظیر بھٹو سے خفا تھے کہ جب بھی انہوں نے محترمہ سے ان کی حکومت پر لگنے والے کرپشن کے الزامات پر بات کرنی چاہی تو وہ تھوڑا سا ناراض ہو جاتی تھیں۔ محترمہ نے فاروق لغاری پر اتنا شک کرنا شروع کر دیا تھا کہ انہوں نے تمام وفاقی سیکرٹریوں کو باقاعدہ ہدایات جاری کی تھیں کہ وہ ان کی اجازت کے بغیر صدر سے ملاقات نہیں کریں گے۔ تاہم ان اختلافات میں فیصلہ کن وقت آیا جب بینظیر بھٹو نے سپریم کورٹ کے ججوں کے فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ کراچی میں مرتضیٰ بھٹو کے قتل نے رہی سہی کسر پوری کر دی جب [illegible] صدر لغاری پر یہ الزام لگایا کہ وہ مرتضیٰ بھٹو کو قتل کرنے کی سازش میں شریک تھے۔ [illegible] شاہد حامد [illegible] مرتضیٰ بھٹو [illegible] صدر [illegible] پریشان ہو گئے تھے۔ [illegible] حکومت [illegible] فاروق لغاری [illegible] مجھے [illegible] فاروق لغاری کی حمایت [illegible] مجھے یہ نہیں بتایا کہ

بینظیر بھٹو کی برطرفی کا آرڈر تیار کرنے کے لیے انہیں پی آئی اے، سوئی گیس، واپڈا اور دیگر محکموں کی کرپشن کی جو فائلیں دی گئی تھیں وہ کس نے فراہم کی تھیں۔ تاہم یہ بات واضح تھی کہ اگر آرمی چیف جہانگیر کرامت صدر لغاری کے ساتھ تھے تو پھر یقیناً یہ نیک فریضہ آئی ایس آئی نے سرانجام دیا ہوگا۔

جونہی پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہوئی تو پنجاب سے پیپلز پارٹی کے بڑے بڑے لیڈروں کے فون آنے شروع ہو گئے۔ وہ سب فاروق لغاری کا ساتھ دینا چاہ رہے تھے۔ تاہم فاروق لغاری نے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اگرچہ انہی دنوں میں لغاری پارٹی بنانے کی سرگوشیاں شروع ہو چکی تھیں۔

باتوں باتوں میں شاہد حامد نے ایک اور انکشاف کیا کہ جنرل جہانگیر کرامت 1997ء کے الیکشن ملتوی کرانا چاہ رہے تھے۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے جہانگیر کرامت نے لغاری کو یہ بھی پیغام دیا تھا کہ ان کے کور کمانڈر اس بات کے حق میں تھے کہ پہلے ملک میں سیاستدانوں کا بے رحمانہ احتساب کیا جائے اور اس کے بعد الیکشن کرائے جائیں۔

ابھی میں اس شاک سے سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ جہانگیر کرامت بھلا کیسے اس طرح کی بات کر سکتے تھے کہ شاہد حامد نے میرے سر پر ایک اور بم مارا کہ جہانگیر کرامت کو تو چھوڑیں، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ بھی نئے انتخابات کے خلاف تھے۔ موصوف نے تو صدر لغاری کو ایک خط بھی لکھا تھا: "جناب صدر! کیا آپ نے ابھی تک یہ نہیں سوچا کہ سپریم کورٹ سے رابطہ کر کے نگران حکومت کا دورانیہ بڑھایا جائے۔"

شاہد حامد کی بات سے یہ پتہ چلا کہ اس وقت کے آرمی چیف اور چیف جسٹس دونوں مل کر پاکستان میں سیاسی نظام کے خلاف سازش کر رہے تھے اور اس کام کے لیے انہوں نے فاروق لغاری کو استعمال کیا تھا۔ لیکن لغاری بھی ایک حد تک استعمال ہونے کے بعد ان دونوں کے ہاتھوں مزید استعمال ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔

حالات کو یہ بھی رخ دینے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ ملک میں [illegible] کرانے کے بجائے انتخابات ملتوی کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم لغاری نے یہ تمام تجاویز مسترد کر دیں۔ فاروق لغاری کی رائے سے واضح تھا کہ انہوں نے نگران حکومت کے قیام کا [illegible] سیاسی [illegible] صدر لغاری کی [illegible]۔ لغاری اس بات سے بھی خوفزدہ تھے کہ اگر ملک میں انتخابات نہ ہوئے تو یہ بھی ممکن تھا کہ

کچھ عرصے بعد فوج آگے بڑھ کر اقتدار پر قبضہ کر لے۔ بہانہ یہ بنایا جائے گا کہ فاروق لغاری کی کمزور کابینہ کرپٹ سیاستدانوں کا احتساب کرنے میں ناکام رہی تھی۔

جہاں ایک طرف آرمی چیف اور چیف جسٹس ملک میں انتخابات ملتوی کرانا چاہ رہے تھے وہاں کابینہ کے چند وزیر اور صوبائی گورنر بھی لغاری پر مسلسل یہ زور ڈال رہے تھے کہ وہ انتخابات نہ کرائیں بلکہ پہلے احتساب کیا جائے۔ فوجی قیادت بہت زیادہ بے چین تھی اور وہ ہر صورت ملک میں انتخابات ملتوی کرانا چاہ رہی تھی۔ جب لغاری پر دباؤ بڑھ گیا تو ایک دن فاروق لغاری کو جی ایچ کیو بلایا گیا جہاں انہوں نے کور کمانڈروں کو پانچ گھنٹے تک اس بات پر دلائل دیئے کہ ملک میں وقت پر انتخابات ہونا کتنے ضروری تھے۔ سول اور ملٹری حکمرانوں کے درمیان ان اختلافات کی بنیاد پر نیشنل سیکیورٹی کونسل کا آئیڈیا سامنے آیا۔ یوں فاروق لغاری اس ملک کے پہلے صدر تھے جنہوں نے فوج کے سیاست میں باقاعدہ رول کو تسلیم کیا۔

میں نے شاہد حامد سے پوچھ لیا کہ اگر بینظیر بھٹو، آصف زرداری اور پارلیمنٹ کے وہ تمام ارکان جنہوں نے فاروق لغاری کو ووٹ دے کر صدر بنوایا تھا، وہ کرپٹ تھے تو پھر فاروق لغاری نے خود استعفیٰ کیوں نہیں دے دیا۔ اگر انہیں ووٹ دینے والے کرپٹ تھے تو پھر انہیں بھی اقتدار میں رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کیا فاروق لغاری پر اخلاقی اور سیاسی طور پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے تمام کرپٹ ساتھیوں کے ساتھ گھر چلے جاتے۔ انہوں نے ایک عجیب روایت قائم کی کہ جنہوں نے ان کو صدر بنوایا تھا وہ تو کرپٹ تھے اور موصوف خود اپنے آپ کو بہت ایماندار سمجھتے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ شاہد حامد کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

شاہد حامد اپنے ماضی کی یادوں میں ڈوبے ہوئے بولتے رہے۔ بینظیر بھٹو حکومت ختم ہو چکی تھی۔ نئے نئے منصوبے بن رہے تھے کہ اچانک ایک دن پتہ چلا کہ فاروق لغاری اور جہانگیر کرامت میں اختلافات پیدا ہو چکے ہیں۔ بینظیر بھٹو نے اپنی برطرفی سپریم کورٹ میں چیلنج کر دی تھی۔ سپریم کورٹ کے متوقع فیصلے سے ایک دن پہلے بحث کرنے کے لیے ایک میٹنگ بلائی گئی تھی۔ اس میٹنگ میں فاروق لغاری اور جنرل جہانگیر کرامت بھی شریک تھے۔ اس میٹنگ کا ایک ہی بات موضوع تھا کہ سپریم کورٹ کیا فیصلہ دے گی۔ سب کی نظریں شاہد حامد کی طرف اٹھیں کیونکہ ان دنوں وہ اس کیس کو بڑے

بہت اپیل کر رہے تھے۔ شاہد حامد نے بڑے اعتماد کے ساتھ اس میٹنگ کے شرکاء کو بتایا کہ سپریم کورٹ چھ کے مقابلے میں ایک ووٹ سے بینظیر بھٹو حکومت کی برطرفی کے فیصلے کو برقرار رکھے گی۔ میٹنگ کے شرکاء میں سے اچانک کسی ایک نے ایک انتہائی تکلیف دہ سوال پوچھ لیا کہ اگر سپریم کورٹ نے بینظیر بھٹو حکومت کو بحال کر دیا تو کیا ہوگا۔ ابھی سوال پوچھنے والے کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ فاروق لغاری نے بڑی اونچی آواز میں کہا کہ پھر وہ کل صبح ہی صدارت سے استعفیٰ دے دیں گے۔ فاروق لغاری کی اس بات نے اس میٹنگ میں بیٹھے ہوئے سب لوگوں کو سخت حیران کر دیا۔ ان میں سے کوئی بھی ان سے اس طرح کی بات کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ فاروق لغاری نے ان سب لوگوں کو ایک بہت بڑا واضح پیغام دے دیا تھا کہ وہ ان سب کو انتقام سے بھری بینظیر بھٹو کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود چوٹی زیریں جا کر ڈیرہ لگا لیں گے۔ اس میٹنگ کے شرکاء کو یہ احساس ہوا کہ فاروق لغاری ایک خود غرض انسان ہیں اور آنے والے دنوں میں ان کے دوستوں کے درمیان اسی ایک بات سے پیدا ہونے والے اختلافات شدید ہوتے گئے اور آخر ایک دن وہ ایوان صدر میں اتنے تنہا رہ گئے کہ نواز شریف کے ایک پیغام پر انہیں استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑا۔

میں نے بات کا رخ دوسری طرف موڑا اور شاہد حامد سے پوچھا کہ اس بات میں کتنی صداقت ہے کہ فاروق لغاری نے بینظیر بھٹو کی پارٹی کو ہرانے کے لیے انتخابات میں دھاندلی کرائی تھی۔

شاہد حامد نے مجھے ایک عجیب سی بات بتائی۔

انتخابات کے نتائج نے ایوان صدر کے مکینوں کو بھی حیران کر دیا تھا کیونکہ وہ بھی یہ توقع نہیں کر رہے تھے کہ نواز شریف دو تہائی اکثریت لے کر الیکشن جیت جائیں گے۔ اس حیرانی کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ الیکشن سے کچھ دن پہلے آئی ایس آئی نے اپنی ایک رپورٹ ایوان صدر بھیجی تھی جس میں 2 فروری 1997ء کو ہونے والے انتخابات کے بارے میں سیاسی جماعتوں کے امیدواروں کے ہارنے اور جیتنے بارے پیشن گوئیاں کی گئی تھیں۔ آئی ایس آئی کے بقول نواز شریف کی پارٹی کو نوے اور سو کے درمیان جبکہ بینظیر بھٹو کو پچاس اور ساٹھ کے درمیان سیٹیں ملنے کی توقع تھی۔ تاہم، جب رزلٹ آنا شروع ہوئے تو ایوان صدر کے مکین آہستہ آہستہ حیران اور پھر پریشان ہونا شروع ہو گئے کیونکہ وہ تو یہ توقع کر کے بیٹھے تھے کہ آئی ایس آئی نے جو کہہ دیا تھا وہ فائنل تھا۔ ایک بات واضح تھی کہ پیپلز پارٹی کے مایوس کارکن

ووٹ ڈالنے کے لیے اپنے گھروں سے نہیں نکلے تھے۔

میں نے بات آگے بڑھانے کی غرض سے شاہد حامد سے پوچھا کہ جب نواز شریف وزیر اعظم بن گئے تو پھر لغاری اور ان کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ شاہد حامد نے کہا کہ شروع میں دونوں کے درمیان تعلقات بہت اچھے تھے۔ ایک پرائیویٹ ڈنر کا اہتمام کیا گیا جس میں فاروق لغاری، وزیر اعظم نواز شریف اور شاہد حامد شریک ہوئے۔ صدر لغاری نے نواز شریف کو اکانومی پر بریفنگ دی۔ شاہد جاوید برکی نے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے ساتھ طے پانے والے معاہدوں کی تفصیلات بتائیں۔ نواز شریف چاہتے تھے کہ شاہد جاوید برکی ملک کے وزیر خزانہ کے طور پر کام کرتے رہیں لیکن ورلڈ بینک کے اس ملازم نے انکار کر دیا۔ اسی ڈنر پر شاہد حامد نے نواز کو دفاع اور قانونی معاملات پر بریفنگ دی۔ نواز نے شاہد حامد کو بھی اپنی کابینہ میں وفاقی وزیر بنانے کی پیشکش کی۔ تاہم، فاروق لغاری چاہتے تھے کہ وہ پنجاب کے گورنر بن جائیں۔ جب کہ شاہد حامد کی یہ خواہش تھی کہ وہ فیڈرل منسٹر بن جائیں تا کہ وہ نواز اور لغاری کے درمیان ایک پل کا رول ادا کریں۔ شاہد حامد نے محسوس کیا کہ فاروق لغاری کی شخصیت میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی جس کا نام ڈیرہ غازی خان کی مقامی سیاست تھا۔ ایوان صدر میں بیٹھ کر بھی وہ اپنے علاقے کی چھوٹی موٹی سیاست میں ملوث رہتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ڈیرہ غازی خان ان کی انگلیوں پر ناچتا رہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب نواز شریف وزیر اعظم بنے تو لغاری نے ذاتی طور پر پنجاب کے وزیر اعلیٰ شہباز شریف سے یہ درخواست کی تھی کہ ڈیرہ غازی خان ان کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی اجازت دی جائے۔ جب ایک دن فاروق لغاری کی مقامی سیاست کے حوالے سے چھوٹی موٹی باتوں پر شاہد حامد تھوڑا سا جھلاہٹ کا شکار ہوئے تو صدر صاحب نے انہیں ایک طعنہ مارا:

"شاہد حامد صاحب! آپ چونکہ اقتدار میں کسی سیاسی جدوجہد یا عمل کے ذریعے نہیں آئے لہٰذا آپ کو اس بات کا احساس نہیں ہے کہ جب تک مقامی سیاست میں اس طرح کی چھوٹی موٹی چیزیں نہ کی جائیں، انتخابات نہیں جیتے جا سکتے۔"

شاہد حامد اپنے پرانے دوست کے احترام میں خاموش تھے لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ وہ یہ بات کہنا چاہتے تھے کہ کس طرح ایوان صدر میں بیٹھ کر بینظیر بھٹو حکومت کو کرپشن اور بیڈ گورننس کے الزامات پر برطرف کرنے والے موصوف کس طریقے سے اپنے مخالفین کو تھانہ کچہری اور پٹواریوں کے ذریعے تنگ کر

حکومت چلتا کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ تاہم لگتا ہے کہ مخالفین کو تنگ کرنے کے باوجود بھی فاروق لغاری اپنی گرتی ہوئی مقبولیت کو اپنے حلقے میں نہیں سنبھال سکے اور 2008ء کے الیکشن میں وہ شخص جو 1993ء میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ایک لاکھ سے زائد ووٹوں کی لیڈ سے جیتا تھا، وہ بمشکل تمن دار اپنے حلقے میں ووٹ دوبارہ گنوا کر ایم این اے بن سکا۔

شاہد حامد نے مجھے بتایا کہ جب نواز شریف وزیر اعظم بنے تو فاروق لغاری خود چاہتے تھے کہ صدر کے اسمبلی توڑنے کے اختیارات کو ختم ہونا چاہیے۔ شاید لغاری یہ بات سمجھ چکے تھے کہ ایک صدر صرف ایک دفعہ اسمبلی توڑ سکتا ہے۔ اگر وہ دوبارہ یہ کوشش کرے گا تو اس کا حشر بھی وہی کچھ ہوگا جو غلام اسحاق خان کا ہوا تھا۔ جب 6 اگست 1990ء کو غلام اسحاق خان نے بینظیر بھٹو کی حکومت توڑی تھی تو فوج، عوام، میڈیا اور سیاستدانوں نے زیادہ ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا کہ شاید بینظیر بھٹو کا زیادہ قصور تھا۔ تاہم، جب تین سال بعد مارچ، اپریل 1993ء میں غلام اسحاق خان نے وہی کام نواز شریف کے ساتھ کیا تو پھر سب نے یہی سمجھا کہ صدر کے ساتھ ہی کچھ مسئلہ ہے جو سیاسی حکومتوں کو نہیں چلنے دے رہا۔ جب تک اس کی چھٹی نہیں ہوگی ملک کا نظام آگے نہیں چلے گا اور یوں غلام اسحاق خان کو سول ملٹری بیوروکریسی کی تمام تر حمایت کے باوجود استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑ گیا تھا۔ یہی بات شاید فاروق لغاری کے ذہن میں بھی تھی کہ وہ اپنا اختیار ایک دفعہ استعمال کر چکے تھے۔ اب کی دفعہ ان کے ساتھ کوئی کھڑا نہیں ہوگا۔

جب فاروق لغاری نے اپنی اس خواہش کا اظہار جنرل جہانگیر کرامت کے سامنے کیا تو صدر صاحب بڑے حیران ہوئے جب آرمی چیف نے یہ فرمایا کہ جناب آپ کو یہ 58-2b ختم کرنے کی اتنی جلدی کیوں ہے۔ صدر لغاری کے لیے یہ پیغام بڑا واضح تھا کہ جناب آپ کے لیے استعمال کرنے کا وقت ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ آرمی چیف شاید بینظیر کی طرح نواز شریف کی چھٹی بھی صدر لغاری کے ذریعے کرانا چاہ رہے تھے۔

نواز شریف صدر لغاری کے اس اختیار کو بڑے احسن طریقے سے ختم کرانے کے موڈ میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے چوٹی زیریں جا کر صدر لغاری کو ان کی اسمبلیاں توڑنے کے اختیارات ختم کرنے کے مسئلے پر اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا۔ جب میٹنگ شروع ہوئی اور نواز شریف نے یہ بات لغاری

کہہ دی گئی کہ وہ پارلیمنٹ کے ذریعے صدر صاحب کے اسمبلیاں توڑنے کے اختیارات کو ختم کرنا چاہ رہے ہیں تو لغاری صاحب نے فوراً کہا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ نواز شریف نے اسلام آباد واپس آ کر پارلیمنٹ کے اجلاس سے اس کلاز کو ختم کرا کے لغاری صاحب کے ہاتھ سے آرمی چیف اور دیگر اہم تقرریاں کرنے کی پاور اپنے ہاتھ میں لے لیں تو پھر ہم سب لوگوں کو محسوس ہوا کہ لغاری صاحب اور نواز شریف میں تعلقات کافی بگڑ چکے ہیں۔

اس سے پہلے جب نواز شریف چوٹی زیریں جا رہے تھے تو گورنر شاہد حامد بھی ان کے ساتھ تھے۔ راستے میں نواز شریف نے شاہد حامد کو بتایا کہ آپ لغاری صاحب کو یہ بات بتائیں کہ ہم ان کی قابلیت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ دوسری دفعہ بھی ملک کے صدر بنیں۔ تاہم، لغاری صاحب کے ساتھ ہونے والی میٹنگ سے پہلے شاہد حامد نے نواز شریف کو بتایا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آرمی چیف کون مقرر کر رہا ہے صدر یا وزیراعظم کیونکہ جونہی ایک جنرل آرمی چیف بنتا ہے تو وہ فوری طور پر چیف آف آرمی سٹاف بن جاتا ہے۔ اس کی ہمدردیاں پھر اپنے ادارے کے ساتھ ہوتی ہیں نہ کہ صدر یا وزیراعظم کے ساتھ!

شاہد حامد نے اس بات کا اعتراف کیا کہ 58-2b کے ختم ہونے سے صدر اور وزیراعظم کے اب تک اچھے تعلقات میں یقیناً فرق پڑا۔ شاہد حامد کو اس بات پر قطعاً کوئی شبہ نہیں تھا کہ نواز شریف اور لغاری کے درمیان اس کلاز کا خاتمہ ہی آگے آنے والے دنوں میں دونوں کے درمیان شدید اختلافات اور صدر لغاری کے استعفیٰ پر ہوا۔

شاہد حامد نے اس بات کو بھی تسلیم کیا کہ الیکشن ہونے سے پہلے فاروق لغاری نے نواز شریف کو بہت بڑی فیور کی تھی۔ یعنی جب امیدواروں کی قابلیت کے مسئلے پر چند چیزیں جو نواز شریف کو الیکشن لڑنے سے روک سکتی تھیں، انہیں ختم کر دیا گیا۔ نواز شریف اور خالد انور نے شاہد حامد سے یہ بات کی تھی کہ فاروق لغاری کو کہیں کہ وہ کسی امیدوار کی الیکشن لڑنے کی شرائط میں سے یہ بات نکال دیں کہ وہ تمام لوگ انتخابات لڑنے کے اہل نہیں تھے جو کسی ایسی مل یا کمپنی کے مالک تھے جو کسی بینک کی مقروض ہو۔ نواز شریف یہ چاہتے تھے کہ اس قانون میں سے کنٹرول اور مل مالک کے الفاظ نکال دیے جائیں۔ جب یہ بات نگران کابینہ کے سامنے رکھی گئی تو تمام وزیر دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ کچھ وزیروں کا خیال

تھا کہ نواز شریف بڑے لیڈر تھے لہٰذا ان کی یہ بات مان لینی چاہیے تاکہ وہ الیکشن لڑ سکیں جبکہ باقی وزیر اس بات کے خلاف تھے کیونکہ ان کے خیال میں اگر صرف نواز شریف کے لیے اس قانون میں تبدیلی کی گئی تو فاروق لغاری اور ان کی نگران کابینہ کی ساکھ بُرے طریقے سے خراب ہو گی۔

شاہد حامد نے بتایا کہ ان کا خیال تھا کہ شاید نواز شریف خود اس کلاز سے بُرے طریقے سے متاثر ہوں گے۔ نواز شریف کا جواب سن کر شاہد حامد حیران رہ گئے۔ نواز نے انہیں بتایا کہ دراصل اس کلاز سے انہیں ذاتی طور پر تو کوئی نقصان نہیں ہے، لیکن اگر اسے نہ ہٹایا گیا تو چوہدری شجاعت حسین الیکشن نہیں لڑ سکیں گے۔

صدر لغاری نواز شریف کی اس درخواست پر غور کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور "اصولوں کی بنیاد" پر ان تمام لوگوں کو الیکشن لڑنے کی اجازت دے دی گئی جو ان کمپنیوں یا ملوں کے مالک تھے جن کے ذمے بینکوں کے کروڑوں یا ارب روپے کے قرضے واجب الادا تھے۔

الیکشن ہو گئے تھے۔ نواز شریف وزیراعظم بن چکے تھے۔ 58-2b کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ لوگوں نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ شاید اب سیاسی انتشار ختم ہو چکا ہے۔ تاہم، کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے والی ہے۔ صدر لغاری کے نواز شریف سے بھی عدلیہ کے مسئلے پر اسی طریقے کے اختلافات شروع ہونے والے تھے جیسے کہ بینظیر بھٹو سے ہوئے تھے جو پیپلز پارٹی حکومت کی برطرفی پر جا کر ختم ہوئے۔ دھیرے دھیرے فاروق لغاری کو یہ احساس ہونا شروع ہو گیا کہ نواز شریف بھی سارے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لینا چاہ رہے تھے۔ وہ اختلافات جو دراصل وزیراعظم نواز شریف اور چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے درمیان شروع ہوئے تھے اس کی لپیٹ میں فاروق لغاری بھی آ گئے حالانکہ شروع میں فاروق لغاری کا ان دونوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نواز شریف اور سجاد علی شاہ کے درمیان اختلافات اس وقت شروع ہوئے جب وزیراعظم نے ملک بھر میں انٹی ٹیررسٹ کورٹس بنا کر عدلیہ کے سامنے ایک نیا ادارہ کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ سجاد علی شاہ نے نواز شریف کو بتایا کہ وہ نئی عدالتیں نہ بنائیں کیونکہ موجودہ قوانین کے تحت بھی دہشت گردوں کو سزا دی جا سکتی ہے۔ ابھی اس مسئلے کی گرد نہیں بیٹھی تھی جب سپریم کورٹ میں ججوں کی تعداد پر ایک نیا تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ نواز شریف لاہور ہائی کورٹ کے پانچ ججوں کو سپریم کورٹ کا جج مقرر کرنے کے خلاف

[illegible]

شاہد حامد نے فاروق لغاری کے ساتھ ملاقات کی کہ جب [illegible] چیف جسٹس سجاد علی شاہ [illegible] ان کے پیچھے [illegible] اب [illegible] چیف جسٹس کے خلاف بغاوت کر چکے ہیں۔

نواز شریف اور شاہد حامد کی اس وقت [illegible] جب یہ بات سن کر فاروق لغاری نے ان سے [illegible] کہ نواز شریف [illegible] پر کام کر رہے تھے۔ اسی وجہ سے آج انہوں نے اپنے چیف جسٹس کے خلاف بغاوت کرا دی ہے۔

میں نے شاہد حامد کو [illegible] سے پوچھا کہ ان باتوں میں کتنی صداقت تھی کہ نواز شریف نے ججوں کو چیف جسٹس کے خلاف [illegible] دیا تھا۔

شاہد حامد اچانک سنجیدہ ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ ان کے خیال میں نواز شریف نے کسی جج کو کوئی پیسے نہیں دیے تھے۔ وہ ان تمام ججوں کو ذاتی طور پر جانتے تھے اور انہیں اس بات کا بھی علم تھا کہ انہوں نے سجاد علی شاہ کے خلاف بغاوت کیوں کی تھی۔ سارا [illegible] سے [illegible] تھا جہاں تین جج کام

[illegible]

شاہد حامد نے میرے سوال کے جواب میں ایک اور کہانی سنائی۔ ان کے مطابق فاروق لغاری کے دل میں نواز شریف کے خلاف اب نفرت ابھر چکی تھی۔ وہ نواز شریف کے ساتھ مزید کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ فاروق لغاری اب یہ سوچ رہے تھے کہ نواز شریف کی باتیں ماننے کے بجائے کیوں نہ وہ استعفیٰ دے کر گھر چلے جائیں۔ تاہم جب فاروق لغاری کے بچوں کو اور ان کے دوستوں کو یہ علم ہوا کہ وہ استعفیٰ دینے والے ہیں تو سب نے بڑی سختی سے اس کی مخالفت کی۔

سپریم کورٹ کے ججوں کا یہ خیال تھا کہ شاہد حامد فاروق لغاری کے بہت زیادہ قریب تھے لہٰذا وہ ان سے مسلسل رابطے میں رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ سپریم کورٹ کے جج کیا چاہتے تھے۔ ان تمام ججوں نے شاہد حامد پر ایک بات واضح کر دی تھی کہ وہ چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے [illegible] کام نہیں کریں گے۔ یوں جب فاروق لغاری نے نواز شریف کے مطالبے پر ان سے رائے مانگی تو شاہد حامد نے انہیں یہی مشورہ دیا کہ وہ سجاد علی شاہ کی چھٹی کرا دیں۔

جنرل جہانگیر کرامت بھی چپ کر کے بیٹھنے والے نہیں تھے۔ وہ بھی صدر اور وزیر اعظم کے

درمیان بڑھتے ہوئے اختلافات کی کہانیوں سے باخبر تھے۔ ایک دن جنرل جہانگیر کرامت نے شاہد حامد کو فون کیا اور ان سے ان دس ججوں کے بارے میں قانونی رائے مانگی جنہوں نے سجاد علی شاہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ شاہد حامد نے جہانگیر کرامت کو وضاحت کے ساتھ سمجھایا کہ دس ججوں کی بغاوت کے بعد سجاد علی شاہ کو اب گھر جانا ہوگا۔ شاہد حامد کی بات سن کر جہانگیر کرامت نے کہا کہ جی ایچ کیو کی لیگل برانچ نے بھی انہیں یہی رائے دی ہے کہ سجاد علی شاہ کو اب جانا پڑے گا۔

فاروق لغاری اور نواز شریف کے درمیان اختلافات بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ نواز شریف کا خیال تھا کہ چیف جسٹس سجاد علی شاہ ان کی جس انداز میں توہین کر رہے ہیں اس کے پیچھے فاروق لغاری کا ہاتھ ہے جبکہ فاروق لغاری کا یہ خیال تھا کہ نواز شریف اور بینظیر بھٹو کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ دونوں عدلیہ کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔

نواز شریف نے آخر ایک دن یہ فیصلہ کر لیا کہ اب وہ فاروق لغاری کے خلاف پارلیمنٹ میں قرارداد لا کر ان کی صدارت سے چھٹی کرائیں گے۔ جب شاہد حامد کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ بھاگے بھاگے چوہدری نثار اور شہباز شریف کے پاس گئے اور انہیں کہا کہ وہ لغاری کے ساتھ یہ سلوک نہ کریں۔ تاہم شاہد حامد یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ان سے زیادہ جنرل جہانگیر کرامت کی بات سنی گئی جنہوں نے فاروق لغاری کو پارلیمنٹ کے ہاتھوں ذلیل ہو کر گھر جانے سے بچا لیا اور بات لغاری کے استعفیٰ پر ختم ہو گئی۔

فاروق لغاری کو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ نواز شریف نے ججوں پر "کام" کیا تھا لیکن شاہد حامد کو یہ بات کبھی نہیں آئی تھی کہ بھلا ایک ہی وقت میں ایک شخص دس ججوں پر کیسے کام کر سکتا تھا۔ ان کے خیال میں لوگ یہ بات کیوں بھول جاتے تھے کہ باقاعدہ ایک فل کورٹ منعقد ہوئی تھی اور سب سے سینئر جج نے اس کی صدارت کی اور متفقہ فیصلے کے تحت سجاد علی شاہ کو ہٹایا گیا تھا۔

جب جہانگیر کرامت کو اس بات کا پتہ چلا کہ فاروق لغاری استعفیٰ دینے والے ہیں تو انہوں نے انہیں اس بات سے منع کیا۔ فاروق لغاری نے نواز شریف کو پیغام بھیجا کہ وہ وسیم سجاد کو اس ملک کا قائم مقام صدر بنا دیں جن کا ضمیر چیف جسٹس سجاد علی شاہ کو ہٹانے کی سمری پر دستخط کرتے وقت مضطرب نہیں کرے گا۔

فاروق لغاری کے ایوان صدر میں آخری دنوں کو یاد کرتے ہوئے شاہد حامد بولے کہ استعفیٰ دینے سے کچھ دن قبل فاروق لغاری نے ان سے قانونی معاملات پر مشاورت بند کر دی تھی۔ اب اس کام کا فریضہ ان کے نئے دوست خواجہ طارق رحیم اور شہزادہ جہانگیر ادا کر رہے تھے۔

شاہد حامد نے گہری سانس لی اور کہا کہ اگرچہ چیف جسٹس کو ہٹانے کے معاملے پر وہ اپنے دوست فاروق لغاری کے ہم خیال نہیں تھے لیکن ان کے خیال میں لغاری کو استعفیٰ نہیں دینا چاہیے تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور سوال آیا اور میں نے خنکی کے ماحول میں بڑھتی ہوئی خلا کے درمیان شاہد حامد سے پوچھ لیا کہ جب ان کے دوست فاروق لغاری استعفیٰ دے رہے تھے تو کیا یہ ان کی بھی اخلاقی ذمہ داری نہیں بنتی تھی کہ جو شخص انہیں اتنا اوپر لے آیا تھا، جب وہ کسی صحیح یا غلط وجہ سے استعفیٰ دے رہا تھا تو انہیں بھی اپنے دوست کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہوا کا رخ بدلتے دیکھ کر شاہد حامد نے بھی فاروق لغاری کی ڈوبتی ہوئی کشتی میں بیٹھنے کی بجائے نواز شریف کے جہاز میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

میرا چبھتا ہوا اور تلخ سوال سن کر شاہد حامد نے انکشاف کیا کہ جس دن فاروق لغاری نے صدارت سے استعفیٰ دیا تھا اس دن دوسرے صوبائی گورنروں کی طرح انہیں بھی لاہور سے بلایا گیا۔ نواز شریف نے بڑی تفصیل سے ان سب لوگوں کو وہ حالات و واقعات بتائے جن کی وجہ سے فاروق لغاری کو آج استعفیٰ دینا پڑ گیا تھا۔ نواز شریف سے ملنے سے پہلے شاہد حامد ایئرپورٹ سے اترنے کے بعد سیدھے آرمی چیف جہانگیر کرامت سے ملنے گئے جہاں انہوں نے بیٹھ کر اس نئی صورتحال پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اس کے بعد وہ سیدھے نواز شریف سے ملنے چلے گئے۔ جب گورنروں سے نواز شریف کی میٹنگ ختم ہوئی تو شاہد حامد نے چپکے سے اپنی جیب سے استعفیٰ نکالا اور نواز شریف کے حوالے کر دیا۔ تاہم نواز شریف نے شاہد حامد کو کہا کہ وہ گورنر پنجاب کے طور پر کام کرتے رہیں۔ نواز نے شاہد حامد کو بتایا کہ وہ انہیں گورنر پنجاب کی پوزیشن سے اس لیے بھی نہیں ہٹائیں گے تاکہ کہیں یہ تاثر نہ پیدا ہو کہ وہ فاروق لغاری کے آدمی تھے لہٰذا ان کی بھی چھٹی کرا دی گئی۔

جب نواز شریف نے شاہد حامد کا استعفیٰ مسترد کیا تو انہوں نے وزیراعظم کو فاروق لغاری سے ہونے والی میٹنگ کے بارے میں بتایا جو انہیں ابھی جا کر کرنی تھی۔ یہ سن کر نواز شریف نے شاہد

[illegible]

گئی ہے۔

شہباز شریف ابھی ماضی میں کھوئے ہوئے تھے اور مجھے بتا رہے تھے کہ وہ فاروق لغاری کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ کیا کبھی فاروق لغاری نے ان سے گلہ کیا تھا کہ [illegible] ضرورت پڑنے پر انہوں نے ساتھ نواز شریف کا دیا تھا۔

وہ [illegible] فاروق لغاری نے اس طرح کی شکایت کبھی نہیں کی۔

[illegible]

[illegible]

اسحاق ڈار

اس واقعے کے تقریباً چار سال بعد اسحاق ڈار نے مجھے بتایا کہ [illegible] پریشانی سے [illegible] ایک ایک کر کے مجھے بتاتے [illegible] جنرل مشرف [illegible]

اسحاق ڈار بھی ان چند گنے چنے سیاستدانوں میں سے ایک تھے جنہیں اٹک قلعہ میں جنرل مشرف کے دور میں قید میں رکھا گیا۔

ان دنوں اسحاق ڈار کے بیٹے کی منگنی نواز شریف کی بیٹی سے [illegible] میں نے باتوں باتوں میں محسوس کیا کہ اسحاق ڈار کے پاس جو اس ملک کے کچھ اہم عہدوں پر فائز رہے تھے بہت سارے راز ہیں اور مجھے خوشی اس بات پر ہوئی کہ وہ ان رازوں پر سے پردہ اٹھانے کے لیے بھی تیار تھے۔ باقی تو چھوڑیں، وہ یہ بات بتانے کے لیے بھی پہلی دفعہ تیار ہوئے کہ نواز شریف اور جنرل مشرف کے درمیان پاکستانی جیل چھوڑ کر جدہ کے سرور پیلس میں رہنے والی ڈیل کی اصل کہانی کیا تھی؟ ان رازوں سے ہم بعد میں پردہ اٹھائیں گے۔ پہلے آپ کی ملاقات اس اسحاق ڈار سے کراتے ہیں جب وہ ابھی سیاست میں نہیں آئے تھے۔ اسحاق ڈار کے ایک عام چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے پاکستان کے سب سے طاقتور وزیر خزانہ اور ابوظہبی کے حکمران شیخ النہیان کے ایڈوائزر بننے تک کی کہانی بھی ایک

[illegible] کی خصوصیات کا آسانی سے اندازہ کر سکتے ہیں۔

بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ اسحاق ڈار اور نواز شریف دونوں گورنمنٹ کالج لاہور میں 1968ء میں کلاس فیلو بھی تھے۔ جب نواز شریف وزیر اعظم بنے تو انہوں نے اپنے پرانے تعلق کی وجہ سے اپنے کلاس فیلو کو بورڈ آف انویسٹمنٹ کا چیئرمین لگا دیا۔ جب غلام اسحاق خان نے 1993ء میں نواز شریف کی حکومت برطرف کی تو انہوں نے اسحاق ڈار کو یہ پیشکش کی کہ وہ اپنے عہدے پر کام کرتے رہیں۔ ایک [illegible] کے ذریعے پیغام بھی ان کے پاس بھیجا گیا لیکن اسحاق ڈار نے یہ پیشکش مسترد کر دی۔

نواز شریف کی برطرفی کے بعد اسحاق ڈار نے سیاست کو باقاعدہ جوائن کر لیا۔ 1993ء میں لاہور میں ہونے والے ضمنی الیکشن میں انہوں نے ایم این اے کی سیٹ جیتی۔ جبکہ اس وقت جب اسلام آباد میں بے نظیر بھٹو کی اور پنجاب میں ان کی پارٹی کی حکومت تھی۔ انہیں نواز شریف سے علیحدہ کرنے کے لیے ایک وفاقی وزیر کو ان کے پاس بھیجا گیا اور اس کے بدلے میں بہت ساری پیشکشیں کی گئیں۔ ان کے انکار پر مخالف پارٹی کو بڑا غصہ آیا۔ ان کے خلاف الیکشن ٹریبونل میں ایک پٹیشن دائر کر کے انہیں اس بات پر نااہل قرار دے دیا گیا کہ وہ بورڈ آف انویسٹمنٹ کے چیئرمین ہونے کے ناطے دو سال تک الیکشن لڑنے کے اہل نہیں تھے۔ تاہم، بعد میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے ایک فل بنچ نے اسحاق ڈار کے حق میں یہ کہہ کر فیصلہ دیا کہ کوئی بھی شخص اگر کسی سرکاری عہدے پر بغیر تنخواہ اور مراعات کے کام کرتا ہے تو اس پر دو سال کی شرط لاگو نہیں ہوتی۔ کئی برس بعد سپریم کورٹ کے ایک جج نے اسحاق ڈار کو بتایا کہ انہیں صرف [illegible] کے پریشر پر الیکشن ٹریبونل سے اس کو نااہل کروایا گیا تھا۔

نواز شریف کو اسحاق ڈار کی یہ وفاداری پسند آئی۔ یہی وجہ تھی جب 1997ء میں وہ دو تہائی اکثریت سے جب دوبارہ اقتدار میں آئے تو انہوں نے ڈار کو اپنا وزیر تجارت مقرر کر دیا۔ وزیر بنتے ہی ڈار نے ان پالیسیوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا جو ہر سیاسی حکومت لوگوں کو رشوت کے طور پر استعمال کر کے اقتدار میں اپنے دن پورے کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ ان کے نزدیک وہ پالیسیاں جو رشوت کے طور پر استعمال کی جاتی رہی تھیں ان میں وزیر اعظم کو صوابدیدی اختیار تھا کہ وہ کسی کو بھی پلاٹ الاٹ کر سکتے تھے، ٹیکسٹائل کوٹے میں صوابدیدی اختیارات، صدر، وزیر اعظم، آرمی چیف اور گورنرز کا ڈیوٹی فری

درآمد کرنے کا استحقاق، اسپیشل امپورٹ، ایکسپورٹ پرمٹس اور سپیشل ایکسچینج پرمٹس شامل تھے۔

اسحاق ڈار نے سب سے پہلے ٹیکسٹائل کوٹہ ختم کیا۔ مرسڈیز گاڑیوں کی ڈیوٹی فری امپورٹ ختم کر دی گئی اور ساتھ ہی امپورٹ، ایکسپورٹ اسپیشل پرمٹس بھی بند کر دیے گئے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جب اس فیصلے کا اطلاق سب سے پہلے اس وقت کے صدر رفیق تارڑ اور آرمی چیف جنرل پرویز مشرف پر ہوا گو کہ ان سے پہلے جو بھی اقتدار میں آیا اس نے ڈیوٹی فری گاڑیاں ضرور منگوائیں۔ بقول ڈار کے نواز شریف نے دونوں دفعہ وزیر اعظم ہونے کے باوجود ڈیوٹی فری گاڑیاں نہیں منگوائیں۔

جونہی اسحاق ڈار نے صوابدیدی اختیارات کے تحت ٹیکسٹائل کوٹے کو ختم کیا ان سے طاقتور سیاستدان، بیوروکریٹس اور وہ بزنس مین ناراض ہو گئے جو ماضی میں ان مراعات سے فائدہ اٹھاتے رہے تھے۔ ملک میں ٹیکسٹائل کوٹے کی الاٹمنٹ نیلامی کے ذریعے کی گئی اور 3.3 بلین روپے میں یہ کوٹے بیچے گئے جبکہ بے نظیر بھٹو کے دور میں ان کوٹوں سے صرف 73 کروڑ روپے کمائے گئے تھے۔

جونہی ڈار کے اس فیصلے کا لوگوں کو پتہ چلا تو وہ دوڑے دوڑے نواز شریف کے پاس گئے اور ان کے خلاف شکایتوں کا ایک انبار لگا دیا گیا۔ تاہم، نواز شریف نے اسحاق ڈار کو کھل کر سپورٹ کی اور یوں 1998-99 میں آنے والی ٹریڈ پالیسی کے ذریعے سیاست میں کوٹوں کی کرپشن کو ختم کر دیا گیا۔

ایک دن نواز شریف نے اسحاق ڈار کو بلایا اور ان سے کہا کہ وہ انہیں سرتاج عزیز کی جگہ ملک کا نیا وزیر خزانہ مقرر کر رہے ہیں۔ اسحاق ڈار کے لیے یہ ایک نئی خبر تھی۔

میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ آخر نواز شریف نے سرتاج عزیز کو ہٹا کر ڈار کو وزیر خزانہ لگانے کا فیصلہ اچانک کیوں کر لیا تھا۔

اسحاق ڈار نے دھیرے دھیرے سے ان تمام رازوں سے پردہ اٹھانا شروع کر دیا تھا جن کی تلاش میں میں ان سے ملنے کے لیے ان کے پاس آیا تھا۔

جس دن پاکستان نے مئی 1998ء میں نیوکلیئر ٹیسٹ کیے اس کے ساتھ ہی پاکستان کے مالی معاملات بگڑنا شروع ہو گئے۔ اس وقت کی معاشی ٹیم کے لیے عالمی اداروں کی طرف سے لگائی گئی پابندیوں کے بعد معاملات کو سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ جس دن پاکستان نے نیوکلیئر بم کا تجربہ کیا اس

[illegible]

ڈار نے اس بات کا اعتراف کیا کہ نواز شریف حکومت کا یہ فیصلہ غلط تھا لیکن ان کا اس فیصلے میں ذاتی طور پر کوئی کردار نہیں تھا۔ جس دن یہ فیصلہ ہوا [illegible] اس دن نواز شریف نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا تھا۔ وہ اس سے پہلے ہی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب پرائم منسٹر ہاؤس چھوڑ کر چلے گئے تھے لہٰذا انہیں اس فیصلے کا پتہ صبح ہی چلا جب انہوں نے صبح کے اخبارات پڑھے۔ باقی باتیں تو چھوڑیں، کابینہ کے ممبران کو بھی یہ فیصلہ کرنے سے پہلے اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ ڈار نے اس بات کا انکشاف کیا کہ دراصل یہ فیصلے کرانے کے ذمہ دار اس وقت کے گورنر اسٹیٹ بینک یعقوب، سیکرٹری خزانہ معین افضل اور پاشا تھے [illegible]۔ ان سب نے مل کر نواز شریف اور سرتاج عزیز کو اس بات پر قائل کر لیا تھا کہ فارن کرنسی اکاؤنٹس کو منجمد کرنا بہت ضروری ہے۔

مجھ سے یہ ساری باتیں کر کے اسحاق ڈار نے فوراً ہی کہا اس میں سرتاج عزیز کا اتنا زیادہ

[illegible]

ڈار نے کہا کہ [illegible] Dollarisation of economy [illegible]

[illegible]

میں نے کہا کہ ڈار صاحب! یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ میں مان لیتا ہوں کہ سرتاج عزیز کا اس میں زیادہ قصور نہیں تھا لیکن مجھے ذرا یہ تو بتائیں کہ آخر اتنے بڑے سیکرٹ فیصلے کی بھنک کچھ خاص لوگوں تک پہلے سے کیسے پہنچ گئی تھی کہ انہوں نے راتوں رات اپنے بینکوں سے ڈالر نکلوا کر باہر شفٹ کر دیے تھے۔ ڈار صاحب بولے کیونکہ وہ اس وقت فنانس منسٹری نہیں چلا رہے تھے لہٰذا انہیں اس بات کی خبر نہیں ہے کہ اس طرح کی انفارمیشن کس طرح لیک ہوئی تھی۔ تاہم ڈار صاحب نے کہا کہ یہ بات ضرور تھی کہ نواز شریف اس بات پر بڑے برہم تھے کہ ان معاشی ٹیم نے فارن کرنسی اکاؤنٹس فریز کرا کر ان سے ایک بہت ہی غلط فیصلہ کرا دیا تھا۔ نواز شریف کی یہ برہمی ایک دن سرتاج عزیز کی فنانس منسٹری کی پوسٹ سے چھٹی پر جا کر ختم ہوئی۔ اگست 1998ء میں نواز شریف نے حفیظ پاشا کو سرتاج عزیز کی جگہ اپنا فنانس منسٹر مقرر کر دیا۔ حفیظ پاشا سے بھی معاملات نہیں سنبھالے گئے اور ڈالر کی قیمت 67 روپے تک چلی گئی۔ مارکیٹ میں یہ باتیں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں کہ دسمبر 1998ء تک ڈالر کی قیمت 100 روپے ہو

[illegible] پاکستان [illegible] ہو چکا تھا [illegible]
[illegible] نواز شریف نے ڈار صاحب کو [illegible]
[illegible] ستمبر [illegible]
[illegible] 1998ء کو جب ایٹمی دھماکوں [illegible] اس وقت پاکستان کے پاس
زرمبادلہ صرف 413 ملین ڈالر رہ گئے تھے۔ [illegible] اس ملک کے ذخائر [illegible] تھے جب کوئی بھی
[illegible] پاکستان کو قرضہ [illegible] ریٹنگ ایجنسیز
[illegible] ایجنسیاں کرتی تھیں۔ ان ایجنسیوں سے کسی
طور پر بھی [illegible] ایجنسیاں [illegible] لندن کلب کے ساتھ قرضوں کی ادائیگی
[illegible] کے حوالے سے تھیں۔ جب [illegible] تو انہوں نے اسلامک ڈویلپمنٹ بینک
کے ایک کنسورشیم کے ساتھ 1.5 بلین ڈالر قرضے کے لیے مذاکرات کیے تھے لیکن اس قرضے کے ساتھ
جو شرائط رکھی گئی تھیں وہ اتنی خوفناک تھیں کہ ڈار کے لیے انہیں تسلیم کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ قرضے پر مارک
اپ ریٹ لائبر 1.5% سے بڑھ کر 5% تک کیے گئے تھے۔ پاکستان سے کہا جا رہا تھا کہ وہ اپنے تین
بڑے اثاثے [illegible] بجلی پیدا کرنے کے پلانٹس قرضہ دینے والے بینک کے
پاس گروی رکھوا دے گی۔ اس سے بھی زیادہ خوفناک شرط یہ تھی کہ اس 1.5 بلین ڈالر کے قرضے میں
سے 1.2 بلین ڈالر واپس اسی کنسورشیم کے ان ممبران کو چلے جانے تھے جو قرضہ دے رہے تھے۔ یوں
درحقیقت پاکستان کے پاس صرف 300 ملین ڈالر آنے تھے لیکن پاکستان پر اس قرضے کی معیاد میں
مزید 600 ملین ڈالر کا اضافہ ہونا۔

ڈار نے اس پر کافی غور و فکر کیا اور آخر انہوں نے قلم اٹھا کر اس کاغذ پر لکیر پھیر دی جس پر یہ
ساری شرائط درج تھیں۔ ڈار نے 1.2 بلین ڈالر کے قرضے کو ری شیڈولنگ کرانے کے لیے مذاکرات
شروع کیے اور جون 1999ء میں وہ کامیاب ہو گئے۔

ڈار کے بقول سعودی [illegible] نواز شریف کو بہت پسند کرتے ہیں۔ [illegible] پاکستان
[illegible] سعودی عرب [illegible] ڈالر کا [illegible] پاکستان کو دینے پر رضامند ہو گیا۔
[illegible] صرف ایک شرط رکھی تھی کہ [illegible] آئی ایم ایف [illegible]

جائے گی کہ اس بات کا پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ سعودی عرب پاکستان کو مفت تیل دے رہا ہے کیونکہ اس
بارے میں جب پاکستان پر پابندیاں لگی ہوئی تھیں سعودی عرب کے لیے مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔
سعودی عرب کی اس شرط کا پتہ صرف سات لوگوں کو تھا جن میں نواز شریف، سرتاج عزیز، اسحاق ڈار،
شہباز شریف، حفیظ پاشا اور گورنر اسٹیٹ بینک یعقوب اور معین افضل شامل تھے۔ ان ساتوں شخصیات
سے یہ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ قومی مفاد میں اس راز کو راز رکھیں گے کہ سعودی عرب پاکستان کو دو ارب
ڈالر سالانہ کا مفت تیل فراہم کر رہا تھا۔

ابھی اس بات کو ایک دو ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ اسحاق ڈار کو جو ان دنوں لندن میں
نواز شریف کے ساتھ ستمبر 1999ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سیشن کو اٹینڈ کر کے واپس آ رہے
تھے، گورنر اسٹیٹ بینک یعقوب نے ٹیلی فون کیا اور جو بات انہوں نے اسحاق ڈار کو بتائی اسے سن کر وہ
ایک لمحے کے لیے سن ہو کر رہ گئے۔ ڈار کو بتایا گیا کہ آئی ایم ایف کی جو ٹیم اسلام آباد میں مذاکرات کے
لیے آئی ہوئی ہے اس کو فنانس منسٹری کی ٹیم نے نہ صرف سعودی عرب کے دو ارب ڈالر کے تیل کے
بارے میں بتا دیا ہے بلکہ پاکستانی روپے کو ڈالر کے مقابلے میں چار سے پانچ روپے کم کرنے کی بھی
منظوری دے دی ہے۔

یہ بات سن کر لندن میں موجود نواز شریف کا وفد سکتے میں آ گیا۔ نواز شریف نے اسحاق ڈار کو
کہا کہ وہ فوری طور پر واشنگٹن جائیں جہاں حفیظ پاشا ایک ٹیم لے کر آئی ایم ایف سے دوبارہ مذاکرات کر
رہے تھے۔ ڈار ایئرپورٹ سے اترتے ہی سیدھے آئی ایم ایف کے ایک ایشیائی ڈائریکٹر کے پاس
گئے جو پاکستان کے بڑے خیر خواہوں میں سے ایک تھے اور انہیں قسم دے کر پوچھا کہ آئی ایم ایف کو سعودی
تیل کے بارے میں کتنا کچھ علم ہے۔ پاکستان نے آئی ایم ایف کو یہ بتایا تھا کہ سعودی عرب نے یہ تیل
پاکستان کو ایک طرح کے ادھار پر دیا ہوا ہے۔ آئی ایم ایف کے اس ڈائریکٹر نے اسحاق ڈار کو بتایا کہ
جناب ڈار صاحب آپ کی فنانس منسٹری کے لوگوں نے ہمیں اسلام آباد میں اس راز سے آگاہ کر دیا
تھا جب آپ اپنے وزیراعظم کے ساتھ نیویارک گئے ہوئے تھے۔

میں نے اسحاق ڈار سے پوچھا کہ ان سات لوگوں میں سے کس نے [illegible]
[illegible] اسحاق ڈار نے مجھے [illegible]

ہو سکی۔ آپ امریکہ ... دسمبر 1998ء میں اس وقت کے [illegible]
پاکستان [illegible] بھی [illegible] تھی۔

میں [illegible] اسحاق ڈار کو [illegible] [illegible] [illegible] شریف حکومت [illegible] آئی ایم ایف نے انہیں ان کا انعام [illegible] دیا تھا۔

ڈار کی [illegible] نے اسحاق ڈار کو مجبور کیا کہ وہ امریکہ سے F-16 طیاروں کی رکی ہوئی رقم کی ادائیگیاں کرانے کے لیے بل کلنٹن حکومت پر دباؤ ڈالیں۔ 2 دسمبر 1998ء کو نواز شریف بل کلنٹن سے وائٹ ہاؤس میں ملے۔ ان کے ساتھ سرتاج عزیز، اسحاق ڈار، شہباز شریف اور مشاہد حسین بھی تھے۔ بل کلنٹن نے نواز شریف کو کہا کہ وہ F-16 کے باقی پیسوں میں سے ستر فیصد واپس لے لیں، باقی تیس فیصد امریکہ اپنے پاس رکھے گا اور اس معاملے کو یہیں ختم سمجھا جائے۔ اسحاق ڈار نے جب یہ آفر سنی تو وہ تیس فیصد نقصان کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ انہوں نے بل کلنٹن سے کہا کہ سر! جب یہ خبر پاکستان پہنچے گی کہ امریکہ نے پاکستان کے F-16 طیاروں کی تیس فیصد رقم بغیر کسی وجہ کے رکھ لی ہے تو اس کا کوئی اچھا اثر عوام پر نہیں ہو گا کیونکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بل کلنٹن اور نواز شریف اچھے دوست ہیں اور ایک دوست دوسرے کے ساتھ اس طرح کی ناانصافی نہیں کر سکتا۔

بل کلنٹن نے بڑی حیرانی سے اسحاق ڈار کی بات سنی اور بولے کہ امریکہ کی سپریم جوڈیشل کونسل نے انہیں جو ایوارڈ دیا تھا اس کے تحت وہ اتنا ہی انہیں آفر کر سکتے تھے اور اس سے زیادہ کا ان کے پاس اختیار نہیں تھا۔ کلنٹن نے بتایا کہ ان کے پاس کانگریس میں بھی اکثریت نہیں تھی جہاں سے وہ ہر بجٹ جوڈیشل کونسل کے فیصلے کے خلاف پاکستان کو F-16 طیاروں کی سو فیصد رقم کی واپسی کا فیصلہ کرا دیتی۔

ڈار نے تجویز پیش کی کہ اس کا دوسرا حل یہ ہے کہ اس وقت پاکستان کو گندم اور کارن کی بڑی اشد ضرورت ہے۔ ان دنوں حکومت پاکستان یہ دونوں چیزیں خریدنے کے لیے فنڈ مختص کر دی ہے لہٰذا

[illegible] امریکہ پاکستان کو 140 ملین ڈالر کی گندم اور کارن فراہم کرے گا۔

وزیر خزانہ بننے کے بعد ڈار کا کردار [illegible] زیادہ [illegible] ہو گیا تھا۔ ان کے پاس [illegible] معاہدے بھی آنے لگے ان کے لیے [illegible] ادائیگیاں کرانی تھیں۔ ایک دن [illegible] پتا چلا کہ اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف جہانگیر کرامت سوئٹزر لینڈ سے اینٹی ایئر کرافٹ گنز لینا چاہ رہے ہیں جس کے ساتھ پاکستان کا ایک بہت بڑا پروٹوکول وہاں موجود ہے جس کے تحت دونوں ممالک مشترکہ طور پر اینٹی ایئر کرافٹ گنز تیار کریں گے۔ اس معاہدے کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ تھی کیونکہ سوئٹزر لینڈ کے ایک مینوفیکچر نے حال ہی میں ترکی اور چین کے ساتھ اس طرح کے معاہدے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پروٹوکول کے تحت اگر پاکستان اس مینوفیکچر کو اینٹی ایئر کرافٹ گنز مینوفیکچر کرنے کا آرڈر دیتا تو وہ پاکستان میں بھی ان گنز کی تیاری شروع کر سکتے تھے۔

اسحاق ڈار کا خیال تھا کہ اگر اس معاہدے کو استعمال کرتے ہوئے پاکستان میں اینٹی ایئر کرافٹ گنوں کی تیاری شروع کرا دی جاتی تو بڑے آرام سے اس فوجی اسلحے کو چین اور ترکی جیسے ملکوں کو ایکسپورٹ کر کے کئی بلین ڈالر کمائے جا سکتے تھے۔ اسحاق ڈار نے سب سے پہلے سعودی عربیہ کے ساتھ بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ کراؤن پرنس عبداللہ اور ملائیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد سے بات چیت کی گئی۔ ان دونوں نے انتہائی مثبت جواب دیا اور کہا کہ اگر پاکستان میں اینٹی ایئر کرافٹ گنز کی تیاری شروع ہو گئی تو وہ یقیناً پاکستان کو بلین ڈالرز کے آرڈرز دیں گے۔

جب ڈار نے یہ ساری بات چیت سعودی عربیہ اور ملائیشیا سے شروع کی تو اس کے بعد جہانگیر کرامت اب کسی غیر ملکی مینوفیکچر کو نئی ایئر کرافٹ گنیں تیار کرنے کا آرڈر نہیں دے سکتے تھے لیکن مایوس کن افسوسناک بات یہ ہوئی کہ جنرل جہانگیر کرامت نے ان گنوں کی تیاری کا آرڈر ہیوی مکینیکل کمپلیکس کو بھی نہیں دیا جس سے پاکستان کو اچھا خاصا نقصان ہوا کیونکہ ان گنوں کو سوئٹزر لینڈ کی مدد سے تیار کر کے سعودی عرب، ملائیشیا اور دیگر ممالک کو ایکسپورٹ کیا جا سکتا تھا۔

میں ڈار سے پوچھنے کے لیے بے چین تھا کہ آخر کارگل آپریشن پر کون جھوٹا اور کون سچا تھا۔ [illegible] پہلے چوہدری شجاعت نے مجھے ہی ایک انٹرویو دے کر پاکستانی سیاست میں ایک نئی بحث

پہنچا دی تھی کہ کارگل آپریشن [illegible]۔ بھارت کے [illegible] جنرل مشرف نے یہ آپریشن
نواز شریف سے [illegible] میں نے یہ سوال اسحاق ڈار سے [illegible]
[illegible] کارگل کی جنگ [illegible]۔

ڈار نے مجھے [illegible] کارگل کے [illegible] کے متعلق [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] 1999 میں جنرل مشرف نے [illegible] اسحاق ڈار [illegible]
[illegible] ایک [illegible]
[illegible] نواز شریف کی سربراہی میں منعقد کی گئیں جن
میں جنرل [illegible] کے علاوہ [illegible] نے بھی شرکت کی
جس میں [illegible] بھی شامل تھے۔ اب یہ فیصلہ کیا گیا کہ نواز شریف
[illegible] امریکہ جائیں گے جہاں وہ کلنٹن سے ملاقات کر کے بھارت سے [illegible] ایک
[illegible] کریں گے [illegible] کے لیے [illegible] گئیں۔

ڈار کہتے ہیں کوئی شک نہیں تھا کہ نواز شریف صرف فوج کو بچانے کے لیے امریکہ گئے
تھے۔ جنرل مشرف [illegible] پاکستان اور بھارت کے درمیان کارگل سے پیدا ہونے والی صورتحال کو
[illegible] کے لیے امریکہ کی مدد چاہتے تھے۔

میں نے کہا کہ ڈار صاحب! [illegible] بات بھی کریں گے۔ پہلے یہ بتائیں کہ کیا نواز شریف کو
کارگل آپریشن کے بارے میں پہلے [illegible] تھا؟

ڈار نے [illegible] سے کہا [illegible]۔

ڈار نے [illegible] بات [illegible] کہ [illegible] کارگل
آپریشن کی [illegible] تھی۔ نواز شریف [illegible] آپریشن کے بارے

[illegible] کی تھی۔

ڈار نے [illegible] کارگل آپریشن شروع کرنے سے پہلے [illegible]
[illegible] نواز شریف سے کارگل آپریشن [illegible]
کارگل آپریشن [illegible] جنرل مشرف نے شروع کیا [illegible]
[illegible] کارگل آپریشن [illegible]
[illegible] جنرل مشرف [illegible]
[illegible] نواز شریف نے [illegible] جنرل صاحب [illegible] آپ مجھے [illegible]
مجھے اس آپریشن کے بارے میں [illegible]۔

ڈار نے کہا کہ نواز شریف صرف اور صرف جنرل مشرف کی [illegible]
گئے تھے۔ [illegible] کہ نواز شریف [illegible]
[illegible] اور خلوص سے فوج کی عزت بچانے کی کوشش کی تھی۔ نواز شریف [illegible]
بچانا چاہتے تھے جو کارگل کے محاذ پر لڑ رہے تھے۔ [illegible] اسحاق ڈار [illegible]
انہوں نے کہا کہ اگرچہ انہیں اس بارے میں بہت کچھ علم تھا لیکن وہ کارگل پر اس سے زیادہ گفتگو نہیں
کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ باقی باتیں وہ کسی جوڈیشل کمیشن کے سامنے کر سکتے ہیں کیونکہ اس طرح
کی باتیں اس طرح افشا کیے گئے تو شاید پاکستان کے مفاد میں نہ ہوں۔

میں نے کہا ڈار صاحب! یہ تو بتائیں کہ جنرل مشرف کو آرمی چیف کے عہدے سے کیوں ہٹایا
جا رہا تھا؟

ڈار نے گہری سانس لی اور بولے کہ نواز شریف کی جنرل مشرف سے تلخی کے پیچھے کئی [illegible]
تھے۔ ایک دن کراؤن پرنس عبداللہ نواز شریف کی درخواست پر پاکستان تشریف لائے۔ نواز شریف نے
ان سے درخواست کی تھی کہ وہ پاکستان سے فوجی ساز و سامان خرید لیں۔ کراؤن پرنس کے لیے ایک
نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں اسحاق ڈار بھی شامل تھے۔ چیف آف آرمی سٹاف مشرف نے ایک
[illegible] کا معیار [illegible] کہ پاکستان سعودی عرب کو اس بات پر قائل نہیں کر سکا کہ وہ
[illegible] کا آرڈر دے۔ مشرف نے سعودی بادشاہ کو بتایا کہ پاکستان نے پچھلے ایک سال میں

صرف چند منٹوں کا کام رہ جاتا ہے۔ یہ وہ میٹنگ تھی کہ نواز شریف خاصے ناراض ہوئے تھے۔

ایک اور میٹنگ کا ذکر کرتے ہوئے [illegible] نواز شریف کو بلایا گیا۔ اس میں اسحاق ڈار اور سرتاج عزیز بھی شامل تھے۔ اس میٹنگ میں جنرل مشرف نے نواز شریف سے درخواست کی کہ وہ ایک ایکسٹینشن دے دیں۔ اس کو آج تک [illegible] سے منسوب کیا جاتا ہے۔ جنرل مشرف نے اس میٹنگ میں یہ بھی درخواست کی کہ آرمی چیف ہونے کے ساتھ ساتھ ان کو جوائنٹ چیفس آف سٹاف کا عہدہ بھی دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جنرل مشرف یہ عہدہ بھی اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔

ڈار مجھے بتاتے رہے کہ جب جنرل مشرف اور نواز شریف میں اختلافات زیادہ ہونا شروع ہوئے تو ایک دن جنرل مشرف ابا جی میاں صاحب سے ملنے رائے ونڈ پہنچ گئے۔ اس سے پہلے وہ شہباز شریف کو جولائی 1999ء میں یہ پیشکش بھی کر چکے تھے کہ وہ اسلام آباد آ جائیں اور وزیر اعظم کے مشیر کے طور پر کام کریں کیونکہ اس سے ان کے بھائی کی فیڈرل حکومت کی کارکردگی بہت بہتر ہو جائے گی۔ ڈار نے انکشاف کیا کہ جنرل مشرف کی رائے ونڈ یاترا کے بعد انہیں چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف بنا دیا گیا۔ نواز شریف اور جنرل مشرف کے درمیان اختلافات اس وقت شدت اختیار کر گئے جب جنرل مشرف نے [illegible] وزیر اعظم سے ملتے تھے۔ 10 اکتوبر کو ڈار کی نواز شریف سے لاہور میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے وزیر اعظم کو شدید پریشان دیکھا۔ [illegible] نواز شریف سے ملا تھا۔

[illegible] جنرل مشرف [illegible]

ہیں۔ 12 اکتوبر کا واقعہ ہونے کی وجہ سے فوری طور پر [illegible] اور آرمی [illegible] کو ایک دوسرے میں ضم نہ کیا جا سکا۔

میں نے پوچھا کہ ڈار صاحب 12 اکتوبر کو کیا ہوا تھا؟

ڈار صاحب نے گہرا سانس لیا اور بولے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس دن وہ شاید ایسے وزیر تھے جنہیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان کے دفتر کے باہر کیا ہو رہا ہے اور ان کی سیاسی حکومت کب کی ختم ہو چکی ہے۔ انہیں پاکستان میں فوجی بغاوت کا علم شام کو پونے آٹھ بجے ہوا۔ وہ چھ بجے سے کاٹن گروورز، اپٹما، ایم این ایز اور دیگر لوگوں کے ساتھ کپاس کی قیمتیں طے کرنے کے لیے ایک میٹنگ میں مصروف تھے۔ اس میٹنگ میں شہباز شریف نے بھی شریک ہونا تھا تاہم آخری لمحے تک ان کی سیٹ خالی رہی کیونکہ وہ اس میٹنگ میں نہیں پہنچ سکے تھے۔ ساڑھے چھ بجے اسحاق ڈار نے اپنے سیکرٹری سے کہا کہ وہ پرائم منسٹر ہاؤس فون کر کے شہباز شریف کا پتہ کریں۔ انہیں بتائیں کہ میٹنگ شروع ہو چکی ہے لہٰذا وہ جلدی سے آ جائیں۔ تاہم سیکرٹری کو بتایا گیا کہ شہباز شریف وزیر اعظم نواز شریف کے ساتھ میٹنگ میں ہیں۔ ان سے اس وقت بات نہیں ہو سکتی ہے۔ میٹنگ جاری رہی۔ خاصی دیر بعد اچانک ایک ایڈیشنل سیکرٹری کمرے میں داخل ہوئے اور سیدھے اسحاق ڈار کے پاس گئے اور ان کے کان میں سرگوشی کی کہ ملک پر فوج نے قبضہ کر لیا ہے۔ غیر ارادی طور پر اسحاق ڈار نے جب یہ خبر اس میٹنگ میں شریک لوگوں کو سنائی تو ان سب کے لیے یہ ایک بم شیل تھا۔ ماسوائے ایڈیشنل سیکرٹری، پرسنل سیکرٹری اور پرائیویٹ سٹاف کے باقی سارے لوگ کمرہ چھوڑ کر بھاگ گئے اور اسحاق ڈار کھڑے ہو کر ان سب لوگوں کو اس طرح وہاں سے بھاگتے ہوئے دیکھتے رہے۔

چار سال بعد مجھے اس لمحے کی روداد سناتے ہوئے بھی اسحاق ڈار کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ [illegible] کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا۔ ڈار نے بتایا کہ جولائی 1999ء میں [illegible] میٹنگ میں جنرل مشرف نے ان کی [illegible] تعریف کی تھی [illegible] اسحاق ڈار نے ملک میں جاری [illegible] کے لیے دی تھی۔ جنرل مشرف انہیں [illegible] کے لیے دفتر آئے۔ ڈار صاحب کو [illegible] جاتے ہیں۔

انہیں گھر سے نکلتے وقت سکول جانے سے پہلے تلاشی کے مراحل سے گزرنا پڑتا۔ گھر کی خواتین کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔

"کیا میں غدار تھا؟" اسحاق ڈار نے بڑی تلخی سے مجھ سے سوال پوچھا۔

میں چپ رہا۔

25 اپریل سے لے کر 9 دسمبر 2000 تک فوج نے اسحاق ڈار سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ وہ اپنے گھر میں قید رہے۔ آخر ایک دن لیفٹیننٹ جنرل محمود ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر لاہور آئے۔ جنرل محمود نے ڈار صاحب کو بتایا کہ جنرل مشرف کے بعد اگر کوئی سب سے مصروف شخص تھا تو وہ تھے لیکن پھر بھی وہ ان سے ذاتی طور پر ملنے لاہور آئے ہیں۔ جنرل محمود نے اسحاق ڈار کو بتایا کہ آرمی کی ہائی لیڈرشپ ان کی ملک کے لیے کی گئی خدمات کو سراہتی ہے اور وہ جاننا چاہتے تھے کہ ڈار صاحب کے اب سیاسی منصوبے کیا ہیں۔ اسحاق ڈار نے طنزیہ لہجے میں جنرل محمود کو جواب دیا کہ جی ہاں! آپ درست فرماتے ہیں اس ملک کے لیے کی گئی خدمات ہی کا انعام مجھے 12 اکتوبر کے بعد قید میں ڈال کر دیا گیا تھا۔

جنرل محمود نے وضاحت کی کہ اصل میں ڈار صاحب کو نواز شریف کے سب سے زیادہ قریب سمجھا جاتا تھا [illegible] کہ سب کا خیال تھا کہ یہ شخص ہی تھا کہ اسحاق ڈار سے [illegible]

ڈار صاحب نے جنرل محمود کو بتایا کہ [illegible]

جنرل محمود نے ڈار صاحب کو بتایا کہ [illegible] اس لیے وہ ذاتی طور پر ملنے کے لیے ان کے گھر آئے ہیں۔ [illegible] جنرل مشرف کا بھی یہی پیغام ہے۔

جنرل محمود نے ڈار صاحب سے کہا کہ وہ نواز شریف کو چھوڑ دیں۔

25 دسمبر 2000 کو آئی ایس آئی پنجاب کے چیف نے ڈار صاحب کو مطلع کیا کہ 27 دسمبر کو انہیں اور مشاہد حسین کو رہا کر دیا جائے گا۔ ڈار صاحب کو کہا گیا کہ وہ یہ بتائیں کہ 28 دسمبر کو عید کی نماز کہاں پڑھنا پسند کریں گے تاکہ ان کے لیے سکیورٹی کا انتظام کیا جا سکے۔

اگلے دن 26 دسمبر کو ایک آئی ایس آئی آفیسر میاں محمد اظہر کو ان سے ملوانے کے لیے لے آئے۔ اسحاق ڈار کو یوں محسوس ہوا کہ ملک کا وزیر اعظم ان سے ملنے کے لیے گھر آیا ہے۔ میاں اظہر کو اس طرح پروٹوکول دیا گیا جا رہا تھا جیسے وہ اس وقت ملک کے وزیر اعظم ہوں۔ میاں اظہر بھی ایسے ہی ایکٹ کر رہے تھے جیسے وہ واقعی بغیر حلف اٹھائے اس ملک کے وزیر اعظم تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع کیے بغیر میاں اظہر نے اسحاق ڈار کو کہا کہ وہ جنرل مشرف کے زیر سایہ بننے والی سیاسی پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ اسحاق ڈار نے انکار کیا اور میاں اظہر کو یاد دلایا کہ ان دونوں کو سیاست میں لانے والے نواز شریف تھے اور اس وقت نواز شریف کو چھوڑنا مناسب نہیں ہوگا۔

اسحاق ڈار کا انکار سن کر میاں اظہر نے ایک لمبی وضاحت پیش کی کہ انہوں نے نواز شریف کو کیوں چھوڑا تھا۔ میاں اظہر نے ڈار کو بتایا کہ ان کے پاس آنے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ جنرل مشرف انہیں ذاتی طور پر پسند کرتے ہیں۔ میاں اظہر نے جب بات بنتے نہیں دیکھی تو انہوں نے اسحاق ڈار پر طنز کیا کہ جناب! اب نواز شریف ڈیل کر کے سعودی عرب جا رہے تھے تو ایک لمحے کے لیے بھی انہوں نے اسحاق ڈار اور دیگر ساتھیوں کا نہیں سوچا اور آج وہ بیٹھے نواز شریف سے وفاداری کا راگ الاپ رہے ہیں۔ میاں اظہر دو گھنٹے تک اسحاق ڈار کے ساتھ رہے اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن بات نہیں بنی تو لوٹ گئے۔

میاں اظہر نے جا کر جنرل مشرف کو ان کے خلاف انتہائی سخت رپورٹ پیش کی۔ فروری 2001 میں [illegible] طارق بٹ نے یہ ساری رپورٹ اخبار میں شائع کر دی۔

یہ رمضان کا آخری روزہ تھا۔ ڈار صاحب ابھی افطاری سے فارغ ہوئے تھے کہ کسی نے آ کر بتایا کہ ان کے لیے جدہ سے ٹیلی فون کال ہے۔ فون پر دوسری طرف نواز شریف تھے۔ نواز شریف نے جنرل محمود کے خلاف سخت الفاظ استعمال کیے اور ڈار صاحب کو بتایا کہ اس پنجابی جرنیل نے ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ ڈار نے بھی نواز شریف کی ہاں میں ہاں ملائی۔

اسحاق ڈار کو پتہ نہیں تھا کہ ان کی ٹیلی فون پر ہونے والی ساری گفتگو ریکارڈ کی جا رہی تھی۔ نواز شریف کی اس کال کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہیں اس رات رہا کرنے کے بجائے مزید آٹھ مہینے تک گھر پر قید رکھا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ جنرل محمود کو نواز شریف اور اسحاق ڈار کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کا ٹرانسکرپٹ پیش کیا گیا تھا۔ ڈار کے خیال میں ان کے ساتھ ہونے والی تمام زیادتیوں کے ذمہ دار جنرل محمود تھے ورنہ انہیں جنرل امجد کے ساتھ 20 اپریل کو ہونے والی میٹنگ کے بعد رہا کیا جا رہا تھا۔

اپنی رہائی کے بعد اسحاق ڈار نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے ٹیلی فون اٹھایا اور جنرل امجد کو فون کیا جو اس وقت نیب سے ہٹا کر کور کمانڈر ملتان لگا دیے گئے تھے۔ اسحاق ڈار نے انہیں سچ سچ میں بتایا کہ قیامت والے دن خدا کے سامنے ان کا گریبان پکڑ کر ضرور انصاف مانگیں گے کیونکہ 20 اپریل کے بعد ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے وہ ذمہ دار تھے۔ جنرل امجد یہ بات سن کر تھوڑے سے نرم ہوئے۔ انہوں نے اسحاق ڈار کو ملتان آنے کی دعوت اور ساتھ یہ بھی کہا کہ 20 اپریل کے بعد ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے وہ ذمہ دار نہیں تھے۔

جب اسحاق ڈار قید میں تھے تو انہیں کچھ سینئر ملٹری آفیسروں نے یہ مشورے دیے تھے کہ وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ ڈار صاحب کا خیال تھا کہ جنرل محمود ان کے اور چوہدری نثار کے خلاف دل میں کوئی ذاتی بغض رکھتے ہیں اس لیے ان دونوں کی رہائی نہ ہونے میں ان کا اہم کردار تھا۔

مجھے پتہ تھا کہ اسحاق ڈار کے بیٹے کی منگنی نواز شریف کی بیٹی سے تازہ تازہ ہوئی تھی لہذا اگر کوئی شخص میاں صاحبان کے قریب ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا تو وہ ڈار صاحب تھے۔ لہذا اندر کی باتیں یقیناً انہیں پتہ ہوں گی۔

میں نے کہا کہ ڈار صاحب! آخر نواز شریف اور جنرل مشرف کے درمیان یہ ڈیل کیسے اور کیونکر ہوئی تھی کہ وہ پاکستان چھوڑ کر چلے گئے۔

ڈار صاحب نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا اور پھر رازوں پر سے پردہ اٹھانا شروع کیا۔

سعودی کراؤن پرنس عبداللہ نواز شریف کو پسند کرتے تھے اور ان کی رہائی کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ شاہ عبداللہ کی نواز شریف کے لیے پسندیدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ریاض

میں ہونے والی ایک میٹنگ کے دوران کراؤن پرنس نے نواز شریف کو اپنا بھائی کہہ کر بلایا تھا۔ دوسرے آج بھی سعودی عرب خصوصاً اور باقی مسلم دنیا عموماً ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی سے نہ بچانے پر اپنے آپ کو مجرم سمجھتی ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ نواز شریف کا انجام بھی بھٹو کی طرح ہو۔ سعودی عرب نے پہلے قطر کے وزیر خارجہ سے کہا کہ وہ جنرل مشرف کی فوجی حکومت سے رابطہ کریں اور نواز شریف کی رہائی کے لیے مذاکرات شروع کریں۔ قطر کے وزیر خارجہ نے سعودی عرب کو بتایا کہ جنرل مشرف کی حکومت نواز شریف کو رہا کرنے پر تیار نہیں تھی۔ شاہ عبداللہ نے ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے لبنان کے وزیر اعظم رفیق حریری سے بات کی اور ساتھ میں اپنے بیٹوں کو ان کے ساتھ لگایا کہ وہ پاکستان کی فوجی حکومت سے کوئی ڈیل طے کریں۔ تاہم بات پھر بھی نہیں بن رہی تھی۔ جب سعودی قیادت نے یہ دیکھا کہ جنرل مشرف کسی حوالے سے بھی کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہیں تو آخر ایک دھمکی اسلام آباد کو بھیجی گئی کہ آج کے بعد وہ اب ادھار اور مفت میں دیا جانے والا تیل بند کر دیا جائے گا اگر انہوں نے نواز شریف کو رہا نہ کیا۔

جو کام قطر کا وزیر خارجہ، لبنان کا وزیر اعظم اور سعودی شاہ کے اپنے بیٹے بھی نہیں کر سکے تھے وہ ادھار کی اس دھمکی نے کر دکھایا۔

ان مذاکرات میں پہلی کامیابی اس وقت ہوئی جب جنرل مشرف نے سعودیوں سے کہا کہ وہ شریف فیملی کے چاروں افراد سے یہ کہیں کہ وہ ملک سے اپنا میڈیکل علاج کرانے کے لیے جانا چاہتے ہیں۔ یوں اس درخواست پر نواز شریف اور ان کی فیملی کو میڈیکل گراؤنڈز پر ملک سے باہر بھیجا گیا۔

برسوں بعد جب اسحاق ڈار نواز شریف سے جدہ میں ملے تو نواز شریف نے انہیں بتایا کہ انہوں نے جنرل مشرف سے کوئی براہ راست ڈیل نہیں کی تھی۔ جنرل مشرف ابھی بھی سعودی حکمرانوں سے یہ درخواست کرتے رہتے تھے کہ وہ شریف فیملی کو سعودی عرب سے کہیں نہ جانے دیں۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستانی ایمبیسی کو بھی منع کر دیا گیا تھا کہ وہ شریف فیملی کے لوگوں کے پاسپورٹ کی تجدید نہ کریں تاکہ وہ وہاں سے باہر نہ جا سکیں۔

ڈار صاحب کے بقول سعودی حکمرانوں نے پہلے دن ہی پاکستان کی فوجی قیادت کو ایک بڑا سخت پیغام بھیجا تھا کہ نواز شریف کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ ڈار صاحب نے دعویٰ کیا کہ یہ ساری ڈیل سعودیوں نے جنرل مشرف سے خود طے کی تھی۔ نواز شریف اس پوزیشن میں ہرگز نہیں تھے کہ وہ جیلوں

[illegible]

میں نے [illegible] صاحب سے پوچھا کہ [illegible] نواز شریف سے جنرل مشرف کے ساتھ [illegible]

[illegible]

میں نے [illegible] صاحب سے پوچھا کہ ان کے بیٹے کی نواز شریف کی بیٹی سے شادی کیسے ہوئی تھی۔

وہ [illegible] 2000 میں [illegible]

میں نے پوچھا کہ [illegible] صاحب آپ کے خیال میں نواز شریف حکومت کی سب سے بڑی غلطی کیا تھی [illegible]

میں نے [illegible] صاحب سے آخری سوال پوچھا کہ ان کی زندگی میں سب سے بڑا نقصان [illegible]

فیصل صالح حیات

فیصل صالح حیات سے میری پہلی ملاقات 2002ء کے انتخابات کے بعد میر ظفر اللہ جمالی کی حکومت بننے کے بعد ہوئی تھی جس میں وہ پیپلز پارٹی کو [illegible] کے بعد چھوڑ کر جنرل مشرف کے ساتھ مل گئے تھے۔ اس وقت وہ جنرل مشرف کی حکومت کے وزیر داخلہ تھے۔

میری ان سے ملاقات پارلیمنٹ کے کیفے ٹیریا میں ہوئی تھی جہاں وہ بہت سارے صحافیوں میں گھرے بیٹھے ان کے تیز و تند سوالات کے جواب دے رہے تھے۔ وہ پیپلز پارٹی کو توڑ کر بنائے گئے پیٹریاٹ گروپ کے خلاف میری خبروں سے بڑے ناراض تھے۔ مجھے ان کی ناراضگی کا پتہ جنگ گروپ کے مالک میر شکیل الرحمن صاحب کے مجھے کیے گئے ٹیلی فون سے چلتا رہتا تھا۔ میر صاحب نے دو تین دفعہ یہ بات کی تھی کہ فیصل صالح حیات میری رپورٹنگ کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں۔

جب میں نے فیصل صالح حیات کو پارلیمنٹ کے کیفے ٹیریا میں دیکھا تو سوچا کہ جا کر ان سے ملتا ہوں اور ان کا نقطہ نظر جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں خوشگوار موڈ کے ساتھ ان کی میز پر گیا۔ وہ مجھے شکل سے نہیں پہچانتے تھے۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا۔ انہوں نے مجھے کوئی خاص اہمیت نہیں دی جس سے مجھے تھوڑا سا جھٹکا لگا کہ کیا وہ واقعی مجھے نہیں جانتے تھے یا جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے تھے یا پھر ان کے خیال میں جو وہ [illegible] جنگ گروپ کے مالک میر شکیل الرحمن کو براہ راست فون کر کے اس کے

[illegible] کے خلاف [illegible] ایک [illegible] لگانے کی کیا ضرورت تھی۔

میں نے ان دونوں [illegible] شروع کی تھی اور ضرورت سے زیادہ [illegible] [illegible] شروع ہوتی ہے اور [illegible] ضرورت سے زیادہ [illegible] آپ [illegible] شروع کر دیتے ہیں۔ [illegible] [illegible] لیتے ہیں کہ شاید اس سے [illegible] [illegible] فیصل صالح حیات سے کسی بات پر [illegible] شروع کر دی جس سے [illegible] ہو گی۔

فیصل نے گفتگو [illegible] کرتے ہوئے مجھے کہا کہ آپ اب تک [illegible] سے سیاسی گروپ [illegible] کسی وقت میرے پاس آ کر [illegible] [illegible] کے بعد [illegible]

میں نے فیصل صالح حیات کی اس بات سے اتفاق کیا کہ ایک [illegible] کے لیے ضروری ہے کہ [illegible] کے لیے [illegible] ایک [illegible] ہے۔

[illegible] فیصل صالح حیات [illegible] اس سے [illegible] [illegible]

اس [illegible] ایک [illegible] مجھے [illegible] شروع ہو گئے [illegible] فیصل صالح حیات [illegible] [illegible] اقتدار علی بھٹو [illegible]

میں نے [illegible] فیصل صالح حیات سے کہا [illegible] لوگوں کے پاس [illegible] ہوتا ہے۔

فیصل صالح حیات نے [illegible] مجھے کہا کہ [illegible]

میں نے [illegible] اقتدار علی بھٹو [illegible]

فیصل صالح حیات نے [illegible] کرتے ہوئے مجھے کہا کہ مجھے اس بات پر

[illegible] کہ ابھی اس وزارت کو میر [illegible] اقتدار علی بھٹو چلا رہا تھا۔

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے فیصل سے پوچھا کہ وہ سیاست میں کیسے داخل ہوئے۔ ان کا جواب سن کر مجھے حیرانی ہوئی کہ کبھی وہ لاہور میں اسلامی جمعیت طلباء کے رکن تھے۔ بعد میں فیصل صالح حیات کو محسوس ہوا کہ وہ اس مذہبی جماعت کے تحت ماحول میں سیاست نہیں کر سکتے۔ انہوں نے طالب علموں کے ایک انقلابی گروپ [illegible] کو جائن کر لیا جس کے خیالات [illegible] ان کے اپنے مذہبی اور [illegible] سے ہرگز نہیں ملتے تھے۔

[illegible] وہاں سے فارغ ہوئے تو 1977ء میں فیصل صالح حیات نے پیپلز پارٹی جائن کر لی۔ پارٹی کے ٹکٹ پر [illegible] جیتا لیکن انہیں پارلیمنٹ میں بیٹھنے کے لیے [illegible] سال انتظار کرنا پڑا کیونکہ جنرل ضیاء نے اس ملک پر مارشل لاء لگا دیا تھا۔

نصرت بھٹو فیصل صالح حیات کو بہت پسند کرتی تھیں کیونکہ وہ مرتضیٰ بھٹو کے کلاس فیلو تھے۔ فیصل کے والد [illegible] کرنل [illegible] تھے اور وہ بھٹو صاحب کے ایک طرح سے [illegible] تھے۔ [illegible] فیصل بھٹو فیملی کے بہت قریب تھے۔

فیصل صالح حیات کے لیے نصرت بھٹو کی پسندیدگی کی وجہ سے ان کا گھر میں آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ بیگم بھٹو ایک زبردست شخصیت کی مالک تھیں اور دل کی بہت اچھی تھیں۔ بینظیر بھٹو اور فیصل صالح تقریباً ایک دوسرے کے ہم عمر تھے لہٰذا ان کی بہت جلد ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی ہو گئی۔ دونوں نے اپنا [illegible] ایک ہی پارٹی سے اس وقت شروع کیا تھا جب پارٹی اپنی تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہی تھی۔ ان دونوں نے ایک ساتھ سیاست سیکھی جب جنرل ضیاء الحق [illegible] طاقت پر اس ملک پر حکومت کر رہے تھے۔ دونوں خاندانوں کے سیاسی تعلقات بہت جلد خاندانی تعلقات میں داخل ہو گئے۔ بھٹو صاحب بھی فیصل کو پسند کرتے تھے۔ ان دونوں خاندانوں کے درمیان جاری یہ تعلقات اٹھائیس سال بعد اس وقت ختم ہوئے جب فیصل صالح حیات نے 2002ء کے انتخابات کے بعد بینظیر بھٹو کے خلاف یہ کہہ کر بغاوت کی کہ وہ چھوٹے موٹے مفادات کے لیے اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھیں۔ فیصل کے خیال میں ان کے اور بی بی کے درمیان جو چیز مشترک تھی وہ جنرل ضیاء کے خلاف جدوجہد اور جمہوریت کی بحالی تھی۔

ایک بات میں نے محسوس کی کہ بینظیر بھٹو کو چھوڑنے کے بعد بھی فیصل کے دل میں ان کے لیے احترام موجود تھا۔ ان کے خیال میں بینظیر بھٹو ایک شاندار انسان اور لیڈر تھیں۔ فیصل کے خیال میں بینظیر بھٹو کی سیاست کو سمجھنے کے لیے ضروری تھا کہ 1988ء سے پہلے کی بینظیر بھٹو اور اس کے بعد کی بینظیر کو ایک دوسرے سے جدا کر کے دیکھیں جس سے یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ کیسے ایک دور میں بینظیر بھٹو میں اتنی تبدیلیاں آ گئی تھیں کہ وہ ایک دن اسٹیبلشمنٹ کے آگے جھک گئیں۔

بینظیر بھٹو یہ بات بھول گئی تھیں کہ لوگ پیپلز پارٹی سے اس لیے پیار کرتے تھے کہ یہ اینٹی اسٹیبلشمنٹ پارٹی تھی۔ یہ ایک ایسی پارٹی تھی جو اپنی ابتدا میں لبرل، سیکولر اور ماڈرن تھی اور پاکستان کے لیے ایک جدید جمہوری معاشرے کی خواہاں تھی۔ ان اصولوں کے خواب حاصل کرنے کے رومانس میں پیپلز پارٹی کے ورکرز نے اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں بے پناہ اذیتیں برداشت کیں لیکن اسٹیبلشمنٹ نے بینظیر بھٹو پر ایسا چکر چلایا کہ وہ ان کے ساتھ کمپرومائز کرنے پر تیار ہو گئیں اور یوں ان لوگوں کی آنکھوں میں خواب مرجھا گئے جنھوں نے ان کی تکمیل کے لیے ایک لمبی جنگ لڑی تھی۔

فیصل نے کہا کہ وہ یہ بات مانتے ہیں کہ سیاست میں کمپرومائزز کرنا پڑتے ہیں لیکن ایک اچھے سیاستدان کو ایک سیانا کمپرومائز اور اندھا دھند کمپرومائز میں ایک لکیر کھینچنی پڑتی ہے۔ ہم سیاست میں ساری عمر ایسا ان دونوں کمپرومائزز کے درمیان بیلنس کرتے رہتے ہیں۔ لیڈرز کو کبھی اپنے بنیادی اصولوں اور پالیسیوں پر کمپرومائز نہیں کرنا چاہیے۔ فیصل کے بقول پیپلز پارٹی کو 1988ء میں حکومت نہیں لینی چاہیے تھی اور یہ بہت بڑی غلطی تھی کیونکہ پیپلز پارٹی نے پہلی دفعہ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ بہت بڑا کمپرومائز کیا تھا۔ جمہوریت کے لیے اتنے برس قربانی دینے کے بعد اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ اتنا اندھا کمپرومائز پارٹی کو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اتنے بڑے کمپرومائز کے بدلے میں پیپلز پارٹی کو کچھ بھی نہیں ملا۔ اس وقت کی انتظامیہ نے پیپلز پارٹی کو فری ہینڈ نہیں دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے حکومت چلا سکتی۔ پیپلز پارٹی حکومت ہر وقت یہ بات ثابت کرنے میں لگی رہی کہ وہ اینٹی اسٹیبلشمنٹ پارٹی نہیں ہے اور اسی چکر میں وہ اپنے خواب، ویژن اور کمٹمنٹ کھو بیٹھی۔ فیصل نے مجھ سے پوچھا کہ آپ مجھے بتائیں کہ اگر پارٹی قیادت خود ہی اس طرح کے کمپرومائز کر کے ایک مثال قائم کرے گی تو پھر آپ اس پارٹی کے رہنماؤں سے کیا توقع کرتے ہیں کہ وہ اصولوں کی سیاست کریں گے۔

فیصل کے بقول بھٹو ازم اور پارٹی کی نظریاتی بنیادیں اسی دن ہی ختم ہو گئی تھیں جس دن 1988ء میں بینظیر بھٹو نے اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ کمپرومائز کیا تھا۔ اس کمپرومائز سے سارے پارٹی لیڈروں کو یہ پیغام بھیجا گیا کہ پارٹی اب اقتدار میں پہنچنے کے لیے روایتی سیاست کے بجائے عملی سیاست کرے گی۔ اگرچہ تمام سیاستدانوں کا آخری مقصد اقتدار میں پہنچنا ہوتا ہے لیکن یہ مقصد اگر پاکی سے حاصل کیا جائے تو بہتر ہے نہ کہ اپنی پارٹی کی طاقت کو ختم کر کے جیسا کہ بینظیر بھٹو اور ان کی پارٹی نے کیا تھا۔ جس دن بینظیر بھٹو نے یہ کمپرومائز کیا اسی دن ہی پیپلز پارٹی کا امیج ایک پراگریسو اور لوگوں کی جماعت کے طور پر ختم ہو گیا تھا۔ 1977ء سے لے کر 88ء تک پیپلز پارٹی نے اینٹی اسٹیبلشمنٹ سیاست کی لیکن راتوں رات اس پارٹی نے اتنا بڑا یوٹرن لیا کہ لوگ حیران ہو کر رہ گئے۔ جب آپ نے ایک دفعہ کمپرومائز کر لیا تو پھر اس کے بعد ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اور پھر چل سو چل۔

فیصل نے دعویٰ کیا کہ وہ ان چند سیاسی ورکروں میں سے ایک تھے جو بینظیر بھٹو کو 1986ء میں پاکستان واپس لائے تھے۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح پتہ تھا کہ پیپلز پارٹی نے 1988ء میں کسی کو مجبور کر کے الیکشن نہیں کرائے تھے۔

فیصل کے خیال میں بینظیر بھٹو نے نوابزادہ نصراللہ خان کے مقابلے میں غلام اسحاق خان کی مدد کر کے دراصل ایم آر ڈی کی تحریک کو دھوکہ دیا تھا جس نے جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے خلاف بڑی لمبی جدوجہد کی تھی۔ وہ لوگ جو اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ اس طرح کی اندھی ڈیل کے خلاف تھے انہیں بینظیر بھٹو نے ایک ایک کر کے سائیڈ لائن کر دیا۔ بینظیر بھٹو کے نزدیک اب سیاسی اصولوں کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی کیونکہ 1993ء میں انہوں نے اس غلام اسحاق خان کی مدد کی تھی جس نے 1990ء میں ان کی حکومت کو کرپشن چارجز پر ڈس مس کیا اور ان کی پارٹی کے لیڈروں پر مقدمات بنائے تھے۔ بینظیر بھٹو اس غلام اسحاق خان کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھیں جو نواز شریف کو گھر بھیجنا چاہتے تھے۔

فیصل نے اس بات پر دکھ کا اظہار کیا کہ ایک اینٹی اسٹیبلشمنٹ پارٹی آخر میں محلاتی سازشوں کا حصہ بن کر رہ گئی۔

دوسری ملاقات میں فیصل نے مجھے بتایا کہ بینظیر بھٹو نے 1993 میں [illegible] جنرل [illegible] کو [illegible] کے ساتھ [illegible] تھے۔

فیصل ایک [illegible]

[illegible] جب پنجاب میں ایک [illegible] کے پاس [illegible] بینظیر بھٹو [illegible] فیصل نے [illegible] تھے۔

[illegible] فیصل [illegible] اپنے [illegible] میں یہ کہا تھا کہ [illegible] جنرل مشرف [illegible] کیا تھا۔

جب یہی بات میں نے فیصل سے پوچھی تو وہ کہنے لگے کہ جناب اگر ایسی بات ہوتی تو [illegible] 1993 میں پنجاب میں [illegible] فیصل مجھے بتاتے کہ 1988 سے لے کر اب تک پیپلز پارٹی کی [illegible] ہوتی ہے تاکہ [illegible] بھی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ [illegible] فیصل کے خیال میں وہ تمام [illegible] کے لیے [illegible] حاصل کرنے کے لیے کیے گئے تھے۔

اب [illegible] کے کام سے [illegible] کہ آپ پر یہ الزام لگایا جا رہا تھا کہ وہ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ [illegible] کے بارے میں کیا خیال ہے جو بینظیر بھٹو ماضی میں اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ کرتی رہی تھیں۔ فیصل [illegible] کہ ایک طرف بینظیر بھٹو پیپلز پارٹی کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کر رہی تھیں جیسے یہ ایک لبرل اور سیکولر پارٹی تھی اور دوسری طرف وہ [illegible] لوگوں سے [illegible] کر کے [illegible] اقتدار میں قومی اسمبلی کی [illegible] بھی [illegible]۔

فیصل نے بڑے عجیب انداز میں مجھ سے پوچھا کہ اب آپ [illegible] پارٹی سے پوچھیں کہ [illegible] اس وقت کہاں گیا جب [illegible] کے ساتھ سیاسی اتحاد کیا جا رہا تھا۔

فیصل نے کہا کہ یہ پیپلز پارٹی ہی تھی جس نے افغانستان میں طالبان پیدا کیے تھے۔ [illegible] طالبان کی پرورش کی اور انہیں پیسہ دیا۔

فیصل نے ایک اور جگہ مجھ سے پوچھا کہ جناب جب یہ طالبان پیدا کیے جا رہے تھے اس وقت [illegible] کا نعرہ کہاں گیا تھا۔ [illegible] اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ [illegible] پیپلز پارٹی نے پیدا کیے تھے۔ بینظیر بھٹو اپنے آپ کو مغربی دنیا کے سامنے ایک لبرل اور [illegible] لیڈر پیش کرتی تھیں جبکہ پاکستان میں وہ مذہبی جماعتوں کے ساتھ مل کر حکومت [illegible] اور [illegible] طالبان کی سرپرستی کرتی تھیں۔

میں نے بات کا رخ موڑا اور فیصل سے پوچھا کہ پیپلز پارٹی کی قیادت پر لگنے والے کرپشن کے الزامات میں کیا حقیقت تھی۔

فیصل نے کہا کہ اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے کیونکہ ان تمام کرپشن کی کہانیوں میں [illegible] زرداری [illegible] موجود تھا۔ سب کو علم تھا کہ ان دنوں [illegible] میں کیا ہو رہا تھا۔ [illegible] کہ وہ آصف زرداری کے خلاف ان کرپشن الزامات کو سنجیدگی سے لیتیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کرپشن کی وہ کہانیاں جھوٹی نکلتیں لیکن یہ وزیراعظم کا کام تھا کہ وہ ان [illegible] پر ایکشن لیتیں۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ کیا نواز شریف اور بینظیر بھٹو کی لڑائی نے اس ملک کو ناقابل تلافی نقصان نہیں پہنچایا تو وہ بولے کہ دونوں لیڈر بڑے سیانے تھے اور کئی موقعوں پر انہوں نے ایک دوسرے کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے کئی خفیہ کام بھی کیے تھے۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے انہوں نے کہا کہ بینظیر بھٹو کی دوسری حکومت میں شہباز شریف مسلم لیگ کی حکومت سے باقاعدہ ایک ڈیل کرنے کے بعد ملک سے باہر گئے تھے۔ اسی طرح مارچ 1999ء میں بینظیر کے خلاف عدالتی فیصلہ آنے سے پہلے ہی نواز شریف حکومت نے باقاعدہ ایک ڈیل کے تحت محترمہ کو ملک سے باہر جانے دیا۔

فیصل نے بتایا کہ اگر محترمہ کو جمہوریت سے اتنی ہی محبت تھی تو پھر 12 اکتوبر 1999 کو جب جنرل مشرف نے اقتدار اپنے قبضے میں لیا تو انہوں نے اس کا کیوں خیر مقدم کیا تھا۔ تمام لوگوں نے بی بی

لیا جو کہ ایک سیاسی حکومت کے تحت ہی ہے جنرل کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

فیصل نے کہا کہ باقی باتیں چھوڑیں۔ انہیں تو اس بات کا بھی پتہ ہے کہ محترمہ 12 اکتوبر 1999ء سے پہلے ہی جنرل مشرف کے ساتھ ڈیل کرنے پر آمادہ تھیں۔ یہ تو جنرل مشرف تھے جنہوں نے بینظیر کے ساتھ ڈیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

فیصل نے کہا کہ اگر وہ نیب کے مقدمات کا سامنا کر سکتے تھے تو بینظیر بھٹو کیوں نہیں۔ انہیں سپریم کورٹ آف پاکستان نے پی سی او کے بینک ان کیس میں ان کی ضمانت منظور کی تھی اور وہ وزیر ہوتے ہوئے بھی ابھی تک عدالت میں قانونی جنگ لڑ رہے تھے۔

فیصل نے الٹا مجھ سے پوچھا کہ آپ ہی مجھے بتائیں کہ بینظیر بھٹو اس ملک میں رہ کر اپنے خلاف قائم کیے گئے مقدمات کا سامنا کیوں نہیں کر سکتی تھیں۔ فیصل نے کہا کہ جنرل مشرف کے تین سالہ فوجی دور میں انہوں نے تکلیفیں اور مشکلیں دیکھیں مگر انہوں نے اس کی کوئی شکایت نہیں کی کیونکہ ان کی اپنی پارٹی کے ساتھ کمٹمنٹ تھی۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی سیاسی پارٹی نے تحریک چلا کر جنرل مشرف سے انتخابات نہیں کروائے تھے۔ کسی سیاسی پارٹی کے پاس کوئی سٹریٹ پاور نہیں تھی۔ آپ باقی باتیں چھوڑیں۔ 11/9 کے بعد افغانستان پر امریکہ کے حملے کے بعد بھی جماعت اسلامی چند ہزار سے زیادہ لوگ سڑکوں پر نہیں لا سکی۔ جنرل مشرف نے نئے انتخابات کرانے کا قوم سے وعدہ کیا تھا جو اس نے پورا کیا۔ اس قوم نے جنرل ضیاء الحق کا کیا کر لیا تھا جب اس نے 90 دن میں انتخابات کا وعدہ کر کے 11 سال تک مزے سے ڈٹ کر اس ملک پر حکومت کی۔

میں ابھی تک نہیں جان سکا تھا کہ آخر فیصل صالح حیات کو کس بات نے مجبور کیا تھا کہ وہ بینظیر بھٹو کا ساتھ چھوڑ کر جنرل مشرف کے ساتھ مل جائیں۔ فیصل صالح حیات کا بینظیر بھٹو کو چھوڑنے کا فیصلہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ فیصل اس پارٹی کے لیے کئی سالوں تک شاہی قلعے کی اذیتیں بھگت چکے تھے۔ آخر کچھ تو ہوا ہو گا جس کی وجہ سے فیصل جیسا بندہ بھی اب بینظیر بھٹو سے مایوس ہو کر ایک آمری حکومت میں وزیر بننے پر تیار ہو گیا تھا۔

اب اکتوبر 2002ء میں اس ملک میں انتخابات ہوئے تو بینظیر بھٹو نے پارٹی کے لیڈروں کو

مقابلہ کرنے کے لیے وطن واپس آنا چاہا۔ فیصل نے محترمہ کو شروع سے ہی یہ بات بتائی کہ وہ حکومت بنانے کے لیے اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ کچھ لو اور دو کی ڈیل کرتی آئی تھیں۔ ایک وقت ایسا تھا جب ان کی پوزیشن سیاسی لحاظ سے بہتر تھی۔ اسٹیبلشمنٹ بینظیر بھٹو سے بات کرنے کو تیار تھی لیکن اس کے بعد حالات بگڑتے چلے گئے اور بینظیر بھٹو ملک سے باہر رہیں۔ فیصل نے محترمہ کو بتایا کہ پیپلز پارٹی اس پوزیشن میں ہے کہ وہ حکومت بنا سکے اور اس کو ہر حال میں حکومت بنانی چاہیے۔ فیصل نے پی پی سے یہ پوچھا کہ اگر ماضی میں بھی وہ بہت سارے ایسے سیاسی گروہوں کے ساتھ مل کر حکومت بناتی رہی ہیں جو انہیں پسند نہیں تھے تو اب کی بار اس میں کیا حرج ہے۔ فیصل کے خیال میں پیپلز پارٹی اور بینظیر بھٹو کے اصل سیاسی دشمن نواز شریف تھے نہ کہ پی ایم ایل کیو۔ فیصل نے بینظیر بھٹو کو وہ تمام نام گنوائے جو نواز شریف کے دور میں جیلوں میں بھیجے گئے۔ یوسف رضا گیلانی، مشتاق اعوان، آصف زرداری ان میں نمایاں تھے۔ یہ نواز شریف ہی تھے جنہوں نے پیپلز پارٹی کو دھوکہ دیا۔ 2 دسمبر 2000ء کو اے آر ڈی کے نام سے بینظیر بھٹو کے ساتھ ایک سیاسی اتحاد بنایا اور ٹھیک آٹھ دنوں بعد جنرل مشرف کے ساتھ ایک خفیہ ڈیل کر کے ملک سے چلے گئے۔ نواز شریف نے بڑی سمجھداری سے پیپلز پارٹی کی سیاسی طاقت کو جنرل مشرف کے ساتھ ڈیل کرنے کے لیے استعمال کیا۔

یہی وجہ تھی کہ فیصل چاہتے تھے کہ پی ایم ایل کیو کے ساتھ ڈیل کرنے میں بہت بڑا فائدہ تھا کیونکہ پی ایم ایل کیو کسی نظریے کی بنیاد پر تشکیل نہیں دی گئی تھی۔ اس پارٹی میں وہ لوگ شامل تھے جو الیکشن جیت سکتے تھے اور انہیں طاقتور حلقوں نے ایک پارٹی میں اکٹھا کر دیا تھا۔ پیپلز پارٹی بڑے آرام سے اس اتحاد حکومت میں اپنی مرضی سے حکومت کر سکتی تھی۔

فیصل نے بی بی سے پوچھا کہ وہ بتائیں کہ ٹکراؤ کی سیاست کر کے انہوں نے کیا حاصل کر لیا ہے۔ وہ ایک ڈیل کر کے بڑی آسانی سے پاکستان واپس آ سکتی ہیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد وہ اپنے کیسز بھی عدالتوں سے سیٹل کرا سکتی ہیں جب ان کی اپنی پارٹی اقتدار میں ہو گی۔

فیصل کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ 1988ء میں بینظیر بھٹو نے اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ ٹکراؤ کی سیاست سے گریز کیا تھا لیکن اب وہ جنرل مشرف سے ٹکراؤ کرنے کے موڈ میں تھیں۔ 1988ء میں محترمہ نے ایک طرح پالیٹکس کے نظریے پر چلتے ہوئے اقتدار حاصل کیا تھا۔ وہ آنے والے برسوں میں بھی پاور

[illegible]

[illegible]

"You all

Mashdooms (Faisal and Faheem) feel and think alike"

[illegible]

بھی دلوا دیا۔

فیصل نے کہا کہ میں نے بے نظیر بھٹو کو واضح طور پر یہ بات کہی تھی کہ میں آپ کی قیادت کو تو تسلیم کرنے کو تیار ہوں لیکن آپ کے ذاتی سٹاف کی قیادت کو نہیں۔

فیصل نے بے نظیر کو واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ آپ ان لوگوں کو پارٹی لیڈروں پر مسلط نہ کریں جن کا پارٹی کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جن کی پارٹی کے لیے کوئی کنٹریبیوشن نہیں۔ بے نظیر بھٹو کے اس ذاتی سٹاف سے سب لوگ نفرت کرتے تھے کیونکہ انہوں نے پارٹی کو یرغمال بنا لیا تھا۔

میں نے فیصل سے کہا کہ انہوں نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ پارٹی کیوں چھوڑی جس کے لیے وہ شاہی قلعہ کی دیواروں سے سر ٹکراتے رہے تھے۔

فیصل نے ایک نئی کہانی سنائی۔

پیپلز پارٹی میں بیک وقت دو کام چل رہے تھے۔ ایک طرف پارٹی اصولوں کی بات کر رہی تھی اور میڈیا اور عوام کو یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ اس پارٹی سے بڑا اور کوئی شخص اصول پسند نہیں تھا جبکہ دوسری طرف امین فہیم کو بے نظیر بھٹو نے یہ ٹاسک دیا ہوا تھا کہ وہ جنرل مشرف سے ڈیل کریں۔ مولویوں پر مشتمل متحدہ مجلس عمل کے لیڈروں سے بھی بات چیت جاری تھی۔

فیصل نے کہا کہ وہ پانچ دفعہ ایم این اے کا الیکشن جیت کر آئے تھے اور ان کی وفاداری اور محنت کا سب کو علم تھا۔ لیکن جب بے نظیر لوگوں کو ان کا باس بنایا گیا جنہیں پارٹی آفیسرز کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا تو ان کے دل میں پہلی دفعہ دراڑ پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ ان کے دل میں بڑی دراڑ اس وقت پڑی جب امین فہیم کو بے نظیر بھٹو نے یہ پیغام بھیجا کہ انہوں نے جنرل مشرف کے خلاف ایک سخت لائن لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جب پارٹی کے گروپ نے ان سے یہ بات منوائی کہ جنرل مشرف پیپلز پارٹی کے بغیر اسلام آباد میں نئی سیاسی حکومت نہیں قائم کر سکتے تو فیصل صالح حیات نے فوراً یہ بھانپ لیا کہ اب اس ملک کا سیاسی نظام بدلنے والا ہے۔ وہ فوری طور پر اپنے چند دوستوں سے ملے اور انہوں نے پارٹی کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ فیصل اور ان کے دوست اس وجہ سے دوبارہ گھر نہیں جانا چاہتے تھے کیونکہ پیپلز پارٹی میں موجود کچھ لوگ انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ فیصل اور ان کے

پارلیمنٹ سے الگ ہو کر اسمبلی کو بچانے کے نام پر ایک فوجی نگرانی میں جمہوریت کو ایک شخص کی آمریت پر ترجیح دیتے ہوئے اپنا ایک گروپ بنانے کا فیصلہ کیا۔

میں نے فیصل سے کہا کہ سیکرٹ ایجنسیوں نے پیپلز پارٹی کو توڑنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

فیصل نے بڑی سختی سے میری اس بات کی تردید کی کہ ان پر پریشر ڈال کر ان کی سیاسی وفاداریاں تبدیل کروائی گئی تھیں۔ ان کے بارے میں سب کو علم تھا کہ وہ ایسے سیاستدان نہیں تھے جن پر دباؤ ڈال کر اپنی مرضی کا کوئی کام کرایا جا سکتا تھا۔ وہ ماضی میں کئی دفعہ فوجی آمروں کے خلاف لڑتے ہوئے جیل جا چکے تھے۔ وہ تمام لوگ جنہوں نے پیپلز پارٹی چھوڑی تھی ان کے کردار اور محنت کے بارے میں سب لوگوں کو اچھی طرح علم تھا۔ فیصل تو یہاں تک بھی کہہ گئے کہ جنرل مشرف کے ساتھ پیپلز پارٹی کے سارے لیڈر ڈیل کرنے کے لیے پر تول رہے تھے لیکن ہم نے ڈیل اس لیے کی کہ ہم ایک کمزور سیاسی نظام کو چلتا دیکھنا چاہتے تھے۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ ان کی جنرل مشرف سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی تو وہ بولے۔ جب انہوں نے میریٹ ہوٹل میں اپنا ایک نیا سیاسی گروپ بنانے کا اعلان کیا تو وہ جنرل مشرف سے ملنے کے لیے گئے اور انہیں اپنی حمایت کا یقین دلایا۔

فیصل نے اس بات کو تسلیم کیا کہ وہ ایک باوردی صدر کے حق میں نہیں تھے لیکن اس وقت ملک کی صورتحال کچھ ایسی تھی کہ اس وقت ایک باوردی صدر کا ہونا ضروری تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے فیصل نے کہا کہ وہ جنرل مشرف سے ملنے والے پیپلز پارٹی کے پہلے لیڈر نہیں تھے جو پرویز مشرف سے اس لیے ملاقاتیں کرتے تھے تاکہ نواز شریف حکومت کو گرایا جائے۔ پیپلز پارٹی کے بھی لیڈر جنرل وحید کاکڑ اور جنرل آصف نواز سے بھی ملتے تھے تاکہ نواز شریف حکومت ختم کرائی جائے۔ پیپلز پارٹی کے یہ لیڈران تو جنرل جہانگیر کرامت سے بھی ملنے کے لیے آرمی ہاؤس جاتے تھے۔

فیصل نے بتایا کہ پیپلز پارٹی اب منافقوں کی ایک جماعت بن چکی تھی۔ بے نظیر بھٹو نے انتخابات سے پہلے جنرل مشرف سے ڈیل کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت کسی کو ایل ایف او کا کوئی خیال نہیں تھا۔ اب جب ان کی ڈیل نہیں ہو سکی تو یہ پارلیمنٹ میں جمہوریت کے بہت بڑے چیمپئن بن کر ابھرے ہیں۔ باقی باتیں چھوڑیں۔ اب متحدہ مجلس عمل کو دیکھ لیں۔ اس کے وزیر اعلیٰ نے ایل ایف او

[illegible] پیٹریاٹ کے ساتھ اقتدار شیئر کیا ہوا ہے اور وہاں انہیں [illegible] کے لئے حلف اٹھایا ہوا ہے۔ صوبوں میں تو [illegible] ایم ایم اے والوں کو کوئی حرج نہیں ہے جبکہ اسلام آباد کی اسمبلی میں انہوں نے آئین پر حلف اٹھایا ہوا ہے۔

فیصل نے کہا کہ اگر محترمہ ایک سمجھدار لیڈر تھیں تو پھر انہوں نے پی پی پی کے آگے ایک اور پی کیوں لگایا اور انتخابات سے پہلے الیکشن کمیشن میں اس کا نام رجسٹر کرایا۔

فیصل نے جب یہی بات بینظیر بھٹو سے پوچھی تو محترمہ نے انہیں جواب دیا تھا کہ یہ ایک حکمت عملی کے تحت کیا گیا ہے۔

فیصل نے مجھ سے پوچھا کہ آپ مجھے بتائیں کہ اب اسی حکمت عملی کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا جا رہا تھا۔ اگر بی بی 1985ء کے انتخابات کا بائیکاٹ اس وجہ سے کر سکتی تھیں کہ ایک آمر کے تحت ہونے والے انتخابات انہیں قبول نہیں تھے تو پھر 2002ء میں ہونے والے انتخابات میں اسی وجہ سے بائیکاٹ کیوں نہیں کیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بینظیر بھٹو بھی کمپرومائز کر رہی تھیں اور آنے والے دنوں میں بھی وہ کمپرومائز کریں گی۔ [illegible] بینظیر بھٹو نے تو اپنی پارٹی کو فوجی دور میں الیکشن لڑنے کی اجازت بھی دی اور اب وہ اس سسٹم کے خلاف باتیں بھی کر رہی ہیں۔

فیصل کے بقول ہم لوگوں سے یہ جھوٹ بولتے رہے تھے کہ بینظیر بھٹو 2002ء کے الیکشن سے پہلے پاکستان واپس آ جائیں گی۔ ہم سب کو پتہ تھا کہ محترمہ نے واپس نہیں آنا تھا۔ ہم پھر بھی تمام لوگوں کے سامنے جھوٹ بولتے رہے اور آخر میں جب وہ نہیں آئیں تو ہم عوام اور میڈیا کے سامنے بے وقوف بن کر رہ گئے۔

فیصل نے کہا کہ بینظیر بھٹو کو یہ سمجھنے کی ضرورت تھی کہ اب پارٹی کو ای میل کے ذریعے نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ ان کا پاکستان میں ہونا ضروری تھا۔

میں نے فیصل کو بتایا کہ یہ سننے میں آتا ہے کہ پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی بینظیر بھٹو کو پاکستان آنے سے منع کرتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ پاکستان نہیں آ رہی تھیں۔

فیصل مسکرائے اور بولے کہ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ بینظیر بھٹو کے سامنے سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کی کیا اوقات تھی۔

میں نے فیصل کو ٹوکا اور کہا کہ عام لوگوں میں یہ بھی تاثر ہے کہ شاید پیپلز پارٹی کے اندر جو

گروپ بنایا گیا تھا اس میں بینظیر بھٹو کی مرضی شامل تھی۔

فیصل نے کہا یہ سب جھوٹ ہے لیکن وہ اس بات پر بھی قائم تھے کہ یہ گروپ بینظیر بھٹو کو [illegible] مجبور کرنے کے لئے [illegible] لیکن مسئلہ یہ تھا کہ بینظیر واپس آنے کو تیار نہیں تھیں۔

میں نے فیصل سے پوچھا کہ اب جب وہ اس ملک کے وزیر داخلہ ہیں، اگر بینظیر بھٹو واپس [illegible] تو کیا وہ انہیں جیل میں ڈالیں گے۔

فیصل نے اس کا بڑا ڈپلومیٹک جواب دیا اور کہا کہ بینظیر بھٹو کے خلاف مقدمات نیب نے قائم کیے ہیں اور اس کا ان کی وزارت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تمام کیس بینظیر کے خلاف سیف الرحمن نے نواز شریف کے دوسرے دور اقتدار میں قائم کیے تھے اور آج تک مسلم لیگ نواز کے کسی بھی لیڈر نے پیپلز پارٹی یا بینظیر بھٹو سے معافی نہیں مانگی تھی۔

میں نے فیصل سے کہا کہ اب جبکہ وہ جنرل مشرف کے اقتدار کا حصہ ہیں تو آصف زرداری کو رہا کیوں نہیں کراتے جو ان کے بقول سیف الرحمن کے بنائے ہوئے جھوٹے مقدمات کی وجہ سے جیل میں پڑے ہوئے تھے۔

ایک مجبور فیصل نے ایک دفعہ پھر مجھے روایتی اور ڈپلومیٹک سا جواب دیا کہ وہ اپنی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آصف زرداری کا انصاف پر مبنی ٹرائل کیا جائے۔ ایک وزیر داخلہ ہونے کے ناطے وہ زرداری صاحب کو جیل میں جتنی سہولتیں فراہم کر سکتے تھے انہوں نے اپنے اس پرانے دوست کو پہلے فراہم کر دی تھیں۔ وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ آصف زرداری کا فیئر ٹرائل ہونا چاہیے۔

فیصل نے اس بات کو تسلیم کیا کہ انہوں نے کمپرومائز کرنے کے بعد ہی پیپلز پارٹی کو چھوڑا تھا۔ وہ کمپرومائز کرنے والے کوئی پہلے اور آخری لیڈر نہیں تھے۔ پوری کی پوری پیپلز پارٹی کمپرومائز کرتی رہی تھی۔

فیصل نے کہا کہ اگر ہم ماضی میں ایک سو دفعہ کمپرومائز کر چکے ہیں تو ایک اور کمپرومائز کرنے میں کیا حرج تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے فیصل نے کہا کہ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ پارٹی کے لیڈروں کو کمپرومائز کرنا بینظیر بھٹو نے سکھایا تھا۔

فیصل کی یہ مایوس کر دینے والی بات سن کر میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان میں

چاہی اطلاعات دراصل غلط ہو کر رہ گئی تھیں۔ فیصل نے بعد میں وزارت کے لئے کہا کہ جناب یہ وقت [illegible] تھی۔

وزارت [illegible] پاکستان میں یہ اطلاعات [illegible] تھی۔

فیصل نے بتایا کہ انہیں یہ اطلاعات [illegible] جب اسی میں ایک وزیر سے [illegible] تھے۔

[illegible] ایک ہی [illegible] میں اکٹھے بیٹھے تھے۔

میں نے فیصل صالح حیات سے آخر میں اٹھنے سے پہلے ان سے ایک آخری سوال پوچھ لیا کہ سیاست میں کبھی دو [illegible] کریں گے جس کے لیے انہوں نے کچھ [illegible] تھے۔ میں [illegible] کے [illegible] جنرل مشرف نے اس خواہش کا [illegible] نے مجھے جواب دیا کہ [illegible] میں بے نظیر بھٹو کی پارٹی میں بھی [illegible] ایک [illegible] تھا۔

○○○

اس انٹرویو کے نتیجے میں فیصل اور گجرات کے چوہدریوں پرویز الٰہی اور چوہدری شجاعت کے درمیان ٹھن گئی۔ چوہدری پرویز الٰہی نے سب حالات پنجاب میں ہر اس لیڈر کو تنگ کرنا شروع کر دیا جس کے بارے میں انہیں ذرا سا بھی شک تھا کہ وہ جنرل مشرف کے قریب تھا یا کل کلاں کو ان کے وزیر اعلیٰ بننے کی خواہش کے آگے تھوڑی سی بھی مزاحمت کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ پیپلز پارٹی پیٹریاٹ کے ارکان سب سے زیادہ پرویز الٰہی کے نشانے پر آئے۔ ان کے علاوہ فاروق لغاری، راؤ سکندر اقبال، فیصل صالح حیات، ڈاکٹر شیر افگن خان نیازی، اویس لغاری، جہانگیر خان ترین اور دیگر ایسے لیڈر ان تھے جن پر ہر وقت وزیر اعلیٰ پرویز الٰہی کی نظر کرم ضرورت سے زیادہ رہتی۔ تاہم، باقی لیڈروں کے برعکس فیصل صالح حیات اٹ کر چوہدریوں کے مقابلے میں کھڑے تھے۔ وہ دوسروں کی نسبت ان چوہدریوں کی کوئی خاص آمد کم کرتے تھے۔ فیصل کا خیال یہ تھا کہ جب ان سب کو جنرل مشرف کے دربار سے ہی فیصل ملا تھا تو پھر درمیان میں اپنی قیمت چوہدری پرویز الٰہی اور چوہدری شجاعت حسین جیسے پاور بروکرز کیوں گھس جائے۔ اگر خوشامد کرنی ہے تو جنرل مشرف کی کیوں نہ کی جائے۔ چوہدریوں کو فیصل کی اس عادت سے بڑی چڑ تھی۔ فیصل انہیں اس وجہ سے بھی ناپسند تھے کہ

وزارت داخلہ کا قلمدان تھا جو نواز شریف کے پچھلے دور میں بھی چوہدری شجاعت کے پاس تھا۔ وزارت داخلہ کی وزارت چوہدری شجاعت حسین کو مشرف دور میں [illegible] تھی۔ شاید اسی وزارت کی وجہ سے [illegible] لوگوں کو [illegible] میں [illegible] تھی۔ یہی وجہ تھی کہ چوہدری شجاعت کو فیصل کی موجودگی میں وزارت داخلہ [illegible] چوہدری شجاعت فیصل کو [illegible] جنرل مشرف نے [illegible] چوہدری شجاعت [illegible] وزیر اعظم بنایا تاکہ شوکت عزیز [illegible] ایک کالم لکھا جس میں انہوں نے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ سابق وزیر داخلہ شاید انسانی سمگلنگ میں ملوث تھے اور برطانیہ نے حکومت پاکستان کو اس بارے میں ایک باقاعدہ خط لکھا تھا۔ اس کالم کا یہ فائدہ ہوا کہ فیصل صالح حیات کو دوسری بار وزارت داخلہ نہیں ملی۔ جب شوکت عزیز نے نئی کابینہ بنائی تو انہیں وزیر ماحولیات بنا دیا گیا۔ فیصل صالح حیات بھی چوہدری نثار علی خان کی طرح ہیں۔ ان کے بارے میں کوئی ایسی چیز چھپ جائے جو انہیں پسند نہ ہو تو وہ بھی جب تک اس کا جواب نہ دے دیں آرام سے نہیں بیٹھتے۔

شوکت عزیز کی کابینہ بننے سے ایک دن پہلے فیصل صالح حیات کا مجھے فون آیا۔ وہ اس مسئلے پر انٹرویو دینا چاہ رہے تھے۔ انہوں نے اس انٹرویو میں گجرات کے چوہدریوں پر شدید حملے کیے اور ان پولیس افسروں کے نام دیے جنہیں انہوں نے وزیر داخلہ کے طور پر ایف آئی اے سے انسانی سمگلنگ کے الزامات پر نکالا تھا اور اگلے روز ہی پنجاب حکومت نے انہیں صوبے میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز کر دیا تھا۔ فیصل نے اس انٹرویو میں پوری تفصیلات بتائیں کہ کیسے چوہدری صاحبان بھی انسانی سمگلنگ میں ملوث رہے تھے۔

جونہی اگلی صبح یہ انٹرویو چھپا، دوپہر کے وقت مجھے فیصل صالح حیات کا فون آیا۔ وہ بڑے [illegible] میں تھے اور بولے کہ ابھی صدر مشرف سے مل کر آ رہا ہوں۔ ان کے موڈ سے لگتا تھا کہ بات بگڑ رہی تھی۔ صدر نے اس بات پر خفگی کا اظہار کیا تھا کہ انہیں دی نیوز کو انٹرویو دینے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ اس سے ان کی حکومت میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے ایک دوسرے سے اختلافات بڑھ

بھلا فیصل جیسا سمجھدار سیاستدان اس موقع کو کیسے ضائع جانے دیتا۔ وہ مسکراتے ہوئے کھڑے ہوئے اور بولے کہ جناب اسپیکر یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ جس رپورٹ کے بارے میں آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ فیک ہے اس کے بارے میں دو دن پہلے ہی آپ کے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے اسی جگہ کھڑے ہو کر فرمایا تھا کہ وہ ان کا ذاتی دوست ہے۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ یوسف رضا گیلانی صاحب اپنے وزیروں کے خلاف خود ہی خبریں لگوا رہے ہیں۔

اس کے بعد راجہ صاحب کی حالت دیکھنے والی تھی اور فیصل صالح حیات مسکراتے ہوئے قومی اسمبلی کے ہال سے باہر نکل گئے۔

امین فہیم

اکتوبر 2002ء کے الیکشن کے بعد امین فہیم کو پہلی دفعہ یہ یقین ہو گیا تھا کہ اگر وہ اب کی دفعہ وزیراعظم نہ بنے تو پھر وہ کبھی نہیں بن سکیں گے۔ اس سے بہتر موقع ان کی زندگی میں نہیں آ سکتا تھا۔ پیپلز پارٹی قومی اسمبلی کے انتخابات میں پی ایم ایل کیو کے بعد زیادہ سیٹیں لے چکی تھی۔ پی ایم ایل کیو کو ہاؤس میں سادہ اکثریت نہیں مل سکی تھی۔ حکومت بنانے کے لیے ضروری تھا کہ جنرل پرویز مشرف پیپلز پارٹی کے ساتھ ایک نیا سیاسی اتحاد تشکیل دیں۔ اگر پیپلز پارٹی اس اتحاد میں شریک ہونے سے انکار کرتی تو پھر جنرل مشرف کو پارلیمنٹ توڑ کر نئے سرے سے الیکشن کرانا پڑتے۔ یہی وجہ تھی کہ جنرل پرویز مشرف ہر قیمت پر پیپلز پارٹی کے ساتھ اتحاد کر کے امین فہیم کو وزیراعظم بنانے پر تیار ہو گئے۔ اب صرف بینظیر بھٹو کی ایک چھوٹی سی ہاں کی ضرورت تھی۔ بینظیر بھٹو نے امین فہیم کو لندن بلا لیا تھا۔ اس ملاقات میں یہ طے ہونا تھا کہ بینظیر بھٹو امین فہیم کو وزیراعظم بنانے پر تیار تھیں یا نہیں۔

لندن جانے سے قبل آئی ایس آئی کے افسران کے ساتھ امین فہیم کی ملاقاتیں بڑھ گئی تھیں۔ ایک مرحلہ یہ بھی آیا کہ ان مذاکرات میں آصف علی زرداری بھی شامل ہو گئے اور اس وقت کے ڈی جی آئی ایس آئی جنرل احسان الحق اور ڈپٹی ڈی جی آئی ایس آئی میجر جنرل احتشام ضمیر کے ساتھ خفیہ ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔

ایک رات امین فہیم آصف زرداری کو پمز ہسپتال کے کمرے سے اس طرح چوری چھپے آئی ایس آئی کے جرنیلوں سے ملانے لے گئے کہ سیکیورٹی پر تعینات گارڈز کو بھی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یہ ملاقات اتنی خفیہ رکھی گئی تھی کہ اس کا بینظیر بھٹو کو بھی علم نہیں تھا۔ کسی کام سے بینظیر بھٹو نے آصف زرداری کو واشنگٹن سے کال کیا تو ان کا فون بند ملا۔ ایک دو اور لوگوں سے بی بی نے پوچھنے کی کوشش کی تو بھی انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ بینظیر بھٹو کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ سمجھیں کہ جنرل مشرف نے ان کے خاوند کو ہسپتال سے اغوا کر لیا ہے اور زرداری صاحب کی جان خطرے میں ہے۔ زرداری صاحب کو اغوا کر کے جنرل مشرف ان پر اپنی مرضی کی ڈیل مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ اسی پریشانی کے عالم میں بینظیر بھٹو نے واشنگٹن میں مشہور صحافیوں شاہین صہبائی، خالد حسن، انور اقبال اور دیگر کو فون کر کے آصف زرداری کے اغوا کی خبر دینا شروع کر دی۔ ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اگر آصف زرداری کو کچھ ہوا تو اس کے ذمہ دار جنرل پرویز مشرف ہوں گے۔

پاکستان میں اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں ابھی بھی اپنے دفتر میں موجود تھا۔ اچانک [illegible] پر شاہین صہبائی صاحب، جو واشنگٹن میں تھے، نے مجھے ہیلو کیا اور بولے رؤف تمہارے لیے ایک بہت بڑی خبر ہے۔ اگر تم چاہو تو یہ کل صبح کی تمہاری لیڈ سٹوری بن سکتی ہے۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ بینظیر بھٹو اس وقت شدید پریشان ہیں کیونکہ آصف زرداری پمز ہسپتال کے کمرے سے غائب ہو چکے ہیں اور کسی کو کوئی علم نہیں کہ انھیں کون وہاں سے اغوا کر کے لے گیا ہے۔

میں یہ خبر سن کر واقعی چونک گیا۔ شاہین صاحب سے دو چار اور تفصیل لیں۔ کہیں سے آصف زرداری صاحب کے ساتھ رہنے والے ڈاکٹر قیوم سومرو کا موبائل نمبر لیا۔ ڈاکٹر قیوم سے گفتگو کر کے مجھے احساس ہوا کہ انھیں پتہ تھا کہ زرداری صاحب کو کون کہاں لے گیا ہے۔ دراصل بینظیر بھٹو کو آصف زرداری اور امین فہیم دونوں کے فون بند ملے تھے جس پر وہ پریشان ہو گئی تھیں اور جلد بازی میں انھوں نے صحافیوں کو فون کرنا شروع کر دیے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد بینظیر بھٹو کو یہ پیغام پہنچ گیا تھا کہ زرداری صاحب اس وقت جنرل احسان سے ملاقات کر رہے ہیں اور مستقبل کی حکومت اور وزیراعظم کے نام پر مذاکرات ہو رہے ہیں۔ اب بینظیر بھٹو پچھتا رہی تھیں کہ انھوں نے کیوں اتنی جلدی صحافیوں کو فون کرنا شروع کیا تھا جس سے بات تھوڑی بگڑ گئی تھی۔

تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

میں نے فوری طور پر اس کی خبر بنائی جو اگلے دن دی نیوز کی لیڈ سٹوری لگی جس سے عام پبلک اور سیاسی لیڈروں کو احساس ہوا کہ مذاکرات اب بہت سنجیدہ مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں اور اسی کے لیے آصف زرداری کو آئی ایس آئی کے سیف ہاؤس میں رات کے اندھیرے میں جنرل احسان اور دیگر جرنیلوں سے ملاقات کے لیے لے جایا گیا تھا۔

اس ملاقات میں ہی جنرل مشرف کے جرنیلوں نے بینظیر بھٹو کو پیشکش کی تھی کہ وہ امین فہیم کو پاکستان کا وزیراعظم بننے دیں۔ چوہدری شجاعت حسین کے ساتھ مل کر ایک کابینہ بنائی جائے جس میں پیپلز پارٹی کو بھی حصہ دیا جائے گا۔ سندھ کی وزارت اعلیٰ بھی پیپلز پارٹی کو دی جائے گی۔ پنجاب میں چوہدری حکمرانی کریں گے لیکن وہاں بھی پیپلز پارٹی کو کچھ وزارتیں مل جا سکتی ہیں۔ صوبہ سرحد مولویوں کے حوالے کر دیا تھا جبکہ بلوچستان میں پی ایم ایل کیو اور مولویوں نے مل کر حکومت بنائی تھی۔ یوں جنرل مشرف بڑی ہوشیاری سے ماسوائے نواز شریف کی پارٹی کے تمام سیاسی جماعتوں کو اپنے ساتھ اقتدار شیئر کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ نواز شریف کی جماعت صرف اپوزیشن میں رہ جاتی اور بمشکل بیس کے قریب ایم این اے 342 کے ہاؤس میں جنرل مشرف کے لیے کیا مسائل پیدا کر سکتے تھے۔ نواز شریف اور بینظیر بھٹو ملک سے باہر تھے اور یوں جنرل مشرف کے اقتدار کو دور دور تک کہیں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

جنرل مشرف نے اپنے تئیں ایک بڑا خوبصورت پلان بنایا تھا لیکن اس کا سارا دارومدار بینظیر بھٹو اور مخدوم امین فہیم کی لندن میں ہونے والی ملاقات پر تھا۔

لندن جا کر امین فہیم نے بینظیر بھٹو کے سامنے یہ سارا پلان رکھا اور بتایا کہ جنرل صاحب انھیں وزیراعظم بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ بھی شرط تھی کہ بینظیر بھٹو تین سال تک پاکستان واپس نہیں آئیں گی۔

بینظیر بھٹو مسکرائیں اور انھوں نے امین فہیم جنھیں وہ سیکرٹ ایجنسیوں اور جنرل مشرف سے مذاکرات کے لیے استعمال کر رہی تھیں سے پوچھا کہ مخدوم صاحب! مجھے یہ تو بتائیں کہ اس پیکیج میں تمہارے لیے کیا ہے؟

امین فہیم چپ رہے۔

بینظیر بھٹو کو ساری گیم سمجھ میں آ چکی تھی۔ جنرل مشرف سب کچھ اپنے لیے لینا چاہ رہے تھے۔ بینظیر بھٹو ان کے خاوند آصف زرداری کو جیل سے رہا کر کے دبئی بھیجنے کی آفر کر کے وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ پیپلز پارٹی کو اتنے بڑے تعاون کے نتیجے میں اس کی ساری قیمت ادا کر رہے تھے۔

یوں بینظیر بھٹو کے لیے اس پوری ڈیل میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے لیے وہ جنرل مشرف کی شرائط ماننے پر تیار ہو جاتیں۔ یوں یہ ڈیل لندن میں ہی دم توڑ گئی تھی۔

اس کے بعد جنرل مشرف کے لیے دو آپشن رہ گئے تھے۔ یا تو وہ اسمبلیاں توڑ دیں اور نئے الیکشن کرائیں یا پھر پیپلز پارٹی کو توڑ دیں۔ نئے الیکشن کرانا اتنا آسان کام نہیں تھا۔ چند دنوں میں جنرل مشرف کی سیکرٹ ایجنسیوں نے پیپلز پارٹی توڑ دی۔ جو کام جنرل ضیا نہیں کر سکے تھے وہ جنرل مشرف نے کر دکھایا۔

جب میری امین فہیم سے اپریل 2003ء میں پیپلز پارٹی کے زیر [illegible] واقع میڈیا سنٹر میں ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے یہی سوال پوچھا کہ آپ کی سیکرٹ ایجنسی کے لوگوں سے خفیہ ملاقاتوں [illegible] آپ وزیر اعظم نہیں بن سکے۔

امین فہیم بولے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اکتوبر کے انتخابات کے بعد اس ملک کا نیا وزیر اعظم [illegible] کامیاب ہو گئے تو [illegible] وزیر اعظم [illegible]۔

[illegible]؟

[illegible]

جنرل مشرف کو جائن کرنے کا خیال نہیں آیا۔

پیپلز پارٹی کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کرنے کے لیے امین فہیم نے مجھے ایک لمبی کہانی سنائی۔

امین فہیم ذوالفقار علی بھٹو سے اس وقت ہی متاثر ہو گئے تھے جب وہ پہلی دفعہ ان سے راولپنڈی میں ملے تھے۔ بھٹو صاحب اس وقت جنرل ایوب خان کی کابینہ میں وزیر خارجہ تھے۔ امین فہیم کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب جیسے بندے کے پاس ایک نوجوان کے لیے ٹائم نہیں ہوگا۔ جب وہ بھٹو صاحب سے ملنے کے لیے ان کے دفتر پہنچے اور انہیں بتایا گیا کہ مخدوم طالب المولا کا بیٹا ان سے ملنے کے لیے آیا ہے تو وہ اپنے دفتر سے باہر کر انہیں ریسیو کرنے آئے۔ انہوں نے ایک بہت ضروری میٹنگ کینسل کر دی تاکہ وہ انہیں ٹائم دے سکیں۔

ایک نوجوان مخدوم کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ بھٹو صاحب جیسا لیڈر سارے کام چھوڑ کر ان کے پاس بیٹھا تھا۔ امین فہیم بھٹو صاحب کے اس انداز کو کبھی نہ بھول سکے۔ یہ بات صرف یہیں ختم نہیں ہوئی۔ امین فہیم کے والد مخدوم طالب المولا جب بھی اسلام آباد قومی اسمبلی کے اجلاس میں آتے تو اپنے ساتھ امین فہیم کو ضرور لاتے۔ امین فہیم وزٹرز گیلری میں بیٹھے ہوتے۔ جونہی اجلاس ختم ہوتا بھٹو صاحب سیدھے وہاں سے امین فہیم کی طرف آتے اور ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نہ صرف ان سے باتیں کرتے بلکہ باہر بھی لے جاتے۔

ایک دن امین فہیم لندن میں تھے کہ انہیں بھٹو صاحب کا پیغام آیا۔ انہوں نے اس نوجوان کو [illegible] بتایا کہ وہ ایک سیاسی پارٹی بنانا چاہتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے [illegible] پارٹی کے بارے میں [illegible]

پارٹی میں لے کر آئیں گے۔

امین فہیم نے بھٹو صاحب سے وعدہ کر لیا۔

امین فہیم بھٹو صاحب کے ذوق سے بہت متاثر تھے اور یہ جاننا چاہتے تھے کہ وہ اپنے کپڑے کہاں سے خریدتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے امین فہیم کو ہانگ کانگ میں ایک چینی شاپ کے بارے میں بتایا کہ جب بھی وہاں جاؤ تو شرٹس وہاں سے خریدنا اور ہاں، میرے لیے بھی لانا نہ بھولنا۔ بھٹو صاحب اپنے جوتے لندن سے خریدتے تھے اور کبھی انہوں نے کسی سنگل شاپ سے ٹائی نہیں خریدی تھی۔

جب امین فہیم نے پاکستان واپس آ کر اپنے باپ سے بات کی کہ وہ بھٹو کی پارٹی کو جائن کریں تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ خود ایک بہت بڑے فیوڈل تھے۔ وہ بھلا کسی اور فیوڈل کی پارٹی میں شامل کیوں ہوتے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ پیدائشی مسلم لیگی تھے اور کسی مسلم لیگی کے لیے اپنی سیاسی وابستگیاں تبدیل کرنا مناسب نہیں تھا۔

امین فہیم اصرار کرتے رہے کیونکہ وہ بھٹو صاحب سے وعدہ کر چکے تھے۔

امین فہیم اپنے باپ کو اس بات پر قائل کرنے میں لگے رہے کہ نئی سیاسی پارٹی جائن کرنے سے انہیں کیا کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ آخرکار انہوں نے اپنے باپ کو قائل کر لیا۔

امین فہیم نے بھٹو صاحب کو پیغام بھیجا کہ ان کا مشن پورا ہو گیا ہے۔

بھٹو صاحب نے فوری طور پر غلام مصطفیٰ جتوئی اور پیر غلام رسول جیلانی کو مخدوم آف ہالا بھیجا تاکہ وہ طالب المولا کو نئی پارٹی جائن کرنے کی دعوت دے سکیں۔ مخدوم طالب المولا کی پیپلز پارٹی میں شمولیت پر بہت خوشیاں منائی گئیں کیونکہ بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ ہالا کے مخدوموں کے پارٹی میں شامل ہونے سے انہوں نے سندھ میں تقریباً آدھی سے زیادہ سیاسی جنگ جیت لی ہے۔

ابھی پیپلز پارٹی کو بنے ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ ملک میں ہونے والے نئے انتخابات میں الیکشن میں حصہ لینے کے مسئلے پر پارٹی میں دو دھڑے بن گئے۔ پارٹی کے اندر ایک ایسا گروپ تھا جو کمٹڈ سوشلسٹ لیڈروں پر مشتمل تھا جس میں ڈاکٹر مبشر حسن، جے اے رحیم، معراج محمد خان، شمیم خان اور میر علی احمد تالپور جیسے لوگ شامل تھے۔ وہ روس اور چین کی طرز پر انقلاب لا کر اقتدار میں آنے کے حق میں تھے۔ وہ اس بات کے خلاف تھے کہ پیپلز پارٹی کو انتخابات میں حصہ لینا چاہیے۔

دوسرا گروپ جس کی قیادت مخدوم آف ہالا کر رہے تھے، وہ انتخابات میں حصہ لینے کے حامی تھے۔

بھٹو صاحب نے مخدوم آف ہالا کی حمایت کر دی اور یوں انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔

بھٹو صاحب نے اپنی انتخابی مہم سندھ سے شروع کی اور امین فہیم کو اپنے ساتھ رکھا۔ وہ ہر جگہ بھٹو صاحب کے ساتھ جلسے جلوسوں میں شریک ہوتے رہے۔

جب الیکشن کا رزلٹ آیا تو سب لوگ ششدر رہ گئے۔ امین فہیم کا خیال تھا کہ ان کا کام ختم ہو گیا تھا۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے جاپان چلے گئے۔ وہ ابھی دنیا گھومنا پھرنا چاہتے تھے۔

امین فہیم ابھی اپنی نئی منزل پر پہنچے ہی تھے کہ انہیں جام صادق علی کی کال آئی۔ بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ امین فہیم ان کی ایک خالی کی ہوئی نشست پر ضمنی انتخابات میں حصہ لیں۔ شروع میں امین فہیم نے مزاحمت کی تاہم واپس آ کر الیکشن لڑا اور جیت گئے۔ انہیں سندھ کے گورنر ممتاز بھٹو کا فوڈ اور ایگریکلچر ایڈوائزر مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصے بعد امین فہیم کو اسلام آباد لے آیا گیا جب بھٹو صاحب اس ملک کو نیا آئین بنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے، وہ آئین بننے کے تمام مراحل میں شریک رہے۔ بھٹو صاحب نے انہیں وزیر مملکت برائے کیبنٹ ڈویژن اور پارلیمانی امور بنا دیا۔

میں اس دوران خاموشی سے بیٹھا یہ سب کچھ سنتا رہا تھا۔ جونہی امین فہیم نے پیپلز پارٹی کے ساتھ شروع کیے گئے اپنے سیاسی سفر کی کہانی ختم کی، میں نے ان سے پوچھا کہ سیاست میں اتنا اچھا سٹارٹ لینے کے باوجود بھٹو صاحب کا اتنا برا انجام کیوں ہوا؟

امین فہیم شاید اتنی جلدی اس سوال کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ وہ خاصی دیر خاموش رہے۔ اپنے آپ کو تھوڑا سنبھالا اور پھر انہوں نے بولنا شروع کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیرونی طاقتوں نے بھٹو صاحب پر اپنا دباؤ بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ملکی معاملات چلانے کے لیے بھٹو صاحب کو چند غلط مشورے بھی دیے گئے۔ دراصل وہ لوگ بھٹو صاحب کے اس انجام کے ذمہ دار تھے جو شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار تھے۔

میں نے امین فہیم سے ان لوگوں کے نام پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ یہ بتانے کے لیے تیار نہیں تھے اور کہنے لگے کہ اب وہ اپنے دوستوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو پہلے ہی

وفات ہو چکے تھے۔

امین فہیم کا خیال تھا کہ دو چیزیں بھٹو صاحب کے خلاف گئیں۔ پہلی بات تو یہ کہ جس نے بھی بھٹو صاحب کو وقت سے پہلے 1976ء میں سے انتخابات کرانے کا مشورہ دیا تھا اس نے ان کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کا ابھی ایک سال باقی تھا۔ جو بڑے اچھے طریقے سے چل رہی تھی۔ ملک میں سے انتخابات کا اعلان کرنے کے فوراً بعد ایک پنڈورا باکس کھڑا کیا گیا جس کے نتیجے میں آگے جا کر بھٹو صاحب کی جان چلی گئی۔ دوسرے یہ کہ جن لوگوں نے بھٹو صاحب اور پارٹی کے مخلص لوگوں کو نامقابلہ کامیاب کروایا تھا انہوں نے بھی بھٹو صاحب کے ساتھ کوئی اچھا کام نہیں کیا تھا بلکہ ایک طرح سے انہوں نے بھٹو صاحب کے زوال کی بنیاد رکھ دی تھی۔

میں نے کہا کہ امین فہیم صاحب! بھٹو صاحب ایک بڑے لیڈر تھے۔ انہوں نے کیوں اس طرح کا مشورہ قبول کیا اپنے آپ کو بلا مقابلہ کامیاب کرایا؟

امین فہیم نے [illegible] بات کہی تھی۔ بھٹو صاحب نے اس طرح [illegible]

[illegible]

دیا گیا۔

بھٹو صاحب کو پھانسی دی جا چکی تھی۔ اکثریت کا خیال تھا کہ اب پیپلز پارٹی ختم ہو جائے گی۔ پیپلز پارٹی تتر بتر ہو چکی تھی۔ بھٹو کے وفاداروں کو سندھ میں تشدد اور موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔ وفادار لوگوں پر زندگیاں تنگ کر دی گئی تھیں۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ بھٹو سے محبت کرتے تھے۔ امین فہیم کے اپنے دو بھائیوں مخدوم خلیق الزماں اور رفیق الزماں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ جنرل ضیاء کو [illegible] مخدوم خلیق ضیاء کے آگے نہیں جھکی۔ ایک مرحلے پر جنرل ضیاء نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ [illegible] سے تنگ آ چکے ہیں اور اب وہ مخدوم آف ہالا کو اپنے ساتھ ملانا چاہتے ہیں۔ [illegible] کے لیے جنرل ضیاء سندھ میں نئے سیاسی دوست بنانا چاہتے تھے۔

بریگیڈیئر امتیاز ان دنوں سندھ میں آئی ایس آئی کے انچارج تھے۔ انہوں نے امین فہیم [illegible]

[illegible]

بریگیڈیئر امتیاز نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئی تھیں۔ وہ امین فہیم کے پیچھے لگے رہے۔ آخر امین فہیم مان گئے لیکن انہوں نے بریگیڈیئر امتیاز کے سامنے یہ شرط رکھی کہ وہ اس صورت میں سندھ حکومت میں شامل ہوں گے اگر ان کے ساتھ جام صادق علی اور غلام علی نظامانی کو بھی وزیر بنایا جائے۔ جام صادق علی ان دنوں لندن میں جلاوطنی کے دن گزار رہے تھے۔

بریگیڈیئر امتیاز نے انہیں وزیر بنانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ بھارتی ایجنٹ ہیں۔ یہ عجیب بات تھی کہ بعد میں اسی اسٹیبلشمنٹ اور سیکرٹ ایجنسیوں نے اسی بھارتی ایجنٹ جام صادق علی کو 1991-93 میں سندھ کا وزیر اعلیٰ بنا کر پیپلز پارٹی کے خلاف استعمال کیا۔

جب جنرل ضیاء کو مخدوم طالب المولیٰ کے انکار کا پتہ چلا تو انہوں نے خود ان سے ملنے کی خواہش کی لیکن مخدوم طالب المولیٰ نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔

جب یہ ساری بات حد سے آگے بڑھ گئی تو امین فہیم امریکہ چلے گئے جہاں 17 اگست 1988ء کو انہوں نے جنرل ضیاء کے طیارے کے گرنے کی خبر سنی۔

امین فہیم فوراً واپس پاکستان لوٹ آئے۔ پیپلز پارٹی نے انتخابات میں اکثریت حاصل کی۔ اسٹیبلشمنٹ نے ایک دفعہ پھر اپنا کھیل شروع کر دیا۔ وہ بھٹو خاندان میں سے کسی کو بھی وزیر اعظم بنانے پر تیار نہیں تھے۔ اب کی دفعہ اسٹیبلشمنٹ امین فہیم کو توڑ کر ملک کا وزیر اعظم بنانا چاہتی تھی۔ ایک دن امین فہیم کو پتہ چلا کہ فرزندِ راولپنڈی شیخ رشید احمد جو اس وقت سیاست میں اتنے نہیں جانے جاتے تھے اور چوہدری نثار علی خان ان سے ملنے کے لیے آ رہے تھے۔ ان دونوں نے اس وقت کے آرمی چیف جنرل اسلم بیگ اور صدر غلام اسحاق خان کا ایک پیغام انہیں دیا کہ وہ بینظیر بھٹو کو چھوڑ کر اس ملک کے نئے وزیر اعظم بن جائیں۔ امین فہیم کو بتایا گیا کہ انہیں سندھ سے قابل اعتماد بندے کی ضرورت ہے۔ آرمی چیف اور صدر بینظیر بھٹو کے بجائے انہیں وزیر اعظم بنانا چاہتے ہیں۔ ان دونوں نے یہ تجویز دی کہ وہ پارٹی کے اندر ایک فارورڈ بلاک بنائیں لیکن امین فہیم نے انکار کر دیا۔

میں نے امین فہیم سے پوچھا کہ جب آپ کے خاندان نے پیپلز پارٹی کے لیے اتنی قربانیاں دی تھیں اور وہ بھٹو فیملی کے وفادار بھی رہے پھر بھی بینظیر بھٹو نے انہیں اس ملک کا وزیر اعظم نہیں بننے دیا۔

امین فہیم نے قہقہہ لگایا اور بولے کہ جب ان کی بینظیر بھٹو صاحبہ سے 11 اکتوبر 2002ء کو دبئی میں ملاقات ہوئی تھی تو محترمہ نے انہیں پیپلز پارٹی حکومت بنانے کا پورا اختیار دے دیا تھا۔ محترمہ نے امین فہیم سے کہا تھا کہ وہ پی ایم ایل کیو کی لیڈرشپ سے پاور شیئرنگ معاہدے کے لیے گفتگو شروع کریں۔ امین فہیم کو اس وقت شدید مایوسی ہوئی جب ان مذاکرات میں ان کے سامنے یہ شرط رکھی گئی کہ وزیر اعظم بننے کے بعد بینظیر بھٹو سے کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے۔

میں نے کہا کہ مخدوم صاحب! عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ بینظیر بھٹو نہیں چاہتی تھیں کہ پیپلز پارٹی میں سے کوئی سندھی لیڈر وزیر اعظم بنے کیونکہ اس کے بعد ان کی اپنی بارگیننگ پوزیشن بہت کمزور ہو جاتی۔

امین فہیم نے بڑی شدت سے اس تاثر کو مسترد کیا اور کہا کہ بینظیر بھٹو واقعی انہیں وزیر اعظم بنانا چاہتی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ آصف علی زرداری کو 2002ء کے انتخابات کے بعد حکومت بنانے کے لیے ہونے والے مذاکرات میں شامل کیا گیا تھا۔

میں نے کہا کہ امین فہیم صاحب! یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کے بیٹے کو بھی سندھ کا وزیر اعلیٰ نہ بنانے میں بینظیر بھٹو کا بڑا ہاتھ تھا حالانکہ جنرل مشرف اور آپ کے ساتھی ان کے بیٹے کو یہ عہدہ دینے کے لیے تیار تھے۔

امین فہیم نے یہ کہہ کر پھر بینظیر بھٹو کا دفاع کیا کہ ایسی بات ہرگز نہیں تھی۔ جب انہیں جنرل مشرف کی طرف سے یہ پیشکش کی گئی کہ وہ اپنے بیٹے کو سندھ کا چیف منسٹر بنوا لیں تو انہوں نے محترمہ سے رابطہ کر کے یہ ساری بات انہیں بتائی تھی۔ محترمہ نے انہیں کہا تھا کہ وہ اپنی پارٹی کے لوگوں کو اعتماد میں لے لیں اور سب لوگ تقریباً اس پر راضی بھی ہو گئے تھے۔ جنرل مشرف اور پیپلز پارٹی کے درمیان ایک تحریری ڈیل ہو چکی تھی۔ جنرل مشرف نے ان کے بیٹے کو وزیر اعلیٰ سندھ بنانے کی منظوری دے دی تھی۔ چوہدری شجاعت حسین اور وزیر اعظم ظفر اللہ جمالی نے کراچی پہنچ کر ایک پریس کانفرنس میں ان کے بیٹے کو چیف منسٹر بنانے کا اعلان کرنا تھا۔

اس پریس کانفرنس سے چند گھنٹے پہلے امین فہیم کو ایک ٹیلیفون کال آئی۔ انہیں کہا گیا کہ وہ اپنے بیٹے کو کہیں کہ اگر وہ وزیر اعلیٰ بننا چاہتے ہیں تو پہلے پیپلز پارٹی سے اعلانِ لاتعلقی کریں۔

[illegible]

○○○

[illegible]

جنرل مشرف کا خیال تھا کہ شاید مدہوشی کے ان لمحات میں امین فہیم شاید بہک جائیں۔ ابھی تو ابھی کئی گرہیں نہیں کھلی ہوئی تھیں۔ یہاں وہ دونوں ایک دوسرے کو داد تحسین دیتے رہے اور 2002 والی نسبت اب کی دفعہ امین فہیم بینظیر بھٹو اور جنرل مشرف کو ایک نیا معاہدہ کرنے پر تیار کر چکے تھے۔ اب کی دفعہ جنرل مشرف بدلتے ہوئے عالمی اور ملکی حالات کے پیش نظر بینظیر بھٹو کو وزیراعظم بنانے پر تیار ہو گئے تھے۔

[illegible]

امین فہیم سے میرا تعارف 2008ء کے شروع میں ہوا جب فروری کے انتخابات کے بعد وہ اپنے آپ کو پاکستان کا وزیراعظم سمجھنے لگ گئے تھے۔ اس میں ان کا قصور بھی نہیں تھا کیونکہ نوڈیرو میں بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد ہونے والی پریس کانفرنس میں آصف علی زرداری صاحب نے اپنے آپ کو بلاول بھٹو زرداری کے ساتھ کو چیئرپرسن منتخب کرا کر یہ اعلان کیا تھا کہ امین فہیم ان کے وزارت عظمیٰ کے امیدوار ہوں گے۔

29 دسمبر 2007ء کو نوڈیرو میں ہونے والی اس پریس کانفرنس میں میں بھی موجود تھا۔ میں وہاں بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد اپنے اخبار دی نیوز کے لیے رپورٹنگ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ فروری کے انتخابات میں جب پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کر لی تو امین فہیم نے اپنے آپ کو ملک کا وزیراعظم سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے چالیس سال پرانے دوست سینیٹر انور بیگ نے امین فہیم کو اسلام آباد میں غیر ملکی سفیروں سے ملانا شروع کر دیا تھا۔ بہت سارے سفیر تو خود امین فہیم سے ملنا چاہتے تھے تاکہ وہ ملک کے نئے وزیراعظم کو قریب سے دیکھ کر ان کے بارے میں اپنا ایک تاثر قائم کریں۔ انور بیگ کے ڈپلومیٹک انکلیو میں بہت زیادہ تعلقات تھے جس کا مظاہرہ انہوں نے اس وقت کر کے دکھایا جب بینظیر بھٹو پاکستان واپس آئیں اور انور بیگ نے پارلیمنٹ ہاؤس میں سو سے زیادہ غیر ملکی سفیروں کو ایک چھت تلے بینظیر بھٹو کی تقریر سننے کے لیے اکٹھا کر دیا تھا۔ بینظیر بھٹو بھی انور بیگ کے انہی زیادہ تعلقات سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ اب جبکہ بینظیر بھٹو نہیں رہی تھیں تو انور بیگ نے اپنے دوست امین فہیم کو ڈپلومیٹک انکلیو میں متعارف کرانا شروع کر دیا تھا۔ اس میں انور بیگ کا قصور بھی نہیں تھا کیونکہ یہ آصف علی زرداری ہی تھے جنہوں نے نوڈیرو میں بیٹھ کر امین فہیم کو پاکستان کا وزیراعظم بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ امین فہیم اور انور بیگ کے ذہن میں بھی یہ نہیں آ سکتا تھا کہ انتخابات کے بعد آصف علی زرداری صاحب کی ترجیحات یکسر بدل چکی تھیں۔ امین فہیم کو وزیراعظم بنانے کا اعلان محض پارٹی کے اندر اپنے خلاف ہونے والی کسی بھی بغاوت کو رونما ہونے سے روکنا تھا۔ بینظیر بھٹو کے بعد اگر کوئی پارٹی کا لیڈر بن سکتا تھا تو وہ امین فہیم تھے جو اس وقت پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے چیئرمین تھے۔ نوڈیرو میں ہونے والی وہ میٹنگ جس میں بینظیر بھٹو کی وصیت پڑھ کر سنائی گئی اور زرداری صاحب نے پارٹی اپنے قبضے میں لے لی، میں امین فہیم بغاوت پر اتر آتے تو شاید آصف زرداری

صاحب کے لیے پارٹی پر قبضہ کرنا اتنا آسان نہ رہتا۔ یوں بڑی سمجھداری سے امین فہیم کو کسی بھی متوقع بغاوت سے باز رکھنے کے لیے آصف زرداری نے وقتی طور پر انہیں وزیراعظم بنانے کا اعلان کیا لیکن بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ وہ ان کی ایک سیاسی چال تھی۔ لیکن امین فہیم آخری دن تک جب تک یوسف رضا گیلانی کے نام کا اعلان نہیں کیا گیا، اپنے آپ کو وزیراعظم کا امیدوار سمجھتے رہے۔

جب انور بیگ امین فہیم کو سفیروں سے ملوا رہے تھے، اس وقت آصف زرداری صاحب ابھی بھی نوڈیرو میں موجود تھے۔ جب مجھے ان ملاقاتوں کا علم ہوا تو میں نے دی نیوز میں اس کی ایک سٹوری فائل کی۔ اور تو اور، امریکی سفیر بھی انور بیگ کے گھر پر آ کر خصوصی طور پر امین فہیم سے ملی تھیں اور انہوں نے بھی ایک طرح سے اپنی طرف سے کلیئرنس چٹ دے دی تھی۔ انور بیگ اور امین فہیم نے اپنے تئیں ہوم ورک پورا کر لیا تھا۔ جب امریکن سفیر کو ان کے وزیراعظم بننے پر اعتراض نہیں تھا تو باقی پھر پیچھے کیا رہ جاتا تھا۔ یوں امین فہیم کے وزیراعظم بننے میں چند دن باقی رہ گئے تھے۔

جب یہ سٹوری چھپی تو مجھے انور بیگ نے فون کر کے کہا کہ کلاسرا صاحب! آپ نے تو امین فہیم کے وزیراعظم بننے کے امکانات تقریباً ختم کر دیے ہیں۔ میں بڑا حیران ہوا تو وہ بولے کہ آج امین فہیم کی کچھ مغربی سفارتکاروں سے ملاقاتیں تھیں۔ اس خبر کے چھپنے کے فوراً بعد امین فہیم کو بتایا گیا تھا کہ وہ تمام ملاقاتیں چھوڑ کر فوری طور پر نوڈیرو پہنچیں۔ آصف زرداری صاحب ان سے کچھ صلاح مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ بیگ صاحب کا خیال تھا کہ یہ صلاح مشورہ محض بہانہ تھا۔ دراصل زرداری صاحب نہیں چاہتے تھے کہ امین فہیم غیر ملکی سفیروں سے ملیں۔

اس کا مطلب بڑا واضح تھا کہ آصف زرداری کا ذہن تبدیل ہو چکا تھا اور امین فہیم اب اس ملک کے نئے وزیراعظم نہیں ہوں گے۔

وہی ہوا جس کا اندیشہ انور بیگ نے ظاہر کیا تھا۔ نوڈیرو سے واپسی پر امین فہیم کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کی کہانی ختم ہو گئی ہے، لیکن انہوں نے بھی آخری لمحوں تک آصف زرداری پر اپنا دباؤ رکھنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے انہی دنوں میں امین فہیم کے حق میں خبریں دینا شروع کیں کیونکہ میرا خیال تھا کہ ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی۔ یہ آصف زرداری ہی تھے جنہوں نے انہیں خود وزیراعظم بنانے کی بات کی

تھی اور آپ امین فہیم صاحب سے خوش نہ تھے۔ ان دنوں میرے علاوہ دوسرے تمام صحافی یہی لکھ رہے تھے کہ آصف زرداری صاحب چاہتے ہیں۔ کسی صحافی نے ان سے سوال کرنا ہوتا تو کسی کے پاس ہمت نہ تھی کیونکہ وہ کوئی شخص ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان سے بات کا موقع ملتا تھا۔

امین فہیم اور آصف زرداری کے درمیان اختلافات پارٹی قیادت کی وجہ سے بڑھتے جا رہے تھے۔ پیپلز پارٹی کے لوگوں کو بھی یہ اندازہ ہونا شروع ہو گیا تھا کہ ہوا کا رخ بدل گیا ہے۔ ایک دن زرداری صاحب نے اسلام آباد کے صحافیوں کو ایف سیون میں واقع زرداری ہاؤس میں شام کے کھانے پر بلایا۔ سب سے بڑے اور چھوٹے صحافی تک سب وہاں شریک ہوئے۔ ہمارا خیال تھا کہ زرداری صاحب شاید صحافیوں کے منہ سے کچھ باتیں سننا چاہتے تھے۔ لیکن حیرانی ہے کہ وہ مجھے تک خود ہی بولتے رہے اور انہوں نے کسی کو بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ کھانے کے بعد صحافی انہیں گھیرے کھڑے تھے۔ اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ یوسف رضا گیلانی اور شاہ محمود قریشی ان کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ زرداری صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ میرے خیال میں انہیں کس کو وزیراعظم بنانا چاہیے؟ میں نے ان سے کہا کہ صحافی ہونے کے ناطے یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں انہیں مشورے دوں کہ وہ کس کو وزیراعظم بنائیں یا کس کو نہ بنائیں۔ یہ بات انہیں اپنی پارٹی کے لوگوں سے پوچھنی چاہیے۔

زرداری صاحب نے اپنی روایتی مسکراہٹ کے درمیان مجھ سے پھر پوچھا کہ نہیں آپ مجھے بتائیں کہ میں کسے وزیراعظم بناؤں۔ میں نے پھر وہی عذر پیش کیا۔

اب کی بار زرداری صاحب نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو کسی کو مشورہ نہیں دینا چاہیے لیکن میں آپ سے خود پوچھ رہا ہوں لہٰذا آپ مجھے بتائیں۔

میرے لیے یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا کیونکہ انہی دنوں یہ خبریں آنا شروع ہو گئی تھیں کہ آصف علی زرداری امین فہیم کے علاوہ احمد مختار، شاہ محمود قریشی اور یوسف رضا گیلانی میں سے کسی ایک کو وزیراعظم بنانا چاہتے تھے۔ گیلانی صاحب اور قریشی صاحب میرے سامنے کھڑے تھے۔ دونوں سے میرا اچھا تعلق تھا۔

میں نے زرداری صاحب سے کہا کہ میرے خیال میں انہوں نے خود ہی یہ اعلان کیا تھا کہ وہ

امین فہیم کو وزیراعظم بنائیں گے لہٰذا انہیں اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے۔ تاہم میں نے زرداری صاحب کو یاد دلایا کہ انہوں نے اسی طرح کا ایک وعدہ یوسف رضا گیلانی سے بھی کر رکھا ہے۔

زرداری صاحب نے حیرانی سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ کون سا وعدہ؟

یوسف رضا گیلانی اور ارد گرد کھڑے صحافیوں نے مجھے چونک کر دیکھا۔ میں نے زرداری صاحب کو یاد دلایا کہ جب احتساب عدالت کے جج نے یوسف رضا گیلانی کو سات سال کی قید سنائی تھی تو وہ اسی وقت عدالت میں موجود تھے۔ یہ زرداری صاحب ہی تھے جنہوں نے اونچی آواز میں یہ کہا تھا کہ جج صاحب! آپ یوسف رضا گیلانی کو نہیں بلکہ ملک کے مستقبل کے صدر پاکستان کو سزا سنا رہے ہیں۔

میں نے کہا زرداری صاحب میرا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ جج صاحب کو کہے ہوئے اپنے الفاظ پر عملدرآمد کرا سکتے ہیں۔

زرداری صاحب نے میری بات سنی اور فوراً بولے کہ ہاں مجھے یوسف رضا گیلانی سے کیا ہوا اپنا وعدہ یاد ہے۔

اس کھانے سے ہم فارغ ہوئے تو سب پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اب کسی صورت بھی امین فہیم اس ملک کے وزیراعظم نہیں بننے والے تھے۔ اب مقابلہ یوسف رضا گیلانی، شاہ محمود قریشی اور احمد مختار کے درمیان تھا۔

انہی دنوں حسین حقانی بھی امریکہ سے آئے ہوئے تھے اور ہر وقت وہ زرداری صاحب کے قریب موجود رہتے۔ انہوں نے کچھ عرصہ صحافت کی ہوئی تھی لہٰذا انہیں صحافیوں کی پروفیشنل کمزوریوں کا بھی علم تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کا گُر بھی جانتے تھے۔ ان کے خلاف اخبارات میں خبریں آنا شروع ہو گئی تھیں اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طریقے سے ان کا تدارک کیا جائے۔ میں بڑا حیران ہوا جب انہوں نے مجھے فون کیا اور بڑے اچھے طریقے سے بات چیت کی اور بات گول کر کے کہا کہ وہ مجھے اندر کی بہت ساری سیاسی خبریں دے سکتے ہیں لیکن اس کے بدلے میں مجھے تھوڑی حد تک ان کے مفادات کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔

مجھے متاثر کرنے کے لیے انہوں نے کہا کہ میں آپ کو ایک ایسی خبر دے رہا ہوں جو کسی کے

پاس نہیں ہے۔ یہ حسین حقانی تھے جنہوں نے مجھے یہ خبر دی تھی کہ یوسف رضا گیلانی ہی اس ملک کے نئے وزیر اعظم ہوں گے۔

ان دنوں جب یوسف رضا گیلانی کا نام دور دور تک بننے میں نہیں آتا تھا یہ حسین حقانی ہی تھے جنہیں اس بات کا علم تھا کہ یہ ساری بحث فضول تھی کہ کون وزیر اعظم بنے گا۔ اگر کسی نے وزیر اعظم بننا تھا تو وہ یوسف رضا گیلانی تھے۔

جس طریقے سے حسین حقانی نے مجھ سے خبروں کا سودا کرنے کی کوشش کی تھی وہ شاید میرے لیے قابل قبول نہیں تھا اور یوں اس ایک واقعہ کے بعد میرا اور ان کا زیادہ رابطہ نہیں رہا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں نے یوسف رضا گیلانی کے وزیر اعظم بننے کی خبر اخبار میں نہیں دی کیونکہ میرا خیال تھا کہ جب میں حسین حقانی کی خواہش پر ان کے چند مفادات کا خیال نہیں رکھ سکتا تھا تو پھر مجھے ان کی دی ہوئی اس خبر کو بھی کسی طرح بھی استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

امین فہیم بڑی تیزی سے اپنی پارٹی میں تنہا ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے تمام ساتھی جن پر وہ بہت بھروسہ کرتے تھے وہ انہیں ایک ایک کر کے چھوڑتے جا رہے تھے۔ امین فہیم نے بھی آخری دم تک لڑنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ قومی اسمبلی میں وزیر اعظم کا انتخاب لڑیں گے اور اس کے لیے انہیں آصف علی زرداری کی نامزدگی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ پیپلز پارٹی پارلیمنٹرین کے چیئرمین ہیں۔ امین فہیم کا خیال تھا کہ سندھ سے بہت سے ایم این اے ان کا ساتھ دیں گے۔ خصوصاً ان کو نوید قمر پر مان تھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ بدر الدین نوید قمر ان کی وجہ سے اپنے حلقے سے جیتتے تھے۔ اگر وہ نوید قمر کے حلقے میں موجود اپنے مریدوں کو انہیں ووٹ ڈالنے کا نہ کہیں تو نوید قمر کبھی نہیں جیت سکتے تھے۔

امین فہیم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا جھٹکا اس وقت لگا جب نوید قمر نے ان کی نامزدگی کے کاغذات پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ نوید قمر جیسا شخص بھی انہیں اس مشکل مرحلے میں یوں چھوڑ جائے گا۔

اگر پیپلز پارٹی کے دوستوں کے ہاتھوں دھوکا کھانے میں کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ راجہ پرویز اشرف نے پوری کر دی۔ یہ وہی راجہ پرویز اشرف تھے جو سینیٹر انور بیگ کے گھر پر رات کو دی گئی پارٹی میں اکیلے اس وقت احتراماً کھڑے ہو جاتے جب امین فہیم باتھ روم جانے کی نیت سے صوفے سے اٹھتے تھے۔ جب امین فہیم باتھ روم سے واپس لوٹتے تو بھی راجہ پرویز اشرف ایک دفعہ پھر احتراماً کھڑے ہو جاتے تاکہ امین فہیم کو پتہ چلے کہ وہ ان کی دل سے کتنی عزت کرتے ہیں۔ تاہم، جب امین فہیم کو ان کی ضرورت پڑی تو راجہ پرویز اشرف نے ان کا فون تک سننے سے انکار کر دیا۔

امین فہیم بھول گئے تھے کہ بینظیر بھٹو مر چکی تھیں۔ اب آصف علی زرداری پارٹی کے صدر تھے اور نوید قمر اور راجہ پرویز اشرف جیسے لوگ نئے بادشاہ کے درباری بن چکے تھے۔ اگر اس لمحے کوئی بھی شخص امین فہیم کے ساتھ اپنی پوری طاقت کے ساتھ کھڑا تھا تو یہ انور بیگ تھے۔ ان دونوں کی دوستی کراچی میں 1960 کی دہائی میں شروع ہوئی تھی۔ اپنی دوستی کو پکا رنگ دینے کے لیے دونوں نے اپنے بڑے بیٹوں کے نام ایک جیسے رکھے تھے۔ آج ان دونوں کے بیٹے ان کی دوستی کی طرح اپنی عمر کی چالیس سے زیادہ بہاریں دیکھ چکے ہیں۔

انور بیگ کے اسلام آباد کے میڈیا اور ڈپلومیٹک حلقے میں بے پناہ تعلقات تھے جس کا سارے کا سارا فائدہ امین فہیم کو ہو رہا تھا۔ انور بیگ کے ان تعلقات کی وجہ سے ہی امین فہیم کو عوام میں ہمدردیاں مل رہی تھیں اور یہ سمجھا جا رہا تھا کہ زرداری صاحب نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

آصف علی زرداری کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اس وقت امین فہیم کے ساتھ اگر کوئی شخص اپنی دوستی نبھا رہا ہے تو وہ سینیٹر انور بیگ ہیں۔ زرداری صاحب نے اپنے قریبی دوست فیصل بٹ کو ایک رات انور بیگ کے گھر بھیجا اور انہیں بڑا دوستانہ مشورہ دیا کہ وہ امین فہیم کی حمایت سے باز آ جائیں اس کے بدلے میں ان کا خیال رکھا جائے گا۔

انور بیگ اپنی پارٹی کے لیڈروں، نوید قمر اور راجہ پرویز اشرف کی طرح سیاست نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں یہ پتہ نہیں تھا کہ سیاستدان دوستیوں کے لیے نہیں بلکہ اقتدار کے لیے سیاست کرتے ہیں۔ انہوں نے بڑی شائستگی سے فیصل بٹ کو یہ کہا کہ وہ امین فہیم کے چالیس سال پرانے دوست ہیں اور اس مرحلے پر محض سیاسی مفادات کے لیے ان سے تعلقات ختم کرنا ان کے لیے مشکل ہے۔

یوں زرداری صاحب کا یہ پیغام ٹھکرا کر انور بیگ نے دوستی کے نام پر اپنا سیاسی کیریئر تباہ کر لیا تھا۔ ان کے نزدیک ان کی دوستی ان کے سیاسی کیریئر سے زیادہ اہم تھی۔

وقت آگے نکل گیا تھا۔ یوسف رضا گیلانی وزیر اعظم بن چکے تھے۔ آصف علی زرداری ابھی

تھی۔ انور بیگ سے شدید ناراض تھے۔ انہوں نے انور بیگ کو ایک پیغام بھیجا کہ وہ مخالفت کی [illegible] سے
دستبردار ہو جائیں۔ [illegible] انہوں نے صدر صاحب کو بتایا کہ [illegible]
انور بیگ صاحب [illegible] مخالفت سے [illegible] اگر ان سے اس وقت
[illegible] کہ انہیں امین فہیم کے ساتھ وفاداری کی سزا دی جا رہی ہے۔ مگر زرداری
صاحب کو یہ بات سمجھ میں آ گئی اور انہوں نے انور بیگ کے استعفیٰ پر زیادہ اصرار نہیں کیا۔

اب دو سال کے عرصے میں سینیٹ کے لیے انتخابات ہونے لگے تو انور بیگ ٹکٹ اپلائی کرنے
کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کا دل اس وقت بے طرح ٹوٹ گیا جب انہیں یہ پتہ چلا کہ مخدوم امین فہیم نے
ان کی جانب سے معذرت کر کے ان لوگوں کا نام ٹکٹ کے لیے دیا تھا۔ انہیں اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا
کہ ان کا چالیس سال پرانا دوست ان کے ساتھ اس طرح کی حرکت کر سکتا ہے۔ تاہم کچھ لوگوں نے
انور بیگ کو سمجھایا کہ انہیں پارٹی ٹکٹ کے لیے ضرور اپلائی کرنا چاہیے۔ یہ ضرور تھا کہ انہیں ٹکٹ نہیں ملے
گا لیکن کم از کم یہ بوجھ پیپلز پارٹی کے کندھوں پر رہے گا کہ انہوں نے انہیں ٹکٹ دینے سے انکار کیا تھا۔
وہی ہوا، آصف علی زرداری صاحب نے انور بیگ کو ٹکٹ دینے سے انکار کر دیا۔

کچھ عرصے بعد کسی دوست نے آصف علی زرداری سے انور بیگ کو ٹکٹ نہ دینے اور ان کے
ساتھ اچھا سلوک نہ رکھنے کی شکایت کی تو انہوں نے آگے سے یہ کہا کہ آپ اس بات پر شکر کریں کہ
انور بیگ ابھی تک زندہ ہے۔

انور بیگ کے بعد یوسف تالپور بھی ان لیڈروں میں سے تھے جو امین فہیم کے حامی تھے اور وہ
اپنی اس حمایت کو کھل کر بیان بھی کرتے۔

اسی انتظار میں یہ خبریں آنا شروع ہو گئیں کہ امین فہیم کے لیے اقتدار سے باہر رہنا مشکل ہو رہا
تھا۔ ان کے گھر سے ان پر پریشر پڑنا شروع ہوا کہ وہ کس چکر میں پڑ گئے ہیں۔ بارہ سال بعد پیپلز پارٹی
اقتدار میں آئی ہے۔ وہ دن رات بینظیر بھٹو کے لیے بھاگ دوڑ کرتے رہے تھے اور آج جب پھل
کھانے کا وقت آیا تو وہ اقتدار سے باہر تھے۔ گھر کے خرچ چلانا بھی اب مشکل لگ رہا تھا۔ اب انہیں کچھ
نہیں آ رہی تھی کہ آصف علی زرداری کو کیسے راضی کیا جائے۔ آخر مخدوم صاحب کی کراچی والی بیگم کو ایک
طریقہ سوجھا۔ انہوں نے سندھی روایات کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ کراچی سے جہاز پکڑا اور

پہنچی اور ایوانِ صدر گئیں۔ اپنے بھائی آصف علی زرداری سے ملیں۔ اپنے شوہر کی غلطیوں پر ایک بہن
نے بھائی سے معذرت کی۔ اب ایک سندھی بلوچ کے لیے یہ مشکل ہو گیا تھا کہ وہ مخدوم امین فہیم کی بیوی
کے معذرت نامے کو نظر انداز کرتا۔

یوں ایک بلوچ سردار نے طالب المولیٰ کے اس بیٹے کو معاف کر کے واپس بلا لیا جس نے کبھی
اپنے باپ کو بھٹو کی پارٹی جائن کرنے کے لیے پتہ نہیں کتنے ترلے ڈال کر راضی کیا تھا اور بھٹو صاحب
نے ایک بڑا تاریخی جملہ کہا تھا کہ مخدوم آف ہالا کا ان کی پارٹی میں آنے سے وہ سندھ میں اپنا آدھا
الیکشن جیت گئے ہیں۔ آج اسی مخدوم طالب المولیٰ کی بہو ذوالفقار علی بھٹو کے داماد سے اپنے
شوہر کی جان بخشی اور اسے کسی مال بنانے والی وزارت کا وزیر بنانے کی درخواست کر رہی تھی۔

آصف علی زرداری

مجھے سیاستدانوں کے انکشافات پر مبنی سیاسی پروفائل کرتے ہوئے کچھ ماہ گزر گئے تھے۔ یہ سلسلہ بڑی تیزی سے دی نیوز کے قارئین میں پاپولر ہو رہا تھا۔ اردو اخبارات بھی ان پروفائلز میں سے سنسنی خیز خبریں نکال کر اور ان کا ترجمہ کر کے چھاپ رہے تھے۔ کالم نگار دوستوں نے بھی ڈھیر سارے اپنے کالموں میں ذکر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان سب کے لیے یہ نئی چیز تھی کہ ماضی کے سیاستدانوں کے سینوں میں اتنے راز چھپے ہوئے تھے جو اب دھیرے دھیرے باہر نکل رہے ہیں۔

آصف زرداری ان دنوں جنرل مشرف کے زیر عتاب تھے۔ غلام اسحاق خان سے لے کر نواز شریف، فاروق لغاری اور اب جنرل مشرف نے آصف زرداری کو سیدھا کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ ہر ایک نے اپنے اپنے دور میں آصف زرداری پر کیسز بنائے۔ انہیں جیلوں میں رکھا اور انہیں اپنے تئیں سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ سرکاری وکیلوں اور ان مقدمات پر کروڑوں روپے خرچ کیے گئے۔ ایک دفعہ تو قاعدہ آڈیٹر جنرل پاکستان نے اپنی ایک رپورٹ میں آصف زرداری پر بنائے گئے ان مقدمات پر خرچ ہونے والے کروڑوں روپوں کو قومی خزانے پر ایک بوجھ اور غیر قانونی قرار دیا تھا۔ جب میں نے وہ رپورٹ چھاپی تھی تو سینیٹر رضا ربانی نے پڑھ کر اس کی کاپی مجھ سے مانگی تھی۔ اب پتہ نہیں کہ انہوں نے اس سرکاری دستاویز کا کیا استعمال کیا تھا۔

آصف زرداری کی میڈیا کے ساتھ ایک عجیب سی Love and hate [illegible] ہے۔ جب وہ جیل سے باہر ہوتے ہیں تو یہی میڈیا ان کے خلاف [illegible] دیتے ہیں کہ وہ کس طریقے سے انہیں دیوار سے لگا رہے تھے [illegible] زرداری صاحب جیل جاتے ہیں تو کچھ عرصے بعد میڈیا [illegible] نے انہیں استعمال کیا تھا کہ اب وہ انہیں جیل میں رکھ کر بے نظیر بھٹو کو اپنی مرضی کی ڈیل کرنے کے لیے مجبور کر رہے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے یہ احساس بڑھنا شروع ہو جاتا ہے کہ جناب آصف علی زرداری صاحب تو مرد حر تھے۔ وہ نہ تو نواز شریف کے دور کے احتساب سیل کے انچارج سینیٹر سیف الرحمن کی طرح عدالتوں میں بھاں بھاں کر کے روتے تھے اور نہ ہی نواز شریف اور شہباز شریف کی طرح جنرل مشرف کو تحریری معافی نامہ دے کر ایک ڈیل کے ذریعے سعودی عرب دس سال کے لیے فرار ہوتے تھے۔

آصف زرداری کی شکل میں ہمارے میڈیا کے پاس ایک ایسا دیومالائی کردار آ گیا تھا جو عدالتوں میں پیشیوں کے وقت نواز شریف یا سیف الرحمن کی طرح رونے دھونے کے بجائے چہرے پر ایک لمبی مسکراہٹ طاری کیے ہر ایک سے ملتا تھا۔ نواز شریف اور شہباز شریف کے ڈیل کر کے ملک سے چلے جانے کے بعد لوگوں کی آنکھوں میں آصف زرداری کی قدر و اہمیت اور بڑھ گئی تھی۔ بینظیر بھٹو اپریل 1999ء میں نواز شریف کی احتساب عدالتوں کے خوف سے پہلے ہی ملک چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ بچے کھچے دو نمبری سیاستدان چوہدری شجاعت کی قیادت میں جنرل مشرف کے دربار میں پی ایم ایل کیو کی بنیادیں رکھ کر ایک فوجی ڈکٹیٹر کے ہاتھوں پر بیعت کرنا شروع ہو گئے تھے۔ یوں لوگوں اور میڈیا کو یہ محسوس ہوا کہ آصف زرداری کرپٹ سہی لیکن بزدل ہرگز نہیں ہے، جس نے ایک بہادر بلوچ کی طرح کوئی ڈیل کر کے ملک سے فرار ہونے کی بجائے اپنے ملک کی جیل میں رہنا پسند کیا تھا۔ یہ علیحدہ کہانی ہے کہ کچھ عرصے بعد آصف زرداری صاحب اس وقت کے ڈی جی آئی ایم آئی ندیم تاج کے ساتھ خفیہ ملاقاتیں کر کے ایک ڈیل کے ذریعے رہا ہو کر نیویارک پہنچ گئے اور پھر وہ تین سال بعد دسمبر 2007ء میں پاکستان واپس لوٹے جب بینظیر بھٹو قتل ہوئیں اور اب وہ اس ملک کے صدر ہیں۔

میرے صحافی دوست محسن رضا نے دو تین دفعہ مجھے کہا کہ تم آصف زرداری کا ایک پروفائل

انٹرویو اپنے اخبار کے لیے کیوں نہیں کرتے۔ فرحت اللہ بابر نے بھی ایک دو موقعوں پر کچھ ایسی ہی بات کی۔ میں نے دونوں سے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ میری زرداری صاحب سے ملاقات کروا دیں، اس کے بعد میں بیٹھ کر انٹرویو کروں گا۔ یوں جون 2003 کی ایک خوشگوار دوپہر میں راولپنڈی کی احتساب عدالت کے احاطے میں پہنچ گیا جہاں آصف زرداری ایک درخت کے نیچے صحافیوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ پیپلز پارٹی کے پرانے جیالے کارکن قاضی سلطان محمود بھی وہاں موجود تھے۔ محسن رضا اور شعیب بھٹہ نے میرا آصف زرداری سے تعارف کروایا۔ انہوں نے مجھے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ اتنی دیر میں حامد میر وہاں آ گئے۔ وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر ایک فاصلے پر ایک ادھر سے سرگوشیوں میں گفتگو کرنے لگے اور میں صحافی دوستوں کے ساتھ ان کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ حامد میر سے گفتگو کرکے واپس لوٹے تو اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گئے۔ میرا ایک دفعہ پھر ان سے تعارف کروایا گیا۔

انہوں نے خاموشی سے مجھے دیکھا۔ میرے ہاتھ سے موبائل فون لے لیا۔ میں نے سمجھا وہ شاید کسی کو ٹیلی فون کرنا چاہتے ہیں۔ چند لمحوں تک وہ فون کو تکتے رہے اور پھر مجھے واپس کر دیا۔ ابھی مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میری جیب سے پین نکال لیا۔ وہ اس پین کو موبائل فون کی طرح دیکھ کر چیک کرتے رہے اور پھر مجھے واپس کر دیا۔ مجھے فوری طور پر کچھ سمجھ نہ آئی کہ آصف زرداری صاحب میرا فون اور قلم کیوں چیک کر رہے ہیں۔ اچانک میرے ذہن میں فلیش ہوا۔ دراصل زرداری صاحب میری تلاشی لے رہے تھے۔ وہ یہ دیکھنا چاہ رہے تھے کہ میں موبائل فون پر ان کی گفتگو ٹیپ تو نہیں کر رہا۔ اسی طرح پین میں کوئی ایسی ڈیوائس تو نہیں لگی ہوئی تھی جس سے ساری بات چیت محفوظ ہو رہی تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بڑی شرمندگی محسوس ہوئی۔ آصف زرداری کے بارے جو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے زرداری صاحب کو کہا کہ میرا اخلاقی ضابطہ تو یہ ہے کہ میں آپ کا انٹرویو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپ کے انتہائی قریبی دوستوں نے مجھے اس بات پر راضی کیا کہ مجھے آپ سے مل کر آپ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی کہانی قلمبند کر کے اپنے اخبار میں چھاپنی چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایک صحافی ہونے کے ناطے یہ میرا حق بنتا ہے کہ میں اپنی جیب سے کوئی بھی ٹیپ ریکارڈر نکال کر آپ کے سامنے رکھ دوں تاکہ جو بھی گفتگو ہو وہ ریکارڈ ہو۔ پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں موبائل فون میں چھپے ریکارڈر کی مدد سے اس ساری گفتگو کو محفوظ کروں۔

زرداری صاحب نے میری طرف دیکھا اور بولے کہ سوری، ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ پہلی دفعہ مجھ سے مل رہے ہیں۔ میں آپ کو نہیں جانتا، آپ مجھے نہیں جانتے۔ میری اور آپ کی پہلی ملاقات ہے۔ کسی پر اعتبار کرنے یا اس کا اعتماد جیتنے کے لیے وقت لگتا ہے۔ آپ آتے جاتے رہیں، مجھے یقیناً آپ پر بھی بھروسہ ہو جائے گا۔

مجھے خیال آیا کہ اس میں آصف زرداری کا کوئی قصور نہیں تھا۔ جب آپ سات سال ہر وقت اپنے ارد گرد پولیس کی وردیاں پہنے اجنبی لوگوں میں سوتے جاگتے ہیں اور آپ کو کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ ان میں سے کون جاسوس ہے اور کون محض اپنی ڈیوٹی دے رہا ہے تو پھر انسان کا اس طرح کا رویہ ہو ہی جاتا ہے۔

باتوں باتوں میں میں نے ان کے پوچھنے پر بتایا کہ میں نے انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا ہوا ہے تو وہ تھوڑے سے حیران ہوئے اور مجھ سے پوچھا کہ پھر تم جرنلزم میں کیا کر رہے ہو۔

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا وہ خود ہی بول پڑے کہ ہاں ٹھیک ہے کہ جب آپ زندگی میں کسی بھی شعبے میں جانا چاہتے ہیں تو پھر پریکٹیکل لائف آپ کو سب کچھ سکھا دیتی ہے۔

مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آصف زرداری بڑی اچھی سرائیکی بول لیتے ہیں۔ اس لیے میں نے بھی ان کا اعتماد جیتنے کے لیے سرائیکی میں گفتگو شروع کی تو میں نے محسوس کیا کہ ان کا رویہ میری طرف کچھ بدل گیا ہے۔ انہوں نے تھوڑا سا ہی سہی لیکن مجھ پر اعتماد کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک بات واضح تھی کہ آصف زرداری کی شخصیت میں جیل جانے کے بعد بڑی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور مسکرا کر بولے کہ کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک Gladiator ہوں جو اپنے لوگوں کو ایک ظالم بادشاہ کے شکنجوں سے آزاد کرانے کے لیے ایک لمبی جنگ لڑ رہا ہے۔ وہ پیپلز پارٹی کے ایک ایسے جنگجو تھے جنہیں جب بھی پارٹی چاہے کسی بھی کام کے لیے استعمال کر سکتی ہے۔ چاہے وہ جیل کے اندر ہوں یا باہر۔

آصف زرداری سے جوں جوں باتیں ہونا شروع ہوئیں تو محسوس ہوا کہ وہ پیپلز پارٹی کے لیے ایک مزاحمت کا نشان بن کر ابھرے تھے۔ ابھی بھی ان کے ارد گرد سندھ اور پنجاب کے بہت سارے ورکر کھانے پینے کی چیزیں لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ آصف زرداری ان صحافیوں کے ساتھ

میں سے مٹھائی اٹھا کر ایک ایک ورکر کو خود کھلا رہے تھے۔ ان کی بات سن رہے تھے اور یوں تاثر دے رہے تھے جیسے وہ ہر ایک کے خیالات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اس دوران وہ ٹیلی فون پر بھی مسلسل لوگوں سے بات چیت کر رہے تھے۔

آصف زرداری کو اپنے ورکروں اور دوستوں کے درمیان بیٹھا دیکھ کر میرے ذہن میں ایک ہی بات آ رہی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ جیل کے آٹھ سالوں نے ان سے ہر چیز چھین لی ہو لیکن انہوں نے اپنی مسکراہٹ کسی کو نہیں چھیننے دی تھی۔ اس مسکراہٹ سے پارٹی کے لیڈروں اور ورکروں کو ایک ہی پیغام ملتا تھا کہ ابھی آصف زرداری نے ہتھیار نہیں ڈالے ہیں۔

جب میں نے آصف زرداری سے بات چیت کرنے کی کوشش کی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے زیادہ بات چیت کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ میں ان سے ان کی ابتدائی زندگی اور بعد کے سالوں کے ان پہلوؤں پر بات کرنا چاہ رہا تھا جو ابھی تک لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ تھے۔ جب میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے اور بولے کہ سائیں یہ ساری باتیں دہرانے کا کیا فائدہ۔ یہ سب کچھ تو بہت پہلے چھپ چکا ہے۔ میں نے پھر بھی اپنی کوشش جاری رکھی لیکن وہ ہر سوال کا بڑا مختصر جواب دے کر بات کو ٹال جاتے۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ ان کے ذہن میں ابھی کچھ Reservations باقی تھیں اور وہ اتنی آسانی سے ایک ایسے صحافی پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھے جو ان سے زندگی میں کبھی نہ ملا ہو۔

باتوں باتوں میں، میں نے محسوس کیا کہ وہ چند صحافیوں سے خوش نہیں تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ ان کے خلاف تیار ہونے والی سازش کا حصہ تھے اور ان کے خلاف جھوٹی کہانیاں چھاپتے رہے تھے۔ انہوں نے ایک پاکستانی ایڈیٹر کا بھی نام لیا جس نے اپنے اردو اخبار میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ آصف زرداری کے امیج کو خراب کرنے والی مہم میں شریک تھا۔

آصف زرداری کے بقول جیل میں رہنے کا انہیں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ ان کی شخصیت میں اب زیادہ ٹھہراؤ آ گیا تھا جو ان میں 1996ء سے پہلے نہیں تھا۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی شخصیت بدل گئی ہے۔ جیل میں لمبا عرصہ گزارنے کے بعد ان کی شخصیت پر کچھ اہم اور مثبت اثرات مرتب ہوئے تھے۔ اب وہ مذہب اور روحانیت کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اب وہ کسی بھی بات کو غصے میں آئے بغیر

اس کی تشریح کر سکتے ہیں اور کسی سے غصہ یا بغض بھی نہیں رکھتے ہیں۔

آصف زرداری بولے کہ تمہیں پتہ ہے کہ جیل کی زندگی قیدی کا روزانہ امتحان لیتی ہے۔ آپ کو روزانہ ان طاقتور لوگوں سے لڑ کر زندہ رہنا پڑتا ہے جنہوں نے آپ کو جیل میں ڈالا ہوا ہوتا ہے۔ بابام، خدا نے ان کے اندر ایک ایسی طاقت بھر دی تھی جس کی وجہ سے وہ جیل کی زندگی کو بڑے صبر اور بہادری کے ساتھ جھیل رہے تھے۔ انہوں نے جیل میں آنے سے پہلے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کے اندر اتنی بہادری آ جائے گی۔

میرے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ آصف زرداری کے دل میں ان لوگوں کے خلاف کوئی نفرت یا بغض نہیں تھا جنہوں نے ان پر مقدمات بنا کر انہیں جیل میں ڈالا تھا۔ جب میں نے ان سے سیف الرحمن کے بارے میں بات کرنا چاہی جن کی وجہ سے آج وہ جیل میں بیٹھے تھے تو آصف زرداری صرف اتنا بولے کہ چھوڑو یار سیف الرحمن محض ایک ایس ایچ او تھا۔ اس طرح کے پولیس ایس ایچ او روزانہ پورے پاکستان میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی میری زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اب کون ان کے بارے میں بیٹھ کر سوچتا رہے۔

میں نے ہمت نہیں ہاری اور دوسرا سوال داغا کہ کیا اس ایس ایچ او سیف الرحمن نے ان کے خلاف جھوٹے کیس بنانے پر ان سے معافی مانگی تھی تو آصف زرداری بولے کہ نہ صرف اس ایس ایچ او نے بلکہ اس کے ماسٹر نواز شریف نے بھی بقول ان کے یہ گناہ کرنے پر معافی مانگی تھی۔ چوہدری نوید نواز شریف کا ایک پیغام لے کر ان کے پاس کراچی جیل آئے تھے اور ان سے معافی مانگی تھی۔ نواز شریف نے چوہدری نوید کو کہا تھا کہ وہ آصف زرداری سے جا کر درخواست کریں کہ وہ انہیں معاف کر دیں۔

میں نے زرداری صاحب سے پوچھا پھر انہوں نے نواز شریف کی اس درخواست پر کیا کہا تھا۔ آصف زرداری نے روایتی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائی اور بولے کہ میں نے اسی لمحے یہ سوچے بغیر کہ انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا تھا انہیں معاف کر دیا۔

میں نے آصف زرداری کے مختصر جوابات کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور ان سے بات چیت میں لگا رہا تاکہ ان کے ماضی کی کہانی اپنے قارئین کے سامنے لا سکوں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ غلام اسحاق خان سے لے کر نواز شریف، فاروق لغاری، جنرل پرویز مشرف اور اب ملک کی حکومتوں کے دوران جیلوں میں ان سے کیا سلوک ہوتا رہا۔ ان تمام حکمرانوں میں ان کے ساتھ جیل میں سب سے بہتر سلوک کس نے کیا تھا۔

زرداری صاحب نے جواب دیا کہ جیل جیل ہوتی ہے چاہے اس میں آپ کو دنیا بھر کی تمام سہولتیں ہی کیوں نہ فراہم کر دی جائیں۔ ان تمام حکمرانوں نے انہیں جیل میں توڑنے کی پوری کوشش کی لیکن اللہ کے کرم سے وہ اپنے پیروں پر کھڑے رہے ہیں۔

اچانک میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ زرداری صاحب کے بچوں نے اپنے قیدی باپ کے جیل جانے کے بعد اپنے آپ کو کیسے ایڈجسٹ کیا ہوگا۔ میرا سوال سن کر وہ بولے کہ میرے بچوں نے 1990ء سے لے کر اب تک مجھے زیادہ وقت جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی دیکھا ہے۔ جب وہ بڑے ہو رہے تھے تو میں جیل بیٹھا تھا۔ انہیں یہ علم نہیں تھا کہ ان کے باپ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی آصفہ ہر وقت یہ اصرار کرتی تھی کہ وہ دوسرے بچوں کے بابا کی طرح ہر وقت ان کے ساتھ کیوں نہیں رہتے۔ ایک جج انہیں رہا کرنے پر کیوں تیار نہیں ہے۔ ایک دن تو حالت یہ ہو گئی کہ آصفہ نے اپنے باپ کو کہا کہ آج تو وہ اسے اپنے ساتھ جج کے پاس لے کر جائیں۔ وہ اس سے خود بات کرے گی کہ آخر وہ اس کے باپ کو چھوڑنے پر کیوں تیار نہیں ہے۔ آصفہ نے اپنے باپ سے کہا کہ کیا اس جج کو یہ احساس نہیں ہے کہ مجھے آپ کی کتنی ضرورت ہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ اپنے بچوں کی باتیں کرتے ہوئے آصف زرداری جو ابھی تھوڑی دیر پہلے مسلسل مسکرا رہے تھے، وہ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ جذباتی ہو گئے تھے بلکہ ان کے اندر کا باپ یکدم اپنے اداس بیٹے بیٹیوں اور بیوی کی اداسیوں کے درمیان [illegible] پر حاوی ہو گیا تھا۔ زرداری صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible] تھوڑی شروع ہونے لگی تو وہ اپنے پارٹی ورکرز کی اپنے لیے محبت اور ان کی قربانیوں کو یاد کر کے اپنے آپ کو حوصلہ دیتے۔

انہوں نے بات کا رخ بدلا اور مجھے بتانے لگے کہ تمہیں علم ہے کہ انہیں جیل میں رکھ کر بہت سارے لوگوں نے بڑے بڑے فائدے اٹھائے تھے۔ چاہے وہ پولیس والے ہوں، جیلر یا پھر جج، ان سبھوں نے ان طاقتور لوگوں سے بڑے بڑے فائدے اٹھائے تھے جو اسے جیل میں رکھنے کے خواہاں تھے۔ ان سب کو مجھے جیل میں رکھنے کے عوض اور مجھ پر تشدد کرنے کے لیے پروموشنز اور انعامات مل رہے تھے۔ بہت سارے لوگوں کی کمائیاں صرف اس لیے ہو رہی تھیں اور ان کے گھروں میں چولہا جل رہا تھا کہ انہوں نے زرداری کو جیل میں رکھا ہوا ہے۔

آصف زرداری مسکرائے اور بولے کہ باقی باتیں چھوڑیں۔ اور تو اور، اس ملک کے مختلف حکمران بھی انہیں جیل میں رکھنے کے عوض ملک پر حکمرانی کر رہے تھے۔ وہ اپنے اقتدار کو یہ جواز فراہم کر رہے تھے کہ انہوں نے آصف زرداری جیسے شخص کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے رکھا ہوا ہے۔

وہ کہہ رہے تھے کہ میرے لیے تو یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ انہیں جیل میں رکھ کر بہت سارے خاندانوں کا روٹی پانی چل رہا تھا ورنہ پانچ ارب کی اس آبادی میں ایک شخص کی کیا اہمیت ہے۔

میں نے زرداری صاحب سے یہ پوچھ لیا کہ کیا انہوں نے کبھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھ کر یہ نہیں سوچا کہ بہت ہو گیا تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ جیل سے باہر آنے کے لیے ایک ڈیل کر لیں۔

ان کا بے ساختہ جواب تھا نو۔

آصف زرداری کہنے لگے کہ جیل نے انہیں ایک عجیب سی توانائی دی ہے جو انہیں [illegible] طاقتور لوگوں سے لڑنے پر ہر وقت تیار رکھتی ہے۔ [illegible]

[illegible]

پہلے [illegible] سے علیحدہ کر دیا۔ بے نظیر بھٹو کو ملک واپس آنے کی اجازت نہیں دی جا رہی ہے اور ان کے خلاف مقدمات بنائے جا رہے ہیں۔ زرداری صاحب کے مطابق [illegible] نے پاکستان میں سیاست کرنے والوں اور [illegible] کے خلاف [illegible] کرنے کی بہت بڑی قیمت ادا کی تھی [illegible] وہ پاکستان کے لوگوں کے لیے مسلسل قربانیاں دے رہے ہیں۔

اس گفتگو کے دوران میں نے زرداری صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ [illegible] کے طور پر سامنے آنے والی طاقتوں کی تفصیلات بتانا پسند کریں گے یا انہیں جو آفر حکمرانوں نے ان پچھلے سالوں میں کی تھیں۔ زرداری صاحب مسکرائے اور بولے کہ میں فل ٹائم سیاستدان ہوں۔ میں چاہوں تو سیاسی رازوں سے پردہ اٹھا کر اس ملک کی سیاست میں بہت بڑا طوفان لا سکتا ہوں۔ لیکن میں یہ سیاسی راز افشا کر کے صرف ایک دن کی سیاست نہیں کرنا چاہتا۔

وہ مجھے بتانے لگے کہ ان کے سینے میں بہت سارے راز دفن ہیں۔ 1990ء سے لے کر اب تک تقریباً ہر دور میں ہر حکمران نے انہیں بہت ساری پیشکشیں کیں لیکن وہ ہرگز ان کی تفصیلات نہیں بتائیں گے۔

میں نے بات کا رخ موڑا اور ان سے پوچھا کہ ان کے خیال میں ملک میں بہتر سیاستدان کون ہیں تو وہ بولے کہ بینظیر بھٹو کے بعد نوابزادہ نصر اللہ خان اور مولانا فضل الرحمن حقیقی طور پر سیاستدان ہیں۔

پھر جیسے آصف زرداری کے ذہن میں کیا آیا کہ وہ مجھے کہنے لگے کہ عمومی طور پر جو سال میں نے جیل میں گزارے ہیں ان کے بارے میں کچھ غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ وہ اب تک دس سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزار چکے ہیں۔ پہلی دفعہ نواز شریف کے دور میں 1990-93ء میں وہ جیل میں رہے۔ پھر فاروق لغاری نے 1996ء میں انہیں جیل میں ڈالا تھا اور اب یہ 2003ء ہے۔

انہوں نے مجھے کہا کہ تمہیں ایک بات بتاؤں کہ وہ 2004ء میں جیل سے رہا ہو جائیں گے اور اگلے سال ہی اس ملک میں نئے الیکشن ہوں گے اور ان کی پارٹی اقتدار میں آ جائے گی۔

آصف زرداری کی یہ بات تو سچ ثابت ہوئی کہ 2004ء میں انہیں رہا کر دیا گیا جس کے بعد

[illegible] انہوں نے ملک میں سے انتخابات [illegible] 2007ء میں [illegible] 2003ء میں [illegible] آصف زرداری [illegible] کو رہا کرنے کے لیے ملک میں سے انتخابات کرانے کا جھانسہ دے رہی تھی۔ فوجی قیادت ہرگز ملک میں سے انتخابات نہیں چاہتی تھی۔ وہ محض آصف زرداری کو جو اس وقت مشرف کے لیے بہت بڑا خطرہ بنے ہوئے تھے انہیں جیل سے نکال کر ملک سے باہر بھجوانا چاہ رہی تھی۔ آصف زرداری بھی اسی چکر میں آ گئے تھے کہ شاید ان کی رہائی کے فوراً بعد ملک میں انتخابات ہو جائیں گے۔ بینظیر بھٹو ملک واپس لوٹ آئیں گی اور ان کی پارٹی اقتدار میں آ جائے گی لیکن انہیں نہیں پتہ تھا کہ وردی والے ان سے زیادہ اچھے سیاستدان تھے اور وہ بہتر سیاسی چالیں چلتے تھے۔ انہوں نے 2004ء میں آصف زرداری کو رہا کیا اور ساتھ ہی یہ افواہیں اڑانا شروع کر دیں کہ انہیں ایک ڈیل کے تحت رہا کیا گیا ہے جس کے تحت وہ ملک سے باہر چلے جائیں گے اور واپس نہیں آئیں گے۔ بعد میں حالات نے یہ ثابت کیا کہ یہ افواہیں درحقیقت ٹھیک تھیں اور آصف زرداری 2004ء میں اپنی رہائی کے بعد ملک سے باہر گئے تو 27 دسمبر 2007ء کو اس وقت پاکستان واپس لوٹے جب بینظیر بھٹو قتل ہو چکی تھیں۔

جب آصف زرداری نے اپنی رہائی اور اپنی پارٹی کے اقتدار میں آنے کی پیشین گوئی کی تھی تو میں نے ان سے سیدھا سا سوال پوچھ لیا کہ کیا ان کی کرپشن کے بارے میں جو اب تک کہانیاں چھپتی رہی ہیں وہ غلط تھیں۔ زرداری صاحب نے میرے سوال کا برا نہیں منایا اور بولے کہ یہ سامنے کی بات ہے کہ کوئی بھی حکومت اپنے سیاسی مخالفین کی طاقت کو برداشت نہیں کرتی اور انہیں جھکانے کے لیے اس طرح کے حربے استعمال کرتی رہتی ہے۔ ان کی پارٹی کے بہت سارے لیڈروں اور ورکروں نے فوجی حکمرانوں کے دور میں ان سے بغاوت کی بہت بڑی قیمت چکائی تھی۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ پاکستان

سوسائٹی ایک ایسے مرحلے سے گزر رہی ہے جس میں لوگ اب ڈکٹیٹرشپ سے سویلین رول کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ اس طرح کی یہ سیاسی تبدیلی پاکستان میں پہلی دفعہ نہیں ہو رہی بلکہ اگر دیکھا جائے تو دنیا کے دیگر ممالک میں بھی اسی طرح کی لڑائیاں لڑی جاری ہیں۔ انسانی تاریخ میں ایسے بہت سارے لوگوں کو پھانسیاں دی گئیں جنہوں نے اپنے دور کے ڈکٹیٹرز اور طاقتور لوگوں کے خلاف بغاوتیں کی تھیں۔ بہت سارے ممالک میں تو ایسے لوگوں کو آگ میں جلایا بھی گیا۔ سو اگر آج ان کے ساتھ یہ سب سلوک روا رکھا جا رہا ہے تو اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ ان کے بقول آزادی حاصل کرنے کے لیے بہت قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور وہ بھی اپنے حصے کی قربانی دے رہے ہیں اور اس قربانی کے ذریعے وہ لوگوں کو ڈکٹیٹرشپ سے آزادی دلوانا چاہتے ہیں۔

آصف زرداری تھوڑا سا آگے جھکے اور مجھے دیکھ کر بولے کہ ڈکٹیٹرز سیاستدانوں کی توہین کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے مقاصد کے لیے انہی سیاستدانوں کو استعمال بھی کرتے رہے ہیں۔ یہ اسٹیبلشمنٹ کا ایک پرانا طریقہ کار رہا ہے کہ وہ ہر مقبول لیڈر پر کرپشن کے چارجز لگا کر انہیں بدنام کر کے اقتدار سے [illegible] سیاستدانوں کے کھاتے میں ڈال [illegible] آپ پر ایک کیس [illegible] کہ میں نے ایک کار اسمگل کرنے کے لیے [illegible] کی ادائیگی کی تھی۔ وہ [illegible]

میں نے پھر بات کا رخ موڑا اور ان سے پوچھا کہ زرداری صاحب! آپ کو کیسا لگتا ہے کہ آپ ایک ایسی خاتون کے شوہر ہیں جو اس ملک کی دو دفعہ وزیر اعظم رہی ہیں تو وہ بولے کہ یہ ان کی زندگی کا سب سے [illegible] تجربہ تھا۔ وہ مجھے بتانے لگے کہ دنیا بھر میں وزیر اعظم کے خاوند یا ان کی بیویوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ شروع میں تو انہیں وزیر اعظم کا شوہر ہونے کی وجہ سے بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ سیاسی لیڈرز اور گرز اور حتیٰ کہ وزرا بھی انہیں وزیر اعظم کا خاوند تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ ان کے نزدیک وزیر اعظم کے شوہر ہونے کی جاب بہت مشکل تھی تاہم انہوں نے بہت جلد ان تمام سچویشنز کے ساتھ اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر لیا۔

میں نے زرداری صاحب سے نسبتاً زیادہ مشکل سوال پوچھ لیا کہ بہت سارے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انہوں نے بینظیر بھٹو کے لیے بے پناہ مسائل کھڑے کیے تھے اور دراصل اس خاتون نے ان کی وجہ سے بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کیا تھا۔ زرداری صاحب نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا، تھوڑی دیر وہ چپ رہے اور پھر بولے کہ یہ سارا بھٹو فیملی کے مخالفین کا پروپیگنڈا ہے۔ ان کے بقول جنرل ضیاء کے سیکرٹری انفارمیشن جنرل مجیب الرحمٰن کا یہ کارنامہ تھا جنہوں نے بھٹو خاندان کے خلاف انتہائی غلیظ مہم شروع کی تھی۔ جنرل مجیب کا مقصد یہ تھا کہ میرے ذریعے بھٹو فیملی کو بدنام کیا جائے اور پچھلے دس سالوں میں یہ کام بڑی خوبصورتی سے آگے بڑھایا گیا تھا لیکن وہ یہ بات بھول گئے تھے کہ بھٹو ازم لوگوں کی روحوں میں آج بھی باقی ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ پھر آج فیصل صالح حیات جیسے پارٹی کے پرانے لیڈر یہ کہہ کر کیوں پیپلز پارٹی چھوڑ رہے ہیں کہ بھٹو ازم اس دن دفن ہو گیا تھا جس دن بینظیر بھٹو نے 1988ء میں اس ملک کی اسٹیبلشمنٹ سے ڈیل کر کے اقتدار لے لیا تھا۔

آصف زرداری بولے کہ دراصل فیصل صالح حیات جیسے لوگ پارٹی کے ساتھ غداری کو جواز فراہم کرنے کے لیے اس طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ سب لوگ جانتے تھے کہ پیپلز پارٹی کے اس ٹولے نے جنرل مشرف کے ہاتھ پر بیعت اس لیے کی تھی کہ انہیں اقتدار چاہیے تھا اور وہ غداری کے مرتکب ہوئے تھے۔ اب انہیں بھٹو ازم اور پارٹی لیڈرشپ میں ہر طرح کی خامیاں نظر آئیں گی۔ یہ کوئی انہونی بات تھی اور نہ ہی پہلی دفعہ کسی لیڈر نے بھٹو کی پارٹی سے غداری کر کے اس طرح کا جواز گھڑا تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے زرداری صاحب نے مجھے ایک واقعہ سنایا کہ جب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے خلاف فوج نے بغاوت کی تو مولانا کوثر نیازی نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ انہوں نے بھٹو سے غداری کر کے جنرل ضیاء کو جائن کر لیا۔ مولانا کوثر نیازی نے اس وقت بھی یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ بھٹو کی جان بچانے کے لیے جنرل ضیاء کا ساتھ دے رہے تھے۔ کوثر نیازی اکثر کہتے تھے کہ پیپلز پارٹی کے لیڈر بھٹو کو قتل کروانا چاہتے تھے اور وہ بھٹو کی جان بچائیں گے۔

"تو کیا کوثر نیازی نے بھٹو کی جان بچالی تھی" آصف زرداری نے مجھ سے پوچھا۔

میں چپ رہا تو وہ بولے کہ پیپلز پارٹی کے یہ اٹھارہ ایم این ایز جنہوں نے 2002ء کے الیکشن کے بعد اپنی پارٹی چھوڑ کر جنرل مشرف کو جائن کیا، انہوں نے بھی یہی دعویٰ کیا تھا کہ وہ بینظیر بھٹو کو

[illegible] بینظیر بھٹو کو واپس [illegible] ہیں۔ یہ لوگ محض اپنے فائدے [illegible] کی سیاست کرتے رہے ہیں۔

میں نے زرداری صاحب سے پوچھا کہ اگر ایسی بات تھی کہ یہ لوگ پارٹی کے ساتھ غداری کرتے رہے تھے تو پھر پارٹی لیڈرشپ انہیں دوبارہ اپنی پارٹی میں کیوں شامل کرتی رہی ہے۔ ایسے لوگ مشکل وقت میں پارٹی چھوڑ گئے تھے تو پھر اچھے دنوں میں انہیں واپس کیوں لایا گیا۔

آصف زرداری کے پاس اس بات کا بھی جواب موجود تھا۔ وہ کہنے لگے کہ آپ اس بات کو بھی سوچیں کہ یہ پیپلز پارٹی کی خوبصورتی ہے نہ کہ کوئی بری بات۔ لوگ اس پارٹی میں آتے ہیں، جوائن کرتے ہیں، پھر اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور پھر کچھ عرصے بعد واپس آ کر اسے پھر جوائن کرتے ہیں کیونکہ انہیں پتہ ہے کہ سیاسی طور پر زندہ رہنے کے لیے صرف ایک ہی جماعت ہے جس کا نام پیپلز پارٹی ہے۔

میں بھی اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والا نہیں تھا۔ میں نے زرداری صاحب سے ایک اور بات پوچھی کہ پیپلز پارٹی چھوڑ جانے والے ایم این ایز یہ الزام لگاتے رہے تھے کہ 1988ء سے لے کر اب تک پیپلز پارٹی کی قیادت ہمیشہ کمپرومائز کرتی رہی ہے اور فوجی قیادت کے ہاتھوں کھیلتی رہی ہے۔

زرداری صاحب بھی اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ وہ کہنے لگے کہ میاں دیکھو، پیپلز پارٹی ایک جمہوری پارٹی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر طاقتور شخص اس پارٹی کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ جنرل اسلم بیگ سے لے کر جنرل پرویز مشرف تک سب نے یہ کوششیں کی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم جو سیاسی فیصلے کرتے ہیں وہ کسی کمپرومائز کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ لوگ اب یہ سمجھتے ہیں کہ جرنیلوں کے ساتھ کمپرومائز کر کے پیپلز پارٹی کمزور ہوئی ہے۔

وہ بولے کہ آپ کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ایکٹرز تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور پارٹی کے لیڈرز مختلف لوگوں سے مختلف ایشوز پر بات چیت اور ڈیلنگ کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب ایک سیاسی گیم ہوتی ہے۔ اس کا ہرگز مطلب کمپرومائز نہیں ہوتا۔ وہ کہنے لگے کہ ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جمہوری طاقتیں کبھی بھی بات چیت یا مذاکرات کی آفر کو نہیں ٹھکراتیں۔

میں نے بات کا رخ ایک دفعہ پھر نیب کے زرداری صاحب پر بنائے گئے کیسوں کی طرف کر دیا۔ وہ بولے کہ یہ ادارہ احتساب کے نام پر بنایا گیا اور وہ محض جنرل مشرف کا ایک سیاسی ہتھیار تھا جس کے ذریعے وہ اپنے سیاسی مخالفین کو ہراساں کر رہے تھے۔ نیب ان کی رہائی کے بدلے ایک مخصوص قیمت مانگ رہا ہے جو ان کی پارٹی لیڈرشپ ادا تو کر سکتی ہے اور نہ ہی وہ اسے دینے کو تیار ہے۔ جنرل مشرف اس کو رہا کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اس کے بدلے وہ پیپلز پارٹی کی قیادت کو کہہ رہے ہیں کہ وہ ایل ایف او کو تسلیم کریں اور پھر ایک وردی والے صدر کو بھی مان لیں۔ یہ ہے ساری کہانی لیکن میں نے اس سے انکار کر دیا ہے اور اب جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھا اس کی قیمت چکا رہا ہوں۔

زرداری صاحب کہنے لگے کہ دیکھو! شروع میں تمام پارٹیز نے ایل ایف او کے خلاف بڑا رولا ڈالا جیسا کہ ایم کیو ایم نے لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ان سب نے ایل ایف او کو تسلیم کر لیا۔ تمام سیاسی پارٹیوں نے یہ ڈرامہ کھیلا اور اپنی اپنی قیمت لے کر جنرل مشرف کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ باقی باتیں چھوڑو۔ یہی دیکھ لو کہ جمالی کی کابینہ میں بیٹھے وزیروں کی اکثریت پر نیب نے مقدمات بنائے ہوئے تھے لیکن ان کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتا۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! جب آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے مخالفین آپ کے ذریعے بینظیر بھٹو کو بلیک میل کرتے ہیں تو پھر آپ اقتدار سے دور کیوں نہیں رہتے تاکہ ان کے لیے اور آپ کی پارٹی کے لیے مشکلات پیدا نہ ہوں۔ انہوں نے الٹا مجھ سے سوال پوچھ لیا کہ وہ کیوں اپنی پارٹی کی حکومت سے دور رہیں خصوصاً جب لوگوں نے انہیں ووٹ دے کر ایم این اے یا سینیٹر بنایا ہو۔ دوسروں کی طرح ان کا بھی یہ سیاسی استحقاق تھا اور اس میں کوئی بھی ایسی برائی نہیں تھی اگر وہ بینظیر بھٹو کی حکومت میں کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں۔ ان کی اپنی بہن نے بھی قومی اسمبلی کا الیکشن اس وقت جیتا جب وہ جیل میں بیٹھے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب لوگ انہیں بے گناہ سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ حکومت کریں تو پھر کسی کو اس پر کیا اعتراض؟ لوگ عدالتوں کے الزامات پر یقین نہیں رکھتے کہ انہوں نے کوئی کرپشن کی تھی لہٰذا وہ انہیں ہر دفعہ ووٹ ڈالتے ہیں اور ان کے لیے سیاست میں رہنے کے لیے یہ ایک جواز ہی کافی ہے۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! چلیں مان لیتے ہیں کہ غلام اسحق خان، نواز شریف اور جنرل

مشرف نے آپ پر جھوٹے کیس بنائے ہوں گے کیونکہ وہ آپ کے سیاسی مخالف تھے، لیکن آپ کے پاس اس بات کا کیا جواز ہے کہ آپ کی اپنی ہی پارٹی کے لیڈر، فاروق لغاری جنہیں صدر بنانے کے لیے آپ خود ووٹ مانگتے رہے تھے، نے آپ کی حکومت پر کرپشن کے الزامات لگا کر اسے برطرف کیا تھا اور انہی کے بنائے ہوئے مقدمات کی وجہ سے وہ آج جیل میں بیٹھے ہیں۔

زرداری صاحب نے کہا کہ فاروق لغاری نے دراصل پارٹی کو دھوکہ دیا تھا۔ وہ ایک دھوکے باز شخص ہے جس نے ملک کی تمام سیاسی طاقتوں کو دھوکہ دیا تھا۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے درمیان اختلافات آپ کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے جو آگے جا کر بینظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے کی وجہ بنے۔

میرا اشارہ ابھی تک [illegible] پارٹی [illegible] کے گروپ کی طرف تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا [illegible] سے مجبور کیا تھا کہ وہ [illegible] پارٹی کے ساتھ سیاسی غداری کریں۔ وہ بولے کہ وہ اس بارے میں [illegible] سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ ان کا خیال ہے جب تک خود کوئی ٹوٹنے کے لیے تیار نہ ہو کوئی کسی کو نہیں توڑ سکتا۔ [illegible] پارٹی کا یہ گروپ خود اقتدار میں جانے کا خواہش مند تھا اور انہوں نے [illegible] پارٹی کی لیڈرشپ کے خلاف [illegible] کی کوشش کی۔ [illegible] اقتدار کے [illegible] ملک [illegible] کر رہے تھے۔ انہوں [illegible] لوگوں کے [illegible] سے بچنے کے لیے [illegible] پارٹی سے غداری کرتے وقت اس طرح کی کہانیاں لوگوں کو سنائیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] کی پارٹی لیڈرشپ نے کی تھیں۔

انہوں نے میرے چہرے کے تاثرات دیکھے تو اپنی پارٹی کی پچھلی دو حکومتوں کی کارکردگی کا دفاع کرنے لگے۔ وہ بولے باقی باتیں چھوڑیں۔ آپ صرف یہ دیکھیں کہ ہماری پارٹی کے دور میں غربت کتنی کم تھی اور آج کتنی بڑھ گئی ہے۔ آپ کو سب باتیں واضح ہو جائیں گی۔

میں نے کہا زرداری صاحب! فرض کرتے ہیں کہ اگر آج آپ کو جیل سے رہا کر دیا جائے تو کیا آپ سیاست میں رہیں گے یا پھر ملک چھوڑ دیں گے۔ وہ بولے کہ رہائی کے بعد وہ پہلے اپنا علاج کرانے کے لیے ملک سے باہر جائیں گے لیکن ان کی کوشش ہوگی کہ وہ پاکستانی سیاست میں اپنا کردار ادا کرتے رہیں۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! بینظیر بھٹو صاحبہ پاکستان واپس آ کر اپنی سیاسی جنگ یہاں کیوں نہیں لڑتیں تو وہ بولے ان کے خیال میں وہ یہاں سے دور بیٹھ کر اپنی سیاسی لڑائی زیادہ بہتر اور موثر انداز میں لڑ رہی ہیں۔ اگر آج وہ واپس آ جائیں تو انہیں فوری طور پر جیل میں ڈال دیا جائے گا۔

میں نے کہا کہ زرداری صاحب! یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ انصاف حاصل کرنے کے لیے عدالتوں سے رجوع کر لیں۔

زرداری صاحب نے قہقہہ لگایا اور بولے کہ میں کس عدلیہ کی بات کر رہا ہوں جو ابھی تک جنرل مشرف کے جاری کیے گئے پی سی او پر حلف لے کر اپنی نوکری کر رہی ہے۔ وہ بولے باقی چھوڑیں، اب تو وکیل یہ خود کہتے ہیں کہ یہ عدلیہ کرپٹ ہے اور وہی کچھ کر رہی ہے جو انہیں ایک فوجی [illegible]

زرداری صاحب نے کہا کہ پاکستانی وکیلوں نے [illegible] کے خلاف جدوجہد کر کے [illegible]

ان کے خیال میں [illegible] نے بینظیر بھٹو کو [illegible] میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

لیکن یہ لوگ بھی ایک ہی چال چل کر پھنستے ہیں اور اس دفعہ بھی [illegible] زرداری صاحب کر رہے تھے کہ بینظیر بھٹو آصف زرداری سے [illegible] کرنے والوں نے انہیں یقین دلایا تھا کہ اگر لاہور میں اپنی سیاسی قوت کا مظاہرہ کرکے دکھا دیں تو شاید جنرل مشرف کو راضی کرکے اس ملک میں نئے انتخابات کرائے جا سکتے ہیں۔ آصف زرداری نے یہی کہانی بینظیر بھٹو کو بڑی اچھی طرح بیچ دی تھی۔ [illegible] کرنے کی صورت میں بینظیر بھٹو آصف زرداری کے پیچھے بیٹھ کر اپنی پارٹی کی قیادت سونپنے پر تیار ہو گئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ آصف زرداری کے دبئی سے لاہور آنے سے پہلے ڈاکٹر شاہد مسعود نے جب دونوں میاں بیوی کو ساتھ بٹھا کر اے آر وائی ٹی وی کے لیے انٹرویو کیا تو اس میں انہوں نے ایک بڑا خوبصورت سوال پوچھا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستانی فوج ان پر (بینظیر بھٹو) اعتماد کرنے کو تیار نہیں ہے، جبکہ ان کے شوہر آصف زرداری پر وہ بھروسہ کرنے کو تیار ہے۔ بینظیر بھٹو نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا کہ پاکستانی فوجی آصف زرداری پر شاید اس لیے اعتماد کرنے لگ گئے ہیں کہ وہ ایک ملٹری کالج پٹارو سندھ کے پڑھے ہوئے ہیں جبکہ وہ (بینظیر بھٹو) ایک سویلین ہیں۔ پاکستانی فوجی ابھی بھی ایک ایسے شخص کے ساتھ ڈیل کرنے اور اعتبار کرنے پر تیار ہیں جو فوجی نہ سہی لیکن ان کے فوجی سکول میں پڑھا ہوا تھا۔

بینظیر بھٹو کا یہ جواب عقلمندوں کے لیے بطور اشارہ سمجھنے کے لیے کافی تھا کہ یہ سارا میلہ آصف زرداری پاکستانی فوج کے ان جرنیلوں سے ملاقاتوں کے بعد سجا رہے تھے جو مخدوم امین فہیم کے ساتھ رات کے اندھیرے میں ان سے ملاقاتیں کرتے تھے۔

جب میں دبئی ایئرپورٹ پر اترا تو میرے ذہن میں یہی خیال تھا کہ میں دیگر لیڈروں کی طرح بینظیر بھٹو سے بھی مل کر ان کی اسی طرح کی ایک سیاسی پروفائل کرنے کی کوشش کروں۔ میں نے ان کے ترجمان فرحت اللہ بابر سے رابطہ کیا جو اس وقت اسلام آباد میں تھے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ بینظیر بھٹو سے بات کرکے وقت طے کر لیں گے۔ جب میں نے دو تین دفعہ فرحت اللہ بابر کو یاددہانی کرائی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے محض ٹال رہے ہیں۔ میں نے بعد میں ادھر ادھر سے سن گن لی تو پتہ چلا کہ آصف زرداری نے بینظیر بھٹو پر یہ پابندی لگائی ہوئی تھی کہ وہ کسی بھی پاکستانی صحافی سے نہیں ملیں گی اور وہ [illegible] میڈیا کی تمام توجہ ان پر اور ان کے مقاصد پر فوکس رہے۔ یہی وجہ تھی کہ

پاکستان آنے سے چند گھنٹے پہلے جب آصف زرداری نے اس ہوٹل میں پریس کانفرنس کی جہاں پاکستانی صحافی [illegible] ہو رہے تھے تو بینظیر ان کے ساتھ نہیں آئیں۔ ان کے ساتھ صرف بلاول زرداری تھے۔ جب ہم سب لوگ دبئی ایئرپورٹ پر پہنچے تو پیپلز پارٹی کے کچھ جیالوں نے ایئرپورٹ پر زرداری صاحب کے حق میں نعرے بازی شروع کر دی۔ [illegible] دبئی پولیس کے ایک سپاہی نے آ کر صرف اتنا کہا کہ اگر اس کے بعد کسی نے نعرہ مارا تو ان سب کو گرفتار کرا دیا جائے گا۔ اس کے بعد کسی کونے سے کوئی آواز نہیں آئی۔

جہاز کی روانگی میں مسلسل تاخیر ہو رہی تھی۔ ہمیں کئی کہانیاں سنائی جا رہی تھیں۔ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ ادھر پاکستان سے یہ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں پاکستان پیپلز پارٹی کے ورکرز چاروں صوبوں سے اکٹھے ہو کر لاہور ایئرپورٹ کی طرف جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی پنجاب کی روایتی ظالمانہ پولیس فورس کے ساتھ پیپلز پارٹی کے ورکروں کی ٹانگیں توڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جہاز پر سوار ہونے سے پہلے آصف زرداری نے ایک عجیب سی بات کی۔ انہوں نے اپنے پارٹی ورکروں سے کہا کہ وہ ایئرپورٹ کی طرف نہ آئیں۔ جو جہاں ہے وہ وہیں رک کر بیٹھ کر دھرنا دے دے۔ جہاز کی روانگی کچھ اس طرح رکھی گئی تھی کہ اس نے صبح سویرے ہی لاہور ایئرپورٹ پر اترنا تھا۔ ہم صحافیوں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر اتنی جلدی لاہور ایئرپورٹ پر اترنے کی کیا وجہ تھی کیونکہ اس وقت تو پارٹی ورکرز کے لیے انہیں ایئرپورٹ آ کر ریسیو کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اسی کنفیوژن میں ہم صحافی جہاز پر سوار ہوئے اور ہم نے اپنے بورڈنگ کارڈز پر لکھے ہوئے نمبروں کے مطابق سیٹیں ڈھونڈنے کی کوشش کی تو ہمیں کہا گیا کہ کسی بھی جگہ بیٹھ جاؤ کیونکہ یہ چارٹرڈ جہاز تھا۔ زرداری صاحب تمام رات نہیں سوئے۔ وہ ہر ایک صحافی کے ساتھ اپنے روایتی انداز میں گپ شپ کرتے رہے۔ جب جہاز صبح سویرے لاہور کی فضاؤں میں پہنچا تو یکدم ماحول میں گرمی آ گئی۔ ڈاکٹر شاہد مسعود سب سے زیادہ پھرتیاں دکھا رہے تھے۔ وہ کبھی بھاگ کر پائلٹ کے کیبن میں جاتے تو کبھی آصف زرداری کے کان میں سرگوشیاں کرتے پائے جاتے۔ آہستہ آہستہ یہ بھنبھناہٹ شروع ہو گئی کہ شاید جہاز کو لاہور ایئرپورٹ پر نہ اترنے دیا جائے۔ آخر بریکنگ نیوز ڈاکٹر شاہد مسعود نے ہی سرگوشی کی شکل میں ایک دو صحافیوں کو دی کہ کھیل ختم ہو گیا ہے۔ ہمیں پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا لیکن جب جہاز ایئر

پہنچ پائے گا۔ یہاں جو کچھ ہمیں دیکھنے کو ملا اس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ ڈاکٹر شاہد مسعود کی بات ٹھیک تھی کہ جہاز اترنے سے پہلے ہی زرداری صاحب کا فوری جہازیوں کے ساتھ کیا سلوک ہونا تھا اس کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس سلوک کے اندر کو ہوا دینے میں ڈاکٹر عاصم زرداری صاحب کی بغل میں تھے۔ جہاز کے اندر کسی کو کوئی اطلاع نہیں تھی کہ ایئرپورٹ پر چاروں طرف پھیلے ہوئے پنجاب پولیس کے کمانڈوز کیا کرنے والے تھے۔ پیپلز پارٹی کے چند جیالوں نے آصف زرداری کا حوصلہ بلند کرنے کے لیے نعرے بازی شروع کر دی۔ حالانکہ ابھی تک جہاز کے اندر سے شور بلند ہے۔ یہ نعرے کو پیچھے رہے۔ آخر جہاز کا دروازہ کھولا اور اس کے ساتھ ہی یہ نعرے پھر بلند ہو گئے۔ ایک نوجوان ایس پی ہمیں اپنے کمانڈوز کے ساتھ آیا۔ زرداری صاحب نے اسے بلند آواز سے کہا کہ اپنے پاس بلا کر تمہارے پاس گرفتاری کا وارنٹ ہے تو مجھے لے جاؤ۔ ایس پی نے آتے ہی آصف زرداری کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ شاید آصف زرداری اور ان کے ساتھی اس گرفتاری پر مزاحمت کریں گے اور ایئرپورٹ سے پیدل نکل کر پیپلز پارٹی کے جلوس کی قیادت کریں گے۔ لیکن یہ سب کچھ سازش کا حصہ ہوگی تھی۔ آصف زرداری اپنے ساتھیوں کے ساتھ [illegible] کا ہاتھ پکڑ کر ایس پی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سیڑھی سے ہوائی جہاز سے اترے اور جیالوں کے ساتھ نعرے بازی کرتے ہوئے [illegible] سے سیدھے لاہور میں واقع اپنے زرداری ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم صحافی ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے اور کسی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب کیا ہوگا۔ جہاز پر کئی لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید ہم پاکستانی تاریخ کے ایک اہم واقعہ اور تبدیلی کے عینی شاہد بننے والے تھے۔ آصف زرداری کے حمایتی کہتے تھے کہ ان کے پاکستان پہنچتے ہی ملک میں نئے انتخابات کا اعلان ہو جائے گا اور جلد ہی ان کی پارٹی اقتدار میں آ جائے گی۔

لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس ملک میں انقلاب آتے آتے رہ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہم صحافیوں کے سروں پر چوہدری پرویز الٰہی کے کمانڈوز کی شکل میں ایک قیامت ضرور آنے والی تھی۔ جونہی ہم صحافی جہاز سے باہر نکلے چوہدری پرویز الٰہی کے حکم پر ہمیں ایک لاؤنج میں بند کر کے ان کے کمانڈوز نے انتہائی بدتمیزی کے ساتھ ہماری تلاشی شروع کر دی۔ سب صحافیوں کو کہا گیا کہ اپنے موبائل اور کیمرے پولیس کے حوالے کر کے چپ چاپ بیٹھ جائیں۔ وہ اس وقت تک باہر نہیں نکل سکتے تھے جب تک ان کی تلاشی نہ ہو۔ یہ سارے صحافی جن میں انجمن صحافیاں کے [illegible] احترام دوست بھی شامل تھے جو تھک چکے تھے اور جہاز کے سفر کی وجہ سے پہلے ہی چڑچڑے ہو رہے تھے۔ اوپر سے آصف زرداری صاحب ان کی نظروں کے سامنے ہی اپنا کھیل کھیل کر نکل گئے تھے۔ وہ صحافی جو اس امید پر پیچھے دو دن قبل پاکستان سے دبئی اور دبئی سے لاہور کا سفر کر کے اس امید پر آئے تھے کہ شاید وہ دنیا کو اپنی آنکھوں کے سامنے بدلتے دیکھیں گے وہ اب چوہدری پرویز الٰہی کی پولیس کے ہاتھوں ذلیل ہونے والے تھے۔ میں لاہور کے صحافیوں کو یہ داد دوں گا خصوصاً عامر میر کو جنہوں نے پنجاب پولیس کے ان کمانڈوز کو اپنے لیپ ٹاپ، موبائل فونز اور کیمروں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ ان سب نے واضح طور پر یہ اعلان کیا کہ وہ کسی بھی صورت میں ان پولیس والوں کو یہ حق نہیں دیں گے کہ وہ ایسی جارحیت کریں گے۔ صحافی بھی لڑنے مرنے پر تلے ہوئے تھے تو کمانڈوز کو بھی چوہدری پرویز الٰہی نے ہدایات دے رکھی تھیں کہ ان تمام صحافیوں کی تو تلاشی ضرور لی جائے جو جرأت کر کے آصف زرداری کے ساتھ ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے آ رہے تھے۔ کافی دیر تک صحافیوں اور پولیس والوں میں تلخ جملوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ آخر پولیس والوں نے صحافیوں کو تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ پولیس کمانڈوز کے غصے کا سب سے زیادہ شکار ہمارے دوست [illegible] ہوئے جنہیں بڑے برے طریقے سے ان کمانڈوز نے مارا پیٹا اور صحافیوں کو بھی مارنے کی کوشش کی گئی۔ وہاں بڑا عجیب سا منظر تھا۔ صحافی کہہ رہے تھے کہ آصف زرداری جس وجہ سے پنجاب پولیس کے کمانڈوز کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنی جان بچا کر نکل گئے تھے۔ انہیں چاہیے تھا کہ وہ پہلے ان صحافیوں کو باحفاظت ایئرپورٹ سے نکلواتے اور اس کے بعد ہی وہ ایس پی کا ہاتھ پکڑ کر جہاز سے باہر نکلتے لیکن وہ تو بہت جلدی میں تھے۔ یوں پنجاب پولیس کے کمانڈوز نے صحافیوں پر تشدد کرنے کے بعد ان کے موبائل فونز اور کیمرے قبضے میں لے لیے۔ اس وقت کے ایس ایس پی آپریشنز آفتاب چیمہ کی زیر قیادت پنجاب پولیس کے کمانڈوز ایک طرف صحافیوں کو مار رہے تھے تو دوسری طرف چیمہ صاحب پانی کی بوتلیں صحافیوں میں بانٹ رہے تھے۔

سیکرٹ ایجنسیوں نے بڑی چالاکی سے آصف زرداری کے غبارے سے ہوا نکال دی تھی۔ ان کی آٹھ سالہ جدوجہد اور کرپشن [illegible] خاک میں مل گئی تھی۔ ہم سب کو پتہ چل گیا تھا کہ زرداری کی ایم آئی اور آئی ایس آئی کے ساتھ ہونے والی ڈیل ناکام ہو گئی تھی یا کر دی گئی تھی یا سرے سے اس کا وجود ہی

نہیں تھا۔ آصف زرداری کو ویسے ہی جنرل مشرف نے جیل سے باہر نکالنا تھا کیونکہ اب تو ہر اخبار، کالم نگار اور صحافی انہیں مردِ حُر کا درجہ دے کر انہیں نیلسن منڈیلا بنانے پر تُل گیا تھا۔ وہ جنرل مشرف کے لیے قیدی کی صورت میں ایک پرابلم بنتے جا رہے تھے۔ یوں انہیں نئے انتخابات اور اقتدار کی راہ ہموار کر کے پہلے دبئی اور پھر دبئی سے لاہور بلوا کر چودھری پرویز الٰہی کے ہاتھوں ذلیل کروا کر دبئی چھوڑ دیا گیا۔ بینظیر بھٹو کو شاید ان تمام باتوں کا احساس تھا لیکن وہ چاہتی تھیں کہ آصف زرداری خود ان فوجی جرنیلوں کے ہاتھوں کچھ سبق سیکھیں۔

چند دنوں بعد جب ہنگامہ تھما تو وہی آصف زرداری جو چودھری پرویز الٰہی کی حکومت کا تختہ الٹ کر لاہور پر قبضہ کر کے ملک میں نئے انتخابات اور اپنی پارٹی کو اقتدار دلانے کے لیے دبئی سے آئے تھے، وہ ایسے دبئی بھاگے اس انداز سے گئے کہ میڈیا کو بھی کئی دنوں تک کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ پھر سننے میں آیا کہ وہ دبئی سے جا کر نیویارک کے ایک ہسپتال میں دل کے عارضے میں مبتلا ہو کر داخل ہو گئے۔ پھر سننے میں آیا کہ وہ اب نیویارک میں بیٹھ کر بینظیر بھٹو کے امریکیوں سے مذاکرات کرانے کے لیے لابنگ کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ پاکستانی میڈیا اور عوام انہیں بھول گئے کہ ایک دن پتہ چلا کہ بینظیر بھٹو کو قتل کر دیا گیا ہے اور آصف زرداری دبئی سے چکلالہ ایئربیس پہنچ کر ان کا جسدِ خاکی گڑھی خدا بخش لے جانے کے لیے تین سال بعد اس ملک کا صدر بننے کے لیے واپس آ رہے تھے۔

آفتاب احمد خان شیرپاؤ

آفتاب احمد شیرپاؤ کا سیاستدان بننے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ایک دن خبر ملی کہ ان کے بھائی حیات خان شیرپاؤ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس لمحے انہوں نے فیصلہ کرنا تھا کہ فوج میں رہیں یا خاندان کی سیاسی گدی سنبھالیں۔ انہوں نے آرمی چھوڑی اور سیاستدان بننے کا فیصلہ کیا۔

جب وہ سیاست میں آئے تو انہیں پتہ چلا کہ انہیں تو تقریریں بھی کرنی ہیں لیکن انہیں صحیح اردو بولنی نہیں آتی تھی۔ جتنی دیر میں وہ سیاست اور اردو سیکھتے اتنی دیر میں جنرل ضیاء ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے چکے تھے۔ آفتاب احمد شیرپاؤ بھٹو صاحب کی بیٹی کے پاس آئے، اسے اپنے ساتھ لیا اور صوبہ سرحد کے مختلف علاقوں میں جلسوں سے خطاب کرانے لے گئے۔ سرحد کے گورنر جنرل فضل حق تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے شیرپاؤ کو جنرل ضیاء کے ساتھ ملانے کے لیے بڑی تگ و دو کی۔ شیرپاؤ نے اپنے مرحوم بھائی کی پارٹی چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

بینظیر بھٹو صاحبہ نے بھی شیرپاؤ کی پارٹی کی خدمات کو سراہنا شروع کر دیا تھا۔ جنرل ضیاء کی طیارے کے کریش میں موت واقع ہو چکی تھی اور پیپلز پارٹی پہلی دفعہ بینظیر بھٹو کی قیادت میں بھٹو صاحب کی طلسماتی شخصیت کے بغیر انتخابات لڑنے جا رہی تھی۔ سرحد میں شیرپاؤ صاحب نے کوشش کی کہ صوبے کی دیگر مضبوط سیاسی پارٹیاں اے این پی اور جے یو آئی کے ساتھ مل کر ایک سیاسی اتحاد بنا کر

ایڈجسٹ کر دیا جائے۔ دونوں جماعتوں کے لیڈروں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس طرح ان کے اپنے ورکر پارٹی خلاف ہو جائیں گے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جب انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوا تو پتہ چلا کہ پیپلز پارٹی اسمبلی میں اتنی نشستیں لے سکی ہے کہ وہ شیرپاؤ کو صوبے کا وزیر اعلیٰ بنا سکتی ہے۔

میں نے شیرپاؤ سے وہی روایتی سوال پوچھا کہ کیا پارٹی کو 1988ء میں [illegible] کے ساتھ (مل) کر کے اقتدار میں آنا چاہیے تھا۔ شیرپاؤ صاحب بولے کہ بالکل پارٹی کا یہ فیصلہ ٹھیک تھا۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ بینظیر بھٹو نے اپنی حکومت کو کیسے چلایا۔ شیرپاؤ صاحب کا خیال تھا کہ دراصل گیارہ سال بعد پیپلز پارٹی کو یہ موقع ملا تھا۔ پارٹی کے ورکروں نے بہت قربانیاں دی ہوئی تھیں۔ اگر یہ موقع بھی ضائع کر دیا جاتا تو پارٹی ورکر بہت مایوس ہوتے۔ یہ ایک علیحدہ کہانی ہے کہ کیسے پارٹی کے لیڈر اپنے پارٹی ورکروں کی امیدوں پر پورے اترنے میں ناکام رہے اور بینظیر بھٹو کی حکومت توڑ دی گئی۔ تاہم ورکروں نے بینظیر بھٹو کے خلاف لگائے گئے الزامات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔

جب 1989ء میں بینظیر بھٹو کو ہٹانے کے لیے تحریک عدم اعتماد پیش کی گئی تو پنجاب میں موجود نواز شریف کیمپ سے ایک پیغام بھیجا گیا تھا کہ یہ تحریک عدم اعتماد کامیاب نہیں ہوگی کیونکہ نواز شریف غلام مصطفیٰ جتوئی کو وزیر اعظم نہیں دیکھنا چاہتے تھے جو بینظیر بھٹو کی حکومت ختم ہونے کے بعد اس عہدے کے لیے امیدوار تھے۔

بینظیر بھٹو اور شیرپاؤ 1990ء میں پیپلز پارٹی کی ختم ہونے والی حکومت میں نواز شریف کے کردار کو نہیں بھولے تھے۔ یہی وجہ تھی جب 1993ء میں نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوئے تو شیرپاؤ نے غلام اسحاق خان اور بینظیر بھٹو کے درمیان ایک خفیہ ڈیل کرائی تھی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کو پتہ چل گیا تھا کہ نواز شریف غلام اسحاق خان کے اس آئینی اختیار کو ختم کرنا چاہتے تھے جس کے تحت وہ ان کی حکومت اور پارلیمنٹ کو ڈس مس کر سکتے تھے۔ نواز شریف کو غلام اسحاق خان کے ہاتھ کاٹنے کے لیے پیپلز پارٹی کی سپورٹ کی ضرورت تھی کیونکہ ان کے پاس ہاؤس میں اتنے ووٹ نہیں تھے کہ وہ اکیلے یہ ترمیم لا سکتے۔ نواز شریف اپنی بھرپور کوششوں میں لگے ہوئے تھے کہ وہ اپنے آپ کو ایک آزاد اور خود مختار وزیر اعظم کے طور پر پارلیمنٹ، عوام اور میڈیا کے سامنے پیش کریں۔ تاہم نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان اصل جھگڑا اس وقت شروع ہوا جب ایک

نیا اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز جنجوعہ وفات پا گئے۔ ایک یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ نیا آرمی چیف کون ہوگا۔ بات یہاں تک جا پہنچی کہ غلام اسحاق خان اور نواز شریف نے ایک دوسرے سے [illegible] کر دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب پیپلز پارٹی کی قیادت نے نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان جاری اس جنگ سے سیاسی فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ [illegible] کو آرمی چیف بنا دیا گیا [illegible] کے ساتھ ہی دونوں کے درمیان [illegible] ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نواز شریف اور غلام اسحاق خان میں اختلافات بڑھتے گئے۔ نواز شریف کی [illegible] کو اس وقت سب سے بڑا دھچکا [illegible] بھٹو اور سیف اللہ نے نواز شریف کی [illegible] دیا۔

سیاسی جنگ شروع ہو چکی تھی اور اس کھیل کے [illegible] بینظیر بھٹو کے ہاتھ میں تھے۔ نواز شریف اور غلام اسحاق خان دونوں نے بینظیر بھٹو سے رابطہ کیا۔ [illegible] اس پوزیشن میں آ گئی تھیں کہ جس کے سر پر چاہیں اقتدار کا تاج رکھ دیں۔ پیپلز پارٹی کی قیادت کا اب یہ امتحان تھا کہ کیسے وہ اس تمام سیاسی منظرنامے سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ [illegible] کی طرف سے پھینکے گئے اس موقع سے فائدہ اٹھائے۔ پیپلز پارٹی نے پاور پالیٹکس کی اور آنے والے دنوں میں وہ مفادات حاصل کیے جو ان موقعوں پر سیاستدان اپنی مختلف چالیں چل کر حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نواز شریف کیمپ میں فرسٹریشن بہت زیادہ تھی کیونکہ بینظیر بھٹو کی سپورٹ کے بغیر غلام اسحاق خان نواز شریف حکومت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

جب بینظیر بھٹو کو نواز شریف نے قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے وزارت خارجہ کا چیئرمین بننے کی پیشکش کی تو پیپلز پارٹی کے لیڈروں نے محترمہ کو اس بات پر قائل کیا کہ وہ یہ آفر قبول کر لیں۔ تاہم سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے کچھ ارکان بینظیر کے اس فیصلے سے خوش نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بیکار کی کوشش تھی۔ نواز شریف کیمپ بینظیر بھٹو کے اس دوستانہ سگنل پر بہت خوش ہوا۔ وہ سمجھے کہ بات بن گئی تھی۔ نواز شریف نے بینظیر بھٹو کو پیغام بھجوایا کہ وہ انہیں اپنی حکومت میں ڈپٹی پرائم منسٹر بنانے پر تیار تھے اگر وہ غلام اسحاق خان کا ساتھ نہ دیں۔ وہ پاکستان میں ایک اور سیاسی حکومت کو ڈس مس کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ نواز شریف بینظیر بھٹو کے ساتھ پارلیمنٹ میں ایک طاقتور سیاسی اتحاد بنانا چاہتے تھے۔ نواز شریف نے یہاں تک پیشکش کی کہ وہ پیپلز پارٹی کے کسی بھی لیڈر کو غلام اسحاق خان کے جانے

کے بعد ملک کا صدر بنانے کے لیے حمایت کریں گے۔

بینظیر بھٹو ایک بہت بڑے مخمصے کا شکار تھیں۔ انھیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کیا جائے۔ نواز شریف سے بدلہ لینے کا بڑا اچھا موقع تھا جنہوں نے 1988-90 میں ان کی پہلی حکومت کو اسی غلام اسحاق خان کے ساتھ مل کر ڈس مس کرایا تھا اور خود وزیراعظم بن گئے تھے۔ آج وہی غلام اسحاق خان اور نواز شریف ایک دوسرا کا گلا کاٹنے پر تلے ہوئے تھے۔

دوسرے، بینظیر بھٹو کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ یہ غلام اسحاق خان سے بدلہ لینے کا بڑا اچھا موقع تھا جنہوں نے کرپشن کے الزامات لگا کر ان کی حکومت ختم کی تھی، ان کے خاوند آصف علی زرداری کو ڈھائی سال جیل میں رکھا اور ان کے خلاف مقدمات بنائے۔ آج موقع تھا کہ وہ نواز شریف کے ہاتھوں غلام اسحاق خان کو سیاسی طور پر ذلیل کرا کر ان سے بدلہ لے لیں۔

پارٹی کے اندر سے بھی بینظیر بھٹو پر یہ دباؤ تھا کہ وہ ایک ڈیموکریٹ ہونے کے ناطے نواز شریف کا ساتھ دیں کیونکہ وہ پاکستانی عوام، میڈیا اور ووٹرز کے سامنے غلام اسحاق خان کی سپورٹ کا جواز پیش نہیں کر سکیں گے۔ ساری عمر کے لیے پیپلز پارٹی کی قیادت پر یہی دھبہ لگا رہے گا کہ انہوں نے پارلیمنٹ سے منتخب شدہ ایک وزیراعظم کے بجائے اسٹیبلشمنٹ کے نمائندے جس نے ان پر کرپشن کا الزام لگا کر ان کی حکومت توڑی، کی حمایت کی تھی۔

آفتاب شیرپاؤ سے پوچھا گیا تو انہوں نے بینظیر بھٹو کو یہ مشورہ دیا کہ وہ نواز شریف کے بجائے غلام اسحاق خان کی حمایت کریں کیونکہ ایک ایسے صدر سے انہیں زیادہ سیاسی فائدے ملنے کی توقع ہے جس کے پاس پارلیمنٹ اور حکومت کو توڑنے کے اختیارات ہیں۔

بینظیر بھٹو اور غلام اسحاق خان کے درمیان جو لوگ خفیہ مذاکرات کرا رہے تھے انہیں بتایا گیا کہ وہ صدر کے کیمپ تک یہ پیغام پہنچا دیں کہ وہ نواز شریف کی حکومت کو برطرف کر کے اس ملک میں نئے انتخابات کرانے کا اعلان کریں۔ غلام اسحاق خان کی طرف سے خفیہ مذاکرات کرنے والے لوگ اس بات کے لیے تیار نہیں تھے۔ پیپلز پارٹی اور غلام اسحاق خان کیمپ کے درمیان یہ خفیہ ملاقاتیں شیرپاؤ کے اسلام آباد میں واقع گھر پر جاری رہیں۔

پنجاب کے علاوہ باقی تینوں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ غلام اسحاق خان کے وفادار تھے اور یہ بات نواز شریف کو سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی۔

اب بھی پارٹی کی میٹنگز ہوتیں تو بینظیر بھٹو اونچا اس بات کی مخالفت کرتیں کہ ان کی غلام اسحاق خان کے ساتھ ملاقات ہونی چاہیے۔ تاہم، فاروق لغاری اور شیرپاؤ کو پتا تھا کہ بینظیر بھٹو غلام اسحاق خان کے ساتھ ڈیل کرنا چاہتی تھیں جنہوں نے ان کی پہلی حکومت کو کرپشن چارجز پر ڈس مس کیا تھا۔ آخر فاروق لغاری اور شیرپاؤ بینظیر بھٹو کو غلام اسحاق خان سے ملوانے لے گئے اور یوں ان دونوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ طے پایا۔ جب بینظیر بھٹو اور غلام اسحاق خان ایک کمرے میں اکیلے بیٹھے مذاکرات کر رہے تھے تو بینظیر بھٹو نے شیرپاؤ سے کہا کہ وہ بھی ان مذاکرات میں شامل ہو جائیں۔ بینظیر اور غلام اسحاق کے درمیان بہت سنجیدہ بحث ومباحثہ جاری تھا۔ غلام اسحاق خان اس بات پر بضد تھے کہ صرف قومی اسمبلی توڑی جائے گی اور صوبائی اسمبلیاں اپنا کام کرتی رہیں گی۔

بینظیر بھٹو شیرپاؤ سے یہ پوچھنا چاہ رہی تھیں کہ جو لوگ پارٹی کی طرف سے مذاکرات کر رہے تھے ان کے غلام اسحاق خان کیمپ سے کس طرح کے مذاکرات ہوئے تھے۔ شیرپاؤ نے بینظیر بھٹو اور غلام اسحاق خان کو بتایا کہ مذاکرات میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیاں توڑی جائیں گی۔ اس پر غلام اسحاق خان نے کہا کہ وہ صوبائی اسمبلیوں کو توڑنے کا معاملہ بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے وہ قومی اسمبلی کو برخاست کریں گے۔ غلام اسحاق خان نے بینظیر بھٹو کے ساتھ ملک کے نئے نگران وزیراعظم کا نام بھی ڈسکس کیا۔ جب انہیں یہ بتایا گیا کہ بلخ شیر مزاری اس ملک کے نئے وزیراعظم ہوں گے تو بینظیر بھٹو نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔

غلام اسحاق خان نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے ذہن میں بھی ایک گیم پلان موجود تھا۔ وہ بینظیر بھٹو کی مدد سے پہلے نواز شریف سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے اور پھر اپنے وفادار صوبائی وزرائے اعلیٰ کی مدد سے قومی اسمبلی کے لیے نئے انتخابات کرا کر اپنی مرضی کی پارلیمنٹ وجود میں لانا چاہ رہے تھے۔ غلام اسحاق خان کا پلان تھا کہ پیپلز پارٹی کو چالیس سے پچاس نشستیں ملیں گی۔ ایک ایسی پارلیمنٹ کو اپنی مرضی سے چلانا آسان ہوگا جس میں کسی پارٹی کی اکثریت نہیں ہوگی اور یوں غلام اسحاق خان اپنی مرضی سے اسلام آباد میں ایک کٹھ پتلی حکومت تشکیل دے کر ایوان صدر سے پورے ملک پر حکومت کریں گے۔ پیپلز پارٹی کی قیادت کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کے ساتھ کھیل کھیلا جا رہا تھا

[illegible]

اسحاق خان اور نواز شریف دونوں کو استعفیٰ دے کر گھر جانا پڑا۔

اب ایک بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ اس ملک میں نئے انتخابات کون کروائے گا۔ سرتاج عزیز نے معین قریشی کا نام [illegible] انہیں نگران وزیر اعظم بنا دیا گیا۔

میں نے شیر پاؤ سے پوچھا کہ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ بے نظیر بھٹو نے غلام اسحاق خان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ نواز شریف حکومت کو ختم کرنے کے جواب میں انہیں دوسری دفعہ ملک کا صدر بنائیں گی لیکن جب وقت آیا تو انہوں نے فاروق لغاری کو صدر بنا کر ان سے دھوکہ کیا۔

شیر پاؤ نے اس بات سے انکار کیا کہ بے نظیر بھٹو نے کبھی اس طرح کا وعدہ غلام اسحاق خان سے کیا تھا۔

میں نے کہا کہ شیر پاؤ صاحب انہیں چھوڑیں، یہ بتائیں کہ بے نظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے

[illegible]

بے نظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے درمیان کئی اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ حالات روز بروز تیزی سے بگڑتے جا رہے تھے۔ دونوں کے درمیان سب سے پہلے جو اختلافات چیف جسٹس سجاد علی شاہ اور دیگر ججوں کی تقرری پر ابھرے۔ بے نظیر بھٹو [illegible] چیف بنانا چاہتی تھیں۔ حالات بگڑنے کے باوجود بے نظیر بھٹو کو آخری لمحے تک یہ یقین تھا کہ فاروق لغاری ان کی حکومت کو ختم نہیں کریں گے۔ تاہم، بے نظیر بھٹو کے ساتھ ایک پرابلم تھا کہ وہ اچانک ایک بہت سخت موقف اختیار کر لیتی تھیں جس سے شیر پاؤ جیسے لوگوں کے لیے پرابلم پیدا ہو جاتے تھے کہ وہ دونوں کے درمیان کوئی فیصلہ کن رول ادا کر سکیں۔ سجاد علی شاہ کا اس لڑائی میں رول بہت اہمیت اختیار کر چکا تھا خصوصاً جب بے نظیر بھٹو نے مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد ایوان صدر کے مکینوں پر قاتل ہونے کا الزام لگایا تھا۔ بے نظیر بھٹو کے ایوان صدر کے مکینوں پر مرتضیٰ کے قاتل ہونے کے پیچھے بھی کہانی کچھ یوں تھی کہ جس رات مرتضیٰ کو قتل

دوسری طرف جنرل جہانگیر کرامت بھی اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ ایک مرحلے پر تو جنرل جہانگیر کرامت نے بینظیر بھٹو کو یہ بھی آفر کی کہ وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر فاروق لغاری کے پاس جائیں گے تاکہ دونوں کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو دور کیا جا سکے۔

بینظیر بھٹو نے جہانگیر کرامت کا شکریہ ادا کیا لیکن انہوں نے ان کی پیشکش شائستگی سے یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ وہ فاروق لغاری کے ساتھ اپنے اختلافات دور کرنے کے لیے آرمی چیف کو اس میں ملوث نہیں کریں گی۔ بینظیر بھٹو نے شیر پاؤ کو بتایا کہ وہ چیف آف آرمی سٹاف کی اس معاملے میں مدد نہیں لیں گی۔

شیر پاؤ نے بی بی کو مشورہ دیا کہ وہ فاروق لغاری کے ساتھ پیدا ہونے والے اختلافات کو ایک ایک کر کے حل کریں لیکن بینظیر بھٹو ان سارے اختلافات کو ایک ہی میٹنگ میں بیٹھ کر ختم کرنا چاہتی تھیں۔

شیر پاؤ نے یاد کیا کہ معاملات بہت پہلے ہی بگڑنا شروع ہو گئے تھے۔ بینظیر بھٹو اس بات پر بہت پریشان تھیں کہ کیا فاروق لغاری آصف زرداری سے وفاقی وزیر کا حلف لینے سے انکار تو نہیں کریں گے۔ جب شیر پاؤ نے یہی بات فاروق لغاری سے کی تو انہوں نے آگے سے جواب دیا کہ وہ بینظیر بھٹو کی طرف سے بھیجی گئی دو چیزوں پر کبھی اعتراض نہیں کریں گے۔ ایک یہ کہ اگر وہ کسی شخص کا نام انہیں بھیجتی ہیں کہ ان سے وزیر کا حلف لیا جائے تو وہ ضرور حلف لیں گے۔ دوسرے وہ اگر انہیں یہ سفارش بھیجتی ہیں کہ قومی اسمبلی توڑ دی جائے تو وہ فوراً توڑ دیں گے۔

بینظیر بھٹو اور فاروق لغاری کے درمیان تعلقات اب پوائنٹ آف نو ریٹرن تک پہنچ چکے تھے۔ حالات کسی ایک وجہ سے اس نہج پر نہیں پہنچے تھے۔ ایک دن ایوان صدر میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد ججوں کی تقرری کے مسئلے پر صدر اور وزیراعظم کے نمائندوں کے درمیان ایک میٹنگ ہوئی۔ صدر کی طرف سے خواجہ طارق رحیم، احمد سعید اعوان اور شاہد حامد نے شرکت کی۔ بینظیر بھٹو کی طرف سے وزیر قانون رضا ربانی، اس وقت کے لاء سیکرٹری اور آفتاب شیر پاؤ اس میٹنگ میں شریک ہوئے۔ یہ میٹنگ اسی وقت ہی ختم ہو گئی جب دونوں اطراف کے لوگوں نے اس مسئلے کو حل کرنے کے بجائے ایک دوسرے پر طنز کرنا شروع کر دیے۔

بینظیر بھٹو کو پتہ چل چکا تھا کہ معاملات بہت بگڑ گئے تھے۔ وہ پھر بھی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں کہ شاید بگڑی بات کہیں بن جائے۔ بینظیر بھٹو نے ایک رات شیر پاؤ کو پشاور فون کیا اور انہیں کہا کہ فوری طور پر اسلام آباد پہنچیں۔ وہ شیر پاؤ کے ساتھ فاروق لغاری سے ملنا چاہ رہی تھیں۔ آفتاب شیر پاؤ ابھی اسلام آباد کے لیے روانہ نہیں ہوئے تھے کہ بینظیر بھٹو نے بارہ بجے کے قریب 5 نومبر 1996 کو فون کر کے شیر پاؤ کو بتایا کہ اب انہیں اسلام آباد آنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ فاروق لغاری ان کی حکومت توڑ چکے ہیں۔ بینظیر بھٹو نے کہا کہ اب وہ آرام سے کل اسلام آباد آ جائیں۔

فاروق لغاری نے بینظیر حکومت توڑتے ہی پرائم منسٹر ہاؤس آنے جانے والے راستے بند کر دیے۔ کسی کو بینظیر بھٹو سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ آفتاب شیر پاؤ وہ واحد لیڈر تھے جنہیں بینظیر بھٹو سے ملنے کی اجازت دی گئی۔

اپنی حکومت کے توڑے جانے کے اگلے روز بینظیر بھٹو نے فاروق لغاری کو فون کیا اور ان سے پوچھا کہ ان کی حکومت کیوں توڑی گئی تھی۔ فاروق لغاری نے آگے سے جواب دیا کہ ہاں، وہ ان کی حکومت کو ڈس مس کر چکے ہیں۔ بینظیر بھٹو نے ان سے پوچھا کہ صوبائی اسمبلیوں کا کیا بنے گا۔ فاروق لغاری نے جواب دیا کہ وہ صوبائی اسمبلیوں کو بھی ڈس مس کریں گے۔

ٹیلی فون پر ہونے والی اس گفتگو کے درمیان میں فاروق لغاری نے بینظیر بھٹو کو یہ بھی پیشکش کی کہ وہ انہیں نگران سیٹ اپ میں شامل لوگوں کے ناموں کی فہرست بھی دکھا دیں گے۔

جب آفتاب شیر پاؤ ایک برطرف وزیراعظم سے پرائم منسٹر ہاؤس میں ملے تو انہوں نے بینظیر بھٹو کو یہ مشورہ دیا کہ وہ فاروق لغاری کے ساتھ رابطے میں رہیں کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔

بینظیر بھٹو نے شیر پاؤ سے کہا کہ وہ رضا ربانی کو ساتھ لے کر فاروق لغاری سے ملنے جائیں تاہم رضا ربانی مقررہ وقت پر وہاں نہیں پہنچے اور یوں شیر پاؤ کو فاروق لغاری سے ملنے کے لیے اکیلے جانا پڑا۔

لغاری نے شیر پاؤ کو بتایا کہ انہوں نے اتنا بڑا قدم کیوں اٹھایا تھا اور پھر وہ انہیں ان لوگوں کے نام بتانے لگے جو نگران حکومت کو چلائیں گے۔

باتوں باتوں میں فاروق لغاری نے شیر پاؤ سے کہا کہ وہ صوبے کے چیف منسٹر کے طور پر کام

سلطان محمود قاضی

ایک سیاسی ورکر جو آصف زرداری کے لیے رول ماڈل بنا

جب میں آصف علی زرداری صاحب سے ملنے کے لیے راولپنڈی کی احتساب عدالت میں گرمیوں کی ایک تپتی دوپہر میں گیا تھا تو میں نے ایک بات فوراً محسوس کی تھی کہ وہاں ان کے اردگرد جتنے بھی موجود دوست اور پارٹی ورکر بیٹھے تھے ان میں سے اگر وہ کسی کو سب سے زیادہ عزت اور احترام دے رہے تھے وہ بمشکل تین فٹ کا انسان تھا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ آخر چھوٹے سے قد والے اس انسان میں ایسی کیا غیر معمولی بات تھی کہ زرداری صاحب جیسا شخص بھی نہ صرف ان کی بات غور سے سن رہا تھا بلکہ اس طرح سر ہلا رہا تھا جیسے ان کا کہا ہوا ہر لفظ حرفِ آخر ہو۔ میں زرداری صاحب سے دیر تک گپ شپ کرتا رہا لیکن بار بار میری نظر اس شخص کی طرف اٹھ جاتی۔ مجھے یہ بہت برا لگ رہا تھا کہ میں زرداری صاحب سے انٹرویو چھوڑ کر ان سے یہ پوچھوں کہ یہ شخص کون ہے۔

میں نے اپنے انٹرویو کے دوران زرداری صاحب سے پوچھ لیا کہ انہوں نے ساری عمر عیاشی بھری زندگی گزاری تھی پھر ان کے اندر اتنی جرأت کہاں سے آ گئی تھی کہ انہوں نے آٹھ سال جیل میں گزار دیے۔ زرداری صاحب نے اپنی انگلی اٹھائی اور اپنے سامنے مجمعے میں بیٹھے ہوئے اسی چھوٹے قد والے شخص کی طرف اشارہ کر کے مجھے کہا کہ ہو سکتا ہے یہ شخص تمہیں قد میں بہت چھوٹا لگے، یار لیکن



سلطان محمود قاضی ذوالفقار علی بھٹو کے ہمراہ

یہ بڑے بڑے قد آوروں سے بڑا شخص ہے۔ جب میں اسے دیکھتا ہوں تو میرا حوصلہ بڑھتا ہے اور میں جیل کے کمرے میں واپس جا کر نئے سرے سے سختیاں جھیلنے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں۔

مجھے زرداری صاحب کی یہ بات سن کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا چھوٹا سا آدمی بھلا زرداری صاحب کے لیے کیسے ایک رول ماڈل ہو سکتا ہے۔

میں سمجھا کہ شاید زرداری صاحب نے حسب عادت مجھ سے کوئی مذاق کیا ہے۔

جونہی زرداری صاحب کا انٹرویو ختم ہوا تو میں نے فوراً بڑی بے چینی سے اپنے ایک صحافی دوست سے پوچھا کہ یار یہ کون آدمی ہے؟ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا کہ آپ اس کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

[illegible]

[illegible] درخواست نہ کرتا ہو۔

میرے دوست نے کہا کہ اس کا نام سلطان محمود قاضی ہے۔ یہ شخص [illegible] سال تک [illegible] میں اس وجہ سے گزار کر آیا ہے کہ اس پر الزام تھا کہ اس نے جنرل ضیاء الحق کو پھانسی دینے کے لیے [illegible] کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ [illegible] پارٹی کے جیالوں میں سب سے قد آور [illegible] جس نے کسی دور میں جنرل ضیاء جیسا [illegible] مرعوب رہا تھا۔

مجھے ایک شدید جھٹکا لگا اور میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر اس تیس لٹ کے انسان کو دیکھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہمارے ارد گرد چلتے پھرتے بھی ایسے کردار بھی ہیں جن کا ہو سکتا ہے قد تو بہت چھوٹا ہو لیکن ان کے اندر چھپا انسان ہم جیسے لوگوں سے شاید قد کاٹھ میں کئی گنا بڑا ہوتا ہے۔

مجھے آصف زرداری صاحب کے دل میں قاضی سلطان کے لیے موجود عزت اور احترام کی وجہ ایک لمحے میں آ گئی تھی۔ میں ایک قدم آگے بڑھا، احترام کے ساتھ جھکا اور اپنا ہاتھ قاضی صاحب کی طرف بڑھایا۔ وہ مجھے پہلے ہی زرداری صاحب کا انٹرویو کرتے دیکھ کر سمجھ چکے تھے کہ میں کون ہوں۔ وہ بڑے احترام سے ملے۔ میں نے ان سے ان کا نمبر لیا اور چپکے سے عدالت کے احاطے سے باہر نکل گیا۔

قاضی سلطان سے جب ملاقات ہوئی تھی اس وقت ان کی عمر 55 برس تھی۔ اب سات برس بعد جب یہ کتاب لکھی جا رہی ہے تو وہ 62 برس کے ہو چکے ہیں۔ ایک عام سیاسی ورکر کے لیے اس سے بڑا [illegible] کیا ہو سکتا ہے کہ [illegible] مجھے میں آصف زرداری جیسا بندہ اس بات کا اعتراف کرے کہ قاضی سلطان کو دیکھ کر اس کے اندر جیل کی سختیاں جھیلنے کی ہمت پیدا ہوئی تھی۔

قاضی 1949ء میں جب پیدا ہوا تو پوری گلی کو ایک بہت بڑا جھٹکا لگا۔ سب لوگوں کے لیے اس کے وجود کے ساتھ گزارہ کرنا ایک مشکل کام تھا۔ کبھی اس کی ماں کو ایک لمحے کے لیے بھی یقین نہ تھا کہ اس کے گھر ایک ایسا بیٹا پیدا ہوا ہے جس کا قد بڑھ نہیں سکے گا۔ جب وہ تھوڑا بڑا ہوا تو اس کے اپنے [illegible] اور گلی محلے کے لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا۔ لوگ اس کو دیکھ کر قہقہے لگاتے۔ ایک [illegible] [illegible] میں [illegible] ہوئے مزاروں پر لگتی تھیں، ان کی سی ہیں تھیں ان سے تھوڑی گپ کر [illegible]

کے بیٹے کو قتل کر دیا جائے۔ قاضی نے بھی سوچا ہوا تھا کہ وہ اپنا گھر نے قد کو اپنی کمی نہیں بنائے گا [illegible] وہ بھی پیچھے نہیں رہے گا۔ وہاں سے سکول بھی شروع کیا۔ جب اس نے [illegible] پاس کیا تو اس نے [illegible] کیا کہ اب وہ کوئی ایسا کام نہیں کرے گا [illegible] وہ نوکری کرے گا۔ سب سے پہلے وہ ایک ہوٹل گیا [illegible] اپنے اسے دیکھتے ہی ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔ جب قاضی صاحب نے نوکری کی درخواست کی تو اس نے بڑی حقارت کے ساتھ اسے باہر نکال دیا۔ اس پر وہ [illegible] کے بعد ایک شدید دھچکا تھا۔ وہ وہاں سے نکلا اور ایک اطالوی [illegible] کے پاس چلا گیا [illegible] ایک ہوٹل تھا۔ جب وہ ہوٹل میں بیٹھا اس غیر ملکی ہوٹل کے مالک سے ملنے کا انتظار کر رہا تھا تو وہاں کام کرنے والے پاکستانی ملازم تھے انہوں نے اس پر جملے کسنا شروع کر دیے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا سب کی باتیں سنتا رہا۔ آخر جب اسے اس اطالوی کے کمرے میں لے جایا گیا تو اس غیر ملکی نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ اس نے کوئی دوسری بات کیے بغیر قاضی صاحب کو بتایا کہ آج سے وہ [illegible] اس ہوٹل میں نوکری کرے گا۔

وہ خوش خوش گھر واپس لوٹا لیکن اسے پتہ نہیں تھا کہ ابھی زندگی نے اس کے ساتھ کچھ مذاق اور کرنے تھے۔ ابھی اس کی نوکری کی خوشی ختم نہیں ہوئی تھی کہ کچھ عرصے بعد وہ ہوٹل پی آئی اے کے کنٹرول میں آ گیا۔ اس کے پاکستانی بھائیوں نے اس پر ایک نئے سرے سے انتہائی گھٹیا مذاق کرنے شروع کر دیے۔ اس اطالوی نے بڑی سختی سے سب کو منع کیا ہوا تھا کہ کوئی بھی اس کے ساتھ کوئی بھونڈا مذاق نہیں کرے گا۔ اس کے جاتے ہی یہ سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے ہی پاکستانیوں کی باتیں برداشت کرتا رہا۔ کچھ دنوں بعد وہ ہوٹل کینیڈا کی ایک فرم نے خرید لیا اور قاضی صاحب کو دوبارہ وہی عزت اور مقام مل گیا جو اس ہوٹل کے اطالوی مالک کے دور میں ملا تھا۔

ایک دن قاضی صاحب نے یہ سنا کہ ذوالفقار علی بھٹو نام کا کوئی شخص ایک نئی سیاسی جماعت بنا رہا ہے۔ اخبار میں بھٹو صاحب کی پارٹی کا منشور پڑھتے ہوئے ایک جگہ قاضی صاحب کی نظریں رک گئیں۔ اس میں لکھا تھا کہ بھٹو صاحب کی نئی جماعت اس معاشرے کے تمام طبقات کو بغیر کسی امتیاز کے [illegible] دے گی۔ قاضی صاحب کے لیے یہ نئی بات تھی۔ اب تک انہوں نے ہر جگہ اپنا قد چھوٹا ہونے کی وجہ سے امتیازی سلوک کا ہی سامنا کیا تھا۔ اب کوئی ایک ایسا شخص پیدا ہو گیا ہے جو یہ وعدہ کر رہا ہے کہ وہ

سب کے ساتھ یکساں سلوک کرے گا اور انہیں عزت دے گا۔

یہ سب کچھ سوچ کر قاضی صاحب نے پیپلز پارٹی کو جائن کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ بھی معاشرے میں عزت کے ساتھ رہ سکیں۔ انہی دنوں بھٹو صاحب کے کچھ دوست امریکہ سے ملنے کے لیے پاکستان آئے اور وہ اسی ہوٹل میں ٹھہرے جہاں قاضی صاحب کام کرتے تھے۔ بھٹو صاحب نے خورشید حسن میر سے کہا کہ وہ امریکہ سے آنے والے مہمانوں کا خاص خیال رکھیں۔ قاضی صاحب نے ہوٹل کے ملازم ہونے کے ناطے بھٹو صاحب کے ان مہمانوں کی بڑی خدمت کی اور وہ پیپلز پارٹی کے لیڈروں کے قریب آ گئے۔ قاضی صاحب بھٹو صاحب سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ کبھی کبھی وہ ان کی شان میں ایک آدھ نظم بھی لکھ چکے تھے۔ کسی نے وہ نظم جا کر بھٹو صاحب کو سنائی تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بھٹو صاحب نے خورشید حسن میر اور نصر اللہ خٹک سے کہا کہ وہ اس شخص سے ان کی ملاقات کروائیں جس نے ان پر یہ نظم لکھی ہے۔ بھٹو صاحب کے علم میں نہیں تھا کہ جس شخص نے یہ نظم لکھی ہے اس کا قد اٹکل تین فٹ تھا۔ ان دونوں نے بھٹو صاحب کو مذاقاً کہا کہ اب ان کی پارٹی واقعی "Deep rooted" ہے کیونکہ اب ان کی پارٹی میں ایک ایسا ورکر بھی شامل ہو چکا ہے جس کا قد اٹکل تین فٹ ہے۔

نصر اللہ خٹک نے قاضی صاحب کو بتایا کہ بھٹو صاحب ان سے ملنا چاہتے ہیں اور وہ اسی کام کے لیے اسلام آباد آ رہے ہیں۔ جب ہوٹل کے عملے میں یہ خبر پھیلی کہ بھٹو صاحب ہوٹل کے ملازم قاضی صاحب سے ملنا چاہتے ہیں تو وہ سب ششدر رہ گئے۔ دوسری طرف قاضی صاحب جو ساری عمر لوگوں کے استہزائیہ مذاق اور جگتیں سہتے آئے تھے وہ اندر سے خوفزدہ تھے کہ پتہ نہیں بھٹو صاحب انہیں دیکھ کر کیا ردعمل ظاہر کریں۔ ہو سکتا ہے کہ بھٹو صاحب انہیں دیکھ کر شدید مایوس ہوں اور اپنے سامنے ٹھنگنے قد کے نوجوان کو دیکھ کر ان کے منہ سے بے ساختہ ہنسی نکل جائے۔ قاضی صاحب سوچتے رہے کہ ان کے لیے وہ لمحہ ناقابل برداشت ہو جائے گا اگر بھٹو صاحب جیسے خوبصورت شخصیت کے مالک نے ان کا دوسروں کے سامنے صرف اس وجہ سے مذاق اڑایا کہ ان کا قد چھوٹا ہے۔ قاضی صاحب انہی وسوسوں اور اندیشوں میں گھرے ہوئے تھے کہ انہیں بتایا گیا کہ بھٹو صاحب ہوٹل پہنچ چکے ہیں اور اپنے کمرے میں ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ دھڑکتے دل اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ قاضی صاحب

بھٹو صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے جن کے ساتھ مصطفیٰ کھر اور خورشید حسن میر بھی بیٹھے تھے۔ بھٹو صاحب قاضی صاحب کو دیکھ کر فوراً کھڑے ہو گئے۔ مصطفیٰ کھر اور خورشید حسن میر بھی بھٹو صاحب کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ بھٹو صاحب چند قدم آگے بڑھے۔ قاضی صاحب سے جھک کر ہاتھ ملایا اور بتایا کہ وہ ان سے ذاتی طور پر ملنا چاہتے تھے۔ جب وہ کمرے میں موجود صوفوں پر بیٹھ گئے اور ماحول دھیرے دھیرے بہتر ہوا تو قاضی صاحب نے بھٹو صاحب کو یہ بات بتا ہی دی کہ وہ ان سے ملنے سے کیوں خوفزدہ تھے۔ بھٹو صاحب کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا اور تھوڑے سے غصے کے ساتھ بولے کہ آپ نے بھلا یہ کیسے سوچ لیا تھا کہ میں آپ پر اس وجہ سے مذاق کرنا شروع کر دوں گا کہ آپ کا قد چھوٹا ہے۔ بھٹو صاحب نے قاضی صاحب سے کہا کہ آج کے بعد کبھی بھی ایسا نہ سوچنا کہ میرے جیسا بندہ صرف اس وجہ سے لوگوں پر ہنسے گا کہ ان کے قد چھوٹے پیدا ہوئے ہیں۔

جب سلطان محمود قاضی صاحب میرے سامنے بیٹھے آج سے چالیس سال پہلے کے اس واقعے کو یاد کر رہے تھے کہ کس طرح بھٹو صاحب نے انہیں بے پناہ عزت اور احترام دیا تو میں محسوس کر سکتا تھا کہ ایک عام سیاسی ورکر کے لیے اس کی زندگی میں اس سے بڑا لمحہ کبھی نہیں آ سکتا تھا اور ورکر بھی ایسا جس نے ساری عمر اس معاشرے میں پھیلے اپنے جیسے انسانوں کی جگتوں اور طنزیہ جملوں کا سامنا کیا ہو محض اس وجہ سے کہ قدرت نے اسے صرف تین فٹ کا پیدا کیا تھا۔

باتوں باتوں میں قاضی صاحب نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ چونکہ وہ اس ہوٹل میں ان کے مہمان ہیں لہٰذا ان کے سارے اخراجات وہ اپنی جیب سے ادا کریں گے۔ بھٹو صاحب قاضی صاحب کی یہ بات سن کر بہت متاثر ہوئے اور بڑی شائستگی سے ان کا شکریہ ادا کر کے انہیں بل دینے سے منع کیا۔

بھٹو صاحب ان سے ملنے کے بعد کراچی چلے گئے۔ پتہ نہیں اس ملاقات کا ان پر کیا اثر ہوا تھا کہ بھٹو صاحب نے کراچی سے قاضی صاحب کو شکریے کا ایک خط بھیجا۔

اسی دوران میں وہ ہوٹل جہاں قاضی صاحب کام کرتے تھے وہ ایک پاکستانی چوہدری نیاز احمد کو بیچ دیا گیا جنہیں بعد ازاں جنرل یحییٰ خان نے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا تھا۔ قاضی صاحب کے اندر ایک سیاسی ورکر جاگ چکا تھا۔ انہوں نے اخبار میں ایک بیان دے کر ہوٹل میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ جب یہ خبر چوہدری نیاز احمد نے پڑھی تو وہ آگ بگولا ہو گئے اور انہوں نے فوری طور پر قاضی

صاحب کو ہوٹل سے الگ کر دیا۔ جب یہ خبر کسی طرح بھٹو صاحب کے کانوں تک پہنچی تو انہوں نے خورشید میر اور مصطفیٰ کھر سے کہا کہ وہ فوری طور پر چوہدری نیاز سے بات کر کے قاضی صاحب کو نوکری پر بحال کرائیں۔

چوہدری نیاز احمد تک بھٹو صاحب کا یہ پیغام پہنچایا گیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ کچھ دنوں بعد بھٹو صاحب اسلام آباد آئے اور انہوں نے مصطفیٰ کھر اور خورشید میر کی موجودگی میں چوہدری نیاز احمد سے ذاتی طور پر درخواست کی کہ وہ قاضی صاحب کی نوکری بحال کر دیں کیونکہ وہ انہیں بہت عزیز ہیں۔ جب چوہدری نیاز احمد نے بھٹو صاحب کی درخواست سنی تو وہ بولے کہ قاضی صاحب نے ان کے خلاف ایک اخباری بیان جاری کیا ہے۔ اس پر بھٹو صاحب نے چوہدری نیاز احمد سے یہ کہا کہ وہ قاضی صاحب کے بیان کی وجہ سے انہیں پہنچنے والی زحمت پر معذرت خواہ ہیں۔

تاہم پتہ نہیں چوہدری نیاز کے ذہن میں کیا بات سمائی ہوئی تھی کہ انہوں نے بھٹو صاحب کی درخواست اور معذرت کو مسترد کر دیا اور قاضی صاحب کو نوکری پر بحال کرنے سے انکار کر دیا۔

چوہدری نیاز احمد کا انکار سن کر بھٹو صاحب بڑے غصے سے بولے:

"ٹھیک ہے چوہدری نیاز صاحب میں نے آپ سے کوئی اتنی بڑی چیز نہیں مانگی تھی کہ جسے پورا کرنے کے باوجود بھی آپ قاضی صاحب کو نوکری پر بحال کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ میں دو مہینے انتظار کر لیتا ہوں پھر آپ کو بھی دیکھ لیں گے۔"

اتنا کہہ کر بھٹو صاحب قاضی صاحب کی طرف مڑے اور بولے کہ آپ صرف دو مہینے انتظار کریں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

قاضی صاحب نے مسکرا کر بھٹو صاحب سے کہا کہ سر! میں اس ملک میں نئے انقلاب کے لیے سب کچھ سہنے کو تیار ہوں۔

ٹھیک دو مہینے بعد بھٹو صاحب اس ملک کے صدر بن گئے۔ صدر بنتے ہی بھٹو صاحب نے فون اٹھایا اور پہلا حکم یہی جاری کیا کہ قاضی صاحب کو نوکری دی جائے۔

پتہ نہیں بھٹو صاحب کے ذہن میں کیا آیا کہ دس ماہ بعد اچانک ایک دن بھٹو صاحب نے گورنر سے پوچھا کہ کیا چوہدری نیاز احمد ابھی بھی اس ہوٹل کو چلا رہے ہیں جہاں سے قاضی صاحب کو نکال دیا گیا

اور بھٹو صاحب نے فوراً آرڈر دیے کہ چوہدری نیاز کو ہوٹل کی انتظامیہ سے نکال دیا جائے۔

قاضی صاحب کے لیے یہ بڑی بات تھی کہ بھٹو صاحب جیسے لیڈر نے ان کی نوکری کی خاطر ہوٹل کے مالک سے سودے بازی کی۔ صدر بنتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ انہیں نوکری دی اور جس شخص نے انہیں پارٹی سے لگاؤ کی وجہ سے ہوٹل کی انتظامیہ سے نکال دیا۔ قاضی صاحب اب اس پیپلز پارٹی میں شامل ہو چکے تھے جو بھٹو صاحب کی پارٹی تھی۔ جب تک بھٹو صاحب اقتدار میں رہے قاضی محمود سلطان راولپنڈی کے پارٹی صدر رہے۔ جب بھی پارٹی کی میٹنگ ہوتی بھٹو صاحب انہیں سب سے پہلے عزت دیتے جس سے ان کا اپنی پارٹی میں مقام بہت بلند ہو گیا۔ بھٹو صاحب اس وجہ سے بھی قاضی صاحب کے لیے احتراماً کھڑے ہو جاتے تھے تاکہ پارٹی کا کوئی دوسرا لیڈر یا ورکر ان کی کبھی توہین نہ کرے اور نہ ان پر کوئی جملہ کسے۔

اسی اثناء میں وہ ہوٹل مستقل طور پر بند ہو گیا اور قاضی صاحب ایک مرتبہ پھر سڑک پر آ گئے۔ کسی نے یہ بات بھٹو صاحب کے کانوں تک پہنچائی کہ ان کا پسندیدہ پارٹی ورکر پھر بے روزگار ہو گیا ہے۔ بھٹو صاحب نے فون اٹھایا اور انہیں PTDC ہوٹلز کا ڈپٹی منیجر مقرر کرنے کے آرڈر دے دیے۔

سلطان محمود قاضی ایک صبح اٹھے تو پتہ چلا کہ وہ لیڈر جس نے انہیں عزت اور نوکری دی تھی اس کی حکومت پر ایک فوجی جنرل نے قبضہ کر لیا ہے اور وہ اس وقت گرفتار ہیں۔ قاضی صاحب کے لیے وقت آ گیا تھا کہ وہ اس شخص کے لیے اپنی وفاداری کا ثبوت دے جس نے ان کی نوکری کی خاطر ہوٹل کے مالک سے سودے بازی تک کر لیا تھا۔ قاضی صاحب نے سارے کام چھوڑ دیے اور پارٹی کے ورکروں کو منظم کرنا شروع ہو گئے۔ گرفتاریوں سے بچانے کے لیے قاضی صاحب نے پیپلز پارٹی کے ورکروں کو اپنے گھروں میں چھپانا شروع کر دیا۔ بھٹو صاحب کی رہائی کے لیے انہوں نے مظاہرے کرانے کا انتظام کیا۔ اپنے گھر کا روٹی پانی چلانے کے لیے وہ نوکری کے ساتھ ساتھ ان سیاسی ورکروں کو بھی اکٹھا کرنے میں لگے ہوئے تھے جو ان دنوں ملک میں مارشل لاء لگنے کی وجہ سے تتر بتر ہو گئے تھے۔

ایک دن قاضی صاحب کو پتہ چلا کہ پیپلز پارٹی کے راولپنڈی کے صدر نے ہاتھ کھڑے کر دیے ہیں اور وہ جنرل ضیاء کے خلاف مظاہرہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پارٹی ورکروں نے بھی شکایت کی اور انہوں نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ پارٹی کے راولپنڈی چیپٹر کے جنرل

[illegible]

جو یہاں ہوٹل میں پیدا کر سکتے تھے وہ کرتے۔

ایک دن منظور بھٹو نے انہیں بتایا کہ بھٹو صاحب فلیش مین ہوٹل کے کھانے کے بڑے شوقین تھے۔ اس کے علاوہ وہ بھٹو صاحب کے لیے ہوٹل سے کھانا بھی ان کے لیے بھجواتے تھے۔

جس دن بھٹو صاحب کو راولپنڈی کورٹ نے سزا سنائی اس دن قاضی صاحب نے راولپنڈی شہر میں ایک بہت بڑے مظاہرے کا اہتمام کیا۔ انہیں اسی دن گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ یہ پاکستانی تاریخ میں پہلی دفعہ ہوا تھا کہ پیپلز پارٹی کا ایک سیاسی ورکر اتنا قد آور ہو گیا تھا کہ جنرل ضیاء کی حکومت نے اسے گرفتار کر کے جیل میں رکھنا مناسب سمجھا۔

قاضی سلطان محمود کی سیاسی زندگی اب شروع ہو رہی تھی۔

گرفتاری سے پہلے قاضی صاحب کو یہ پتا چل گیا تھا کہ بھٹو صاحب کے کیس کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ میڈیا کے ذریعے بھی جنگ لڑیں۔ انہوں نے گھر سے پی پی پی کے [illegible]

[illegible]

○○○

قاضی صاحب جیل سے باہر اس لیے نہیں آنے دیتے تھے کہ وہ [illegible] کریں گے۔ انہوں نے ایک نئے سرے سے پارٹی ورکروں کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ ان کے جوش اور جذبے میں اس وجہ سے بھی تیزی آ گئی تھی کہ عدالتیں بھٹو صاحب کو پھانسی دینے کا حکم سنا چکی تھیں۔

ایک دن قاضی صاحب کو پھر گرفتار کر کے جیل بھجوا دیا گیا۔

ایک صبح جیل میں یہ خبر پھیل گئی کہ بھٹو صاحب کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ قاضی صاحب اور پارٹی کے کارکن جیل میں ایک دوسرے کے گلے لگ کر [illegible] جیل کی سلاخوں کے پیچھے سے [illegible] کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ قاضی صاحب نے ایک دوسرے سے [illegible] کہ بھٹو صاحب کی پھانسی کا بدلہ لیں گے۔

ایک دن قاضی صاحب کو ایک فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ [illegible]

کی کرسی پر براجمان تھے جس نے انہیں نو ماہ کی قید با مشقت سنا دی۔ قید کے علاوہ انہیں تین ہزار روپے جرمانہ بھی کیا گیا۔

میجر نے سر اٹھا کر طنزیہ نظروں سے اپنے سامنے کھڑے تین فٹ کے سیاسی ورکر کو دیکھا۔ اس کے اندر کا روایتی جرنیل تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلا اور بولا کہ مجھے تم پر ترس آ رہا ہے کہ تم جیل کیسے کاٹو گے۔

قاضی صاحب نے آگے سے مسکرا کر جواب دیا کہ میجر صاحب! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں انکار بھری اور دیگر کی طرح جیل میں آنسو نہیں بہاؤں گا۔ میں بڑی عزت اور شان سے اپنے جیل کے دن گزار کر جنرل ضیاء سے دوبارہ لڑنے کے لیے واپس راولپنڈی کی سڑکوں پر آؤں گا۔

قاضی صاحب کا دل ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ میجر کے کمرے سے نکلنے سے پہلے وہ مڑے اور بولے

"میجر صاحب! آپ لوگوں کا کام اس ملک کی سرحدوں اور اس کی عوام کی حفاظت کرنا ہے۔ آپ کیسے لوگ ہیں۔ آپ نے ایک ایسے شخص کو پھانسی لگا دی جو آپ کے ہزاروں فوجی بھارتی جیلوں سے واپس لے آیا تھا۔"

میجر کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ اور تو کچھ نہیں کر سکتا تھا اس نے حکم دیا کہ اس تین فٹ کے مجرم کو میانوالی جیل بھیج دیا جائے۔

قاضی صاحب جنگل میں روئے اور نہ ہی وہاں ماتم کیا کہ ان کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا گیا ہے۔ جب وہ میانوالی جیل سے نو ماہ بعد جیل کاٹ کر رہا ہوئے تو پارٹی کے ورکروں نے انہیں کندھوں پر اٹھا لیا۔ وہ اب ان کے لیے مزاحمت کا نیا نشان بن کر ابھرے تھے۔ پارٹی کے ورکر یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک تین فٹ کا انسان اتنی بہادری اور ہمت کا مظاہرہ کرے گا۔

قاضی صاحب مارشل لاء حکومت کے لیے ایک مستقل درد سر بن چکے تھے۔ ان کی جان نہ چھوڑیں۔ مارشل لاء کے طاقتور جنرل کے ایم عارف نے پی آئی ڈی سی کی انتظامیہ پر دباؤ ڈالا کہ وہ قاضی سلطان محمود کو نوکری سے نکال دیں۔ (یہ وہی جنرل ہیں جنہوں نے کتاب Working

with Zia لکھی ہے۔)

قاضی صاحب اب ان باتوں سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ اب ان کے لیے زندگی کا مقصد سرکاری نوکری کرنا نہیں بلکہ اس بھٹو کی پارٹی کے لیے کام کرنا تھا جس نے نہ صرف انہیں زندگی میں پہلی دفعہ عزت دی تھی بلکہ انہیں نوکری پر بحال کرانے کے لیے ہوٹل کے منیجر سے سوری تک کیا تھا۔

قاضی صاحب کو پتہ نہیں تھا کہ ابھی بھٹو صاحب کے عشق میں انہوں نے کچھ مزید امتحان بھی پاس کرنے تھے۔ 3 مارچ 1981ء کو جونہی پی آئی اے کے طیارے کے اغوا کی خبر پھیلی تو سب سے پہلے قاضی صاحب کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ راولپنڈی جیل سے انہیں گوجرانوالہ جیل بھیج دیا گیا۔ 8 اپریل کو انہیں آخر شاہی قلعے لاہور بھیج دیا گیا۔ جب قاضی سلطان شاہی قلعہ پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ وہاں نبیل، ساجد حیات، جہانگیر بدر، شفقت محمود اور دیگر پارٹی لیڈران پہلے سے ہی وہاں قید تھے۔ ان دنوں شاہی قلعہ پیپلز پارٹی کے ورکروں کے لیے ایک خوف اور وحشت کی علامت بن چکا تھا لیکن قاضی صاحب پھر بھی تین ماہ تک وہاں رہے۔

جب قاضی صاحب جیل سے واپس آئے تو انہیں ایک دفعہ پھر 27 دسمبر 1981ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ اب کی دفعہ ان پر ایک پولیس کانسٹیبل کو قتل کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ شاید کسی کو کوئی تھوڑی سی شرم آ گئی تھی کہ بھلا تین فٹ کا ایک انسان چھ فٹ کے کانسٹیبل کو کیسے قتل کر سکتا تھا لہٰذا انہیں ایک ہفتے بعد رہا کر دیا گیا۔

قاضی صاحب جیل سے آئے تو انہوں نے دوبارہ سیاسی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ 25 مارچ 1982ء کو انہیں ایک مرتبہ پھر گرفتار کر لیا گیا۔ راولپنڈی سے انہیں لاہور لے جایا گیا۔ کچھ دن انہیں سی آئی اے کے چوہدری سنٹر میں رکھا گیا۔ وہاں سے انہیں ایک دفعہ پھر شاہی قلعے بھیج دیا گیا۔ مارشل لاء حکومت کا دل اس سے بھی نہیں بھرا۔ انہوں نے قاضی صاحب کو اس قلعہ بھیج دیا جہاں سیاسی قیدیوں پر دوسروں سے تشدد کی جاتی تھی۔ قاضی صاحب کو وہاں ایک 8x7 فٹ کے ایک تاریک کمرے میں پھینک دیا گیا۔ وہ چھ دن تک اس کمرے میں تنہا دن رات برداشت کرتے رہے۔ بہاولپور قلعے سے نکال کر انہیں دوبارہ شاہی قلعے لایا گیا اور آخر میں انہیں کوٹ لکھپت جیل بھیج دیا گیا۔ انہیں سب سے خطرناک قیدیوں کی فہرست میں ڈال دیا گیا۔ وہاں دن رات انہیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں

[illegible] اس وقت پیپلز پارٹی کے لیڈر اپنے گھروں کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے [illegible] رہے تھے۔ حالات سے بخوبی بینظیر بھٹو واقف رہیں کہ کوئی بھی شاہی قلعے نہیں گیا تھا۔ قاضی صاحب [illegible] ہے۔ پارٹی کے لیے اس سے بڑی اور کوئی قربانی نہیں ہو سکتی۔

میں نے محسوس کیا کہ قاضی صاحب مجھے یہ ساری باتیں بتاتے ہوئے خود بھی ان لمحوں میں گم گئے تھے جب بینظیر بھٹو نے اس تحریک کے سیاسی ورکروں کو اپنی پارٹی کے قد آور لیڈروں سے بھی [illegible] تھا۔ قاضی صاحب نے بتایا کہ بینظیر بھٹو انہیں [illegible] عزت اور احترام [illegible] پارٹی کے معاملات میں ان کی بات بڑے غور سے سنتی تھیں۔ یہی وجہ تھی جب 2002ء کے انتخابات میں [illegible] پارٹی کی ایک میٹنگ میں پارٹی کے امیدواروں کا [illegible] کا فیصلہ [illegible] نے [illegible] میٹنگ میں شریک تھیں۔ اس وقت [illegible] قاضی سلطان صاحب بھی اس میٹنگ میں شریک تھے۔ بینظیر بھٹو نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ وہ کس پارٹی کے [illegible] امیدواروں کی [illegible] جب قاضی صاحب نے اپنی رائے دی تو بینظیر بھٹو نے اس رائے کا احترام کیا۔

اس سے قبل جب 1988ء میں بینظیر بھٹو پہلی دفعہ اقتدار میں آئیں تو پارٹی نے اپنے ورکروں کو بہت عزت دی اور پارٹی کے معاملات پر بھی ان کی بات کو اہمیت دی جاتی۔ یہی وجہ تھی جب 1989ء میں بینظیر بھٹو کے خلاف قومی اسمبلی میں تحریک عدم اعتماد پیش کی گئی تو پارٹی کے ورکروں نے اپنی حکومت کے حق میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا۔ جب 1990ء میں غلام اسحاق خان نے بینظیر بھٹو کی حکومت کو برطرف کیا تو پارٹی کے ورکر سڑکوں پر نکل آئے۔ قاضی صاحب کو اس بات کا گلہ تھا کہ جب دوسری دفعہ بینظیر بھٹو صاحبہ اقتدار میں آئیں تو پارٹی لیڈر بہت بدل چکے تھے۔ سیاسی ورکروں کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ لیڈروں اور ورکروں کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ قاضی صاحب کو افسوس ہوا کہ اس پارٹی کے ورکر اور لیڈر دونوں کہیں کھو گئے تھے۔ پارٹی قیادت نے اپنی ترجیحات بدل لی تھیں۔ ان لوگوں کو پارٹی میں اہمیت ملنے لگی جنہیں بھٹو صاحب کے کاز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ محض ذاتی [illegible] تھے۔ فاروق لغاری [illegible] پارٹی میں امیر لوگوں کو شامل کرنے پر کام کر رہا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے پارٹی کے ورکروں کی حوصلہ شکنی کی اور وہ یہ بھول گئے کہ پارٹی کے ورکر ہی اس کی اصل

حاصل تھے۔ یہی وجہ تھی جب 5 نومبر 1996ء کو فاروق لغاری نے بینظیر حکومت کو [illegible] تو پارٹی کے [illegible] ورکر سڑکوں پر احتجاج کرنے آئے اور نہ ہی [illegible] کے لیے پارٹی [illegible] ہو گئے۔

[illegible] پارٹی کے دور سے [illegible] ورکروں کے برعکس قاضی صاحب پیپلز پارٹی کے ساتھ وابستہ رہے [illegible] قاضی صاحب [illegible] نواز شریف کی حکومت کے خلاف [illegible] جیل بھیج دیا گیا۔

[illegible] قاضی صاحب نے مجھے بتایا کہ انہوں نے نواز شریف کی حکومت میں [illegible] سیاسی [illegible] کرتے ہیں۔

میں نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ [illegible] حکومت میں [illegible] کے ہاتھوں [illegible] گئی۔

قاضی صاحب بولے کہ [illegible] بینظیر بھٹو صاحبہ دوسری دفعہ پارٹی کے ورکروں سے [illegible] رکھے [illegible] انہوں نے [illegible] یہی وجہ تھی [illegible] بینظیر بھٹو کی [illegible] کے لیے سڑکوں پر کوئی نہیں آیا کیونکہ لیڈروں اور پارٹی ورکروں کے درمیان [illegible] ختم ہو چکا تھا [illegible] اس وقت تک کسی کو [illegible] احساس نہیں تھا۔

جب نواز شریف دوسری دفعہ اقتدار میں آئے تو ان پر دو تہائی اکثریت کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ قاضی سلطان محمود پر نواز شریف حکومت میں بہت سارے مقدمے درج کر کے انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ جب قاضی صاحب جولائی 2003ء میں میرے ساتھ بیٹھے اپنے پورے سیاسی ماضی کو کھنگال رہے تھے تو اس وقت بھی وہ راولپنڈی، گوجر خان، کوٹلی ستیاں، اسلام آباد، چکوال، مری، کہوٹہ، اٹک اور دیگر شہروں میں پیپلز پارٹی کے لیے سیاسی ریلیاں نکالنے کے الزام میں پولیس کو مطلوب تھے۔

نواز شریف کے بعد جنرل مشرف اقتدار میں آئے اور لیگل فریم ورک آرڈر کے خلاف ایک مظاہرے کا بندوبست کرنے پر قاضی صاحب کے نام ایک دفعہ پھر پرچہ درج کر دیا گیا۔

قاضی صاحب ایک مطمئن انسان ہیں۔ وہ اپنے بچوں اور خاندان کے دیگر لوگوں کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ لوگ اب ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر بڑا فخر کرتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کے وہ رکن ہیں جو سب سے بڑھ کر، ذوالفقار علی بھٹو سے لے کر نصرت بھٹو، بینظیر بھٹو، زرداری صاحب تک سب لوگ ان کی عزت کرتے رہے ہیں۔

میں نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ اب وہ آنے والے دنوں میں اپنا کیا سیاسی مستقبل دیکھتے ہیں تو وہ بولے کہ میری زندگی کی خواہش ہے کہ میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر سینیٹر بنوں۔ 2003ء مارچ میں ہونے والے انتخابات میں زرداری صاحب نے کوشش کی تھی کہ مجھے پارٹی کا ٹکٹ مل جائے لیکن پنجاب سے بھٹی کی تجویز نہ ہونے کی وجہ سے میرا نام ڈراپ کر دیا گیا تھا۔

زرداری صاحب واقعی یاروں کے یار ہیں۔ وہ 2003ء میں قاضی سلطان محمود کو پنجاب سے سینیٹ کا ٹکٹ تو نہ دلوا سکے لیکن بینظیر بھٹو کے قتل کے بعد جب 2008ء میں وہ پارٹی کے کوچیئرمین بنے تو انہوں نے اپنے پہلے چند کاموں میں سے جو ایک کام کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے قاضی سلطان محمود کو پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کا ممبر بنا دیا جہاں یوسف رضا گیلانی، مخدوم امین فہیم، راجہ پرویز اشرف، صفدر عباسی، رحمان ملک، نواب یوسف تالپور، قائم علی شاہ، شاہ محمود قریشی، احمد مختار، رضا ربانی، خورشید شاہ جیسے لوگ بیٹھتے ہیں۔ میرا خیال ہے آصف زرداری نے بھٹو کے اس سیاسی ورکر کو جس کو جنرل ضیاء کو قتل کرنے کی سازش کے جرم میں پانچ سال سزا دی گئی تھی، وہ عزت دی ہے جو انہیں شاید بینظیر بھی نہ دیتی۔

جنرل محمد امجد

جون 2003ء کی بات ہے کہ میں اور انگریزی اخبار ڈان کے دوست، چودھری ارشد شریف جو آج کل ڈان کے انگریزی ٹی وی چینل ڈان نیوز کے اسلام آباد میں بیورو چیف ہیں، اکٹھے قومی اسمبلی کا اجلاس کور کرتے تھے۔ ارشد شریف بہت ہی پڑھے لکھے صحافی ہیں۔ وہ ان صحافیوں میں سے ہیں جن کی میں بے پناہ عزت کرتا ہوں۔

ایک دن میں وقفہ سوالات سے ذرا لیٹ ہوا تو میں نے ارشد شریف کو قومی اسمبلی کی لابی میں تیزی سے جاتے ہوئے دیکھا۔ میں ان کے پیچھے دوڑا تو پتہ چلا کہ موصوف اس وقت وزارت دفاع کے پارلیمانی سیکرٹری میجر تنویر حسین (گلوکار طاہر وحید کے بھائی) کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ میرے پوچھنے پر ارشد بتانے لگے کہ دراصل تھوڑی دیر پہلے ایک سوال کے جواب میں میجر صاحب نے قومی اسمبلی کو بتایا تھا کہ فوجی فاؤنڈیشن کی ایک شوگر مل کی فروخت میں خاصی بے ضابطگیاں ہونے پر تحقیقات جاری ہیں۔

میں حیران ہوا کہ اس طرح کی خرید وفروخت اور اس میں بے ضابطگیاں تو ایک عام سی بات ہے۔ ارشد نے میری طرف دیکھا اور کہا جناب عالی! یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ فوجی فاؤنڈیشن کا ایم ڈی کون ہے۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو ارشد شریف بولے کہ ضرور ان کے آپ

اس خبر کی اہمیت نہیں سمجھ سکے۔ جنرل امجد اس فوجی فاؤنڈیشن کے چیئرمین ہیں جس پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ اس کی فروخت میں خاصی بے قاعدگیاں ہوئی ہیں۔

میرے ذہن میں فوری طور پر جنرل امجد کا نام کلک نہیں ہوا۔ ارشد نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ جناب یہ وہی موصوف ہیں، جو پہلے نیب کے چیئرمین تھے اور جنہوں نے احتساب کے نام پر 12 اکتوبر 1999ء کے بعد جو بھی ان کے ہاتھ چڑھا انہوں نے اسے اٹھا لیا۔ گرفتاری پہلے کی گئی اور الزامات بعد میں عائد کیے گئے۔

میں چونک پڑا۔ میں نے ارشد سے کہا استاد یہ تو واقعی بڑی خبر ہے۔

نیب کے جنرل امجد سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ ہم دونوں نے بیٹھ کر وہ خبر بنائی۔ اس خبر کی مختصر تفصیلات کچھ یوں تھیں کہ سندھ میں فوجی فاؤنڈیشن کی ایک ایسی شوگر مل تھی۔ جنرل امجد اس کے ایم ڈی بنے تو اسے فروخت کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ دو تین پارٹیوں سے بات چیت ہوئی۔ ایک پارٹی نے 37 کروڑ میں وہ مل خریدنے میں دلچسپی ظاہر کی۔ دوسری پارٹی نے اس کی بولی تیس کروڑ روپے لگائی۔ فوجی فاؤنڈیشن نے وہ شوگر مل تیس کروڑ روپے والے کے ہاتھ بیچ دی۔ اس خوش قسمت انسان نے دو تین دن بعد وہی شوگر مل 37 کروڑ بولی لگانے والی پارٹی کو بیچ دی۔ یوں راتوں رات اس ایک انسان نے بغیر کچھ کیے سات کروڑ روپے کما لیے۔ بعد میں پتہ چلا کہ جن صاحب کو یہ تیس کروڑ روپے کی مل بیچی گئی تھی وہ جنرل صاحب کے خیر خواہوں میں سے تھے۔

اب یہ خبر ڈان اور دی نیوز میں چھپی تو اس پر خاصا واویلا ہو گیا۔ سینیٹ کے اجلاس میں فرحت اللہ بابر نے اس پر ایک خاصی تقریر کی اور معاملے کو قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے دفاع میں بھیج دیا گیا۔

اس سٹوری کے چھپنے کے اگلے دن بعد فوجی فاؤنڈیشن نے انگریزی اخباروں میں ایک بہت بڑا اشتہار دیا جس میں بظاہر اس بات سے انکار کیے کہ سرکاری طور پر اس ڈیل کے خلاف تحقیقات ہو رہی تھیں بلکہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ سب اچھا تھا۔

آصف زرداری، یوسف رضا گیلانی اور مجھ سمیت پارلیمنٹ کے رہنما جیلوں میں جنرل امجد کی نیب کے ہاتھوں برا [illegible] رہے تھے۔ آج جنرل امجد خود کرپشن کے الزامات کا سامنا کر رہے تھے۔ اب [illegible] پارٹی نے اس کہانی کو خوب اچھالنے کا فیصلہ کیا اور بات واقعی شروع ہو گئی۔

ایک دن میں قومی اسمبلی میں تھا کہ مجھے اپنی پارٹی کی [illegible] بینا سرور کا فون آیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جنرل امجد ان کے انکل ہیں اور آج کل ان خبروں کی وجہ سے بڑے پریشان ہیں۔ بتانے لگیں کہ آپ اگر مناسب سمجھیں تو ان کا پوائنٹ آف ویو لے لیں۔ باقی آپ کی مرضی کہ آپ نے کیا اور کیسے لکھنا ہے۔

میں بینا سرور کی اس بات کی داد دوں گا کہ انہوں نے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں کہا کہ چونکہ جنرل امجد ان کے انکل ہیں لہٰذا میں کچھ ان کا خیال کروں جیسے عموماً ہم صحافی لوگ ایک دوسرے کو اپنے دوستوں یا قریبی رشتہ داروں کو اس طرح کی صورتحال میں بچا کر لکھتے رہتے ہیں۔ وہ [illegible] گروپ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صحافت میں مجھ سے بہت سینئر ہیں لہٰذا میں تو توقع کر رہا تھا کہ شاید وہ مجھے اپنے انکل پر کچھ ہاتھ ہولا رکھنے کا کہیں گی لیکن انہوں نے خالصتاً ایک پروفیشنل بات کی کہ مجھے ان کا پوائنٹ آف ویو بھی لے لینا چاہیے۔

بات چل نکلی ہے تو میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں کہ شاید بینا سرور کو یاد نہ ہو کہ 90 کی دہائی کے وسط کی بات ہے وہ لاہور میں دی نیوز آن سنڈے کی انچارج تھیں۔ میں ان دنوں نیا نیا صحافت میں آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں دی نیوز کے لاہور میں واقع دفتر میں دی نیوز آن سنڈے کے لیے ملتان کے اچھے صحافی خالد حسین سے ملنے چلا گیا۔ خالد حسین سے تو ملاقات نہ ہو سکی تاہم بینا سرور سے مل لیا۔ وہ اس وقت کمپیوٹر پر بیٹھی کام کر رہی تھیں۔ تمام روایتی صحافیوں کی طرح انہوں نے بھی کمپیوٹر سکرین سے نظریں ہٹائے بغیر مجھ سے دو تین منٹ بات کی۔ مجھ سے پوچھا کہ میں ملتان میں بیٹھ کر کس طرح کی رپورٹنگ کر سکتا ہوں۔ میں نے دو تین آئیڈیے انہیں بتائے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان دنوں ایم کیو ایم ملتان میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بینا سرور بولیں کہ اب اس کا کیا فائدہ؟ ایم کیو ایم کا غبارہ پھٹ گیا تھا۔ ان کو تو ملتان سے کوئی اچھا رسپانس نہیں ملا تھا۔ اب مردہ گھوڑے میں جان ڈالنے کا کیا فائدہ۔ دو تین منٹ کی گفتگو کے بعد میں نے اجازت لی کیونکہ مجھے احساس ہو گیا تھا کہ وہاں دال نہیں گلنے والی۔

مجھے یقین ہے کہ بینا سرور کو یہ ملاقات ہرگز یاد نہیں ہوگی کیونکہ اس طرح کے کئی نوجوان آتے ہوں گے جو اخباروں کے دفتروں میں پھرتے رہتے ہیں اور میں بھی ان میں سے ایک تھا۔

جنرل [illegible] اور میں ایک صحافی ہیں اس وجہ سے یقیناً آپ کا خیال کرتا ہوں کہ آپ ادارتی [illegible] کے اہل ہیں۔

میں ادارتی حیثیت سے کسی شخص کو مشورہ دینے کی پوزیشن نہیں رکھتا۔

اسی دوران میں میں نے محسوس کیا کہ لوہا گرم تھا۔ جنرل صاحب میری باتیں سننے کے موڈ میں تھے۔ میری گفتگو کا رخ بدلا اور میں نے تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد انہیں اس بات پر راضی کر لیا کہ مجھے اس دور کی کچھ کہانیاں بتائیں جب وہ نیب کے چیئرمین تھے۔

جنرل امجد بار بار اپنے امیج کے بارے میں بہت فکرمند تھے جو ان کے بقول میری خبروں سے بہت بری طرح تباہ ہوا تھا۔ اب وہ چاہتے تھے کہ اس امیج کو دوبارہ بہتر کیا جائے۔

میں دل ہی دل میں مسکرایا کہ بھلا جو چیز ایک دفعہ بگڑ جائے اسے کیسے ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب! اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ مجھے ذرا کھل کر نیب کے چیئرمین کی حیثیت سے کچھ واقعات سنائیں تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ آپ کتنے اچھے تھے اور آپ کو کیوں اور کیسے وہاں سے ہٹایا گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ جنرل امجد ان دنوں کے بارے میں بات کرنے میں کچھ تذبذب کا شکار تھے۔ خیر، میں نے بھی ہمت نہیں ہاری اور یوں جنرل امجد پہلی دفعہ کسی صحافی کو انٹرویو دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

جنرل امجد نے اپنی کرسی سے ٹیک لگائی۔ وہ اپنے ماضی میں کھو گئے اور میں کافی کی چسکیاں لینے لگا۔

12 اکتوبر 1999ء کو جنرل امجد اس وقت [illegible] جنرل تھے۔ شام کو [illegible] راولپنڈی میں [illegible] جنرل مشرف کو واپس [illegible] جنرل ضیاء الدین بٹ کو [illegible] جنرل امجد نے جنرل مشرف اور جنرل بٹ دونوں سے [illegible] 1999ء [illegible] جنرل امجد [illegible] جنرل مشرف نے [illegible]

ہو سکے ابھی قریب تھے کہ وہ بی بی سی کے شو میں بیٹھ کر بہت سارے ایسے معاملات پر [illegible] کر سکتے تھے جن کا آرمی چیف جنرل مشرف سے کوئی واسطہ ہوتا۔

میں نے جنرل امجد سے پوچھا کہ ان کا اپنا ذاتی خیال کیا تھا کہ فوج کو مارشل لاء لگانا چاہیے تھا۔ وہ کہنے لگے کہ آرمی مختلف انداز میں کام کرتی ہے۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے انہوں نے کہا کہ جب 1988ء میں جنرل ضیاء کی موت کے بعد جنرل اسلم بیگ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مارشل لاء نہیں لگائیں گے تو پوری فوج نے انہیں سپورٹ کیا، لیکن اسی فوج نے جنرل مشرف کا ساتھ دیا جب انہوں نے 12 اکتوبر کو مارشل لاء لگا دیا۔ اس سے آپ کو آرمی کی تربیت کا اندازہ ہو جانا چاہیے۔

ایک دن جنرل امجد کو بلا کر یہ کہا گیا کہ آج کے بعد انہوں نے پاکستان میں بے رحمانہ قسم کا احتساب کرنا ہے۔

جنرل امجد بڑے حیران ہوئے کہ آخر انہیں جنرل مشرف نے اس کام کے لیے کیوں چنا تھا۔

اپنی تقریر میں جنرل مشرف نے ان کے کندھوں پر ذمہ داری اور بڑھا دی جب میڈیا کے لوگوں کو انہوں نے خود یہ بتایا کہ ایک دن انتہائی ایماندار اور اچھے آرمی آفیسر کو نیب کا چیئرمین لگایا گیا تھا۔ جنرل امجد کو جنرل مشرف کی 16 اکتوبر 1999ء کو کی گئی تقریر سے یہ اندازہ ہوا کہ فوج اب کس طرح سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کا احتساب کرنا چاہتی تھی۔

جنرل مشرف نے جنرل امجد کو بٹھا کر کوئی بات نہیں سمجھائی کہ انہوں نے کیا کرنا تھا۔ جنرل امجد کو صرف اتنا بتایا گیا کہ انہوں نے ہر ایک کے خلاف کارروائی کرنی تھی اور احتساب کرنا تھا۔

جنرل مشرف کے ان الفاظ نے جنرل امجد کو وہ اعتماد دیا کہ پھر انہوں نے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ جنرل امجد کے لیے ایک سب سے آسان ہدف وہ لوگ تھے جنہوں نے بینکوں کے قرضے واپس نہیں کیے تھے اور جن کی فہرست فوری طور پر مل گئی تھی۔ جنرل صاحب نے فوری طور پر بینکوں کے [illegible] شروع کیا اور [illegible] کہ وہ اپنے ان [illegible] جنرل امجد نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ [illegible] 1999ء [illegible] جنرل امجد [illegible] 16 [illegible] 1999ء [illegible]

قرضے واپس کر دیں ورنہ وہ سخت ایکشن لیں گے۔ جوں جوں یہ (30) دن قریب آ رہے تھے جنرل امجد بینکوں کے ساتھ ان نادہندگان کی فہرستیں بنانے میں مصروف تھے جو قرضے واپس نہیں کر رہے تھے۔ 17 نومبر کو انہیں ان 322 لوگوں کی فہرست دی گئی جو جان بوجھ کر بینکوں کے قرضے واپس نہیں کر رہے تھے۔ بینکوں کی رپورٹ کے مطابق 211 ارب روپے کے قرضے واپس نہیں کیے گئے تھے۔ 148 ارب روپے کے قرضوں کی وصولی ممکن تھی کیونکہ وہ بینک کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت چل رہے تھے جبکہ 180 ارب روپے کا قرضہ واپس ملنے کی امید نہیں تھی۔ جنرل امجد نے احتساب کو ترجیح دیتے ہوئے ٹیکس چوری، [illegible] ٹیکس اور معمولی کرپشن کے خلاف ایکشن لینے کا فیصلہ کیا۔ [illegible] ان کی فہرست [illegible] ٹیکس چوری، [illegible] کرپشن اور رشوت سے [illegible] تھے۔ کچھ دنوں بعد نیب نے حکمت عملی بدلی اور سیاستدانوں کو ٹارگٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

میں نے جنرل صاحب سے پوچھا کہ پتہ نہیں کہ یہ فیصلہ کس نے کیا تھا کہ احتساب کی اس فہرست میں صرف سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کو نشانہ بنایا جائے گا جبکہ ججوں، جرنیلوں اور [illegible] احتساب سے باہر رکھا گیا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ ان کی فہرست صرف سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کے لیے تھی۔

میں نے کہا کہ جنرل صاحب! آپ کو تو جنرل مشرف نے اپنے سیاسی مخالفین کی سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنے کے لیے استعمال کیا تھا تاکہ وہ اس ملک کے جمہوری ادارے چھوڑ کر ان کے ساتھ آ جائیں۔ جنرل امجد نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ [illegible] لوگوں کے خلاف احتساب کر رہے تھے۔

اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے وہ مجھے بتانے لگے کہ انہوں نے [illegible] کے تمام سیاسی پارٹیوں میں موجود کرپٹ لوگوں کے خلاف کارروائی شروع کی تھی۔ [illegible] وہ اس بات کا انکشاف کر گئے کہ ان کے بعد آنے والے نیب کے چیئرمین نے بھی ان لوگوں کے خلاف تحقیقات کی ہوں گی جن کے خلاف ان کے دور میں [illegible] اور جو جنرل مشرف کے سیاسی دوست بن چکے تھے۔

ان کا اشارہ واضح طور پر جنرل خالد مقبول کی طرف تھا۔

جنرل کا خیال تھا کہ وہ اس ملک میں کوئی احتساب [illegible] نہیں کر رہے تھے۔ اس سے پہلے سیف الرحمن بھی نواز شریف کے دور میں [illegible] کے پاس احتساب [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میر ظفر اللہ خان جمالی

[illegible]

جمالی صاحب کے چہرے پر پھیلی ہوئی اداسی اور مایوسی ایک واضح پیغام دے رہی تھی کہ جنرل مشرف کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ان کے ساتھ دھوکہ ہوا تھا۔ استعفیٰ دینے سے صرف ایک دن پہلے ہی انہوں نے ہمارے صحافی دوست اظہار عالم کو یہ انٹرویو دیا تھا کہ وہ کہیں نہیں جا رہے تھے اور نہ ہی ان سے کسی نے استعفیٰ مانگا تھا۔ شاید انہیں اس چیز کا احساس اور دکھ زیادہ تھا کہ کسی نے ان کے ساتھ دھوکہ کیا تھا۔ اب ساری دنیا میں ان کے استعفیٰ کی خبریں گردش کر رہی تھیں تو طاقت کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے لوگ انہیں یہ یقین دلا رہے تھے کہ یہ سب جھوٹ تھا۔ وہ ہی وزیراعظم رہیں گے۔ ایک طرف ایک نیا وزیراعظم ڈھونڈا جا رہا تھا تو دوسری طرف انہیں یہ یقین دہانیاں کرائی جا رہی تھیں کہ وہ تسلی رکھیں۔ جمالی صاحب کے کمرے میں ایک سوگ کی سی کیفیت واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھی۔ میں بھی پہلے سے بیٹھے ہوئے سوگواروں کی قطار میں بیٹھ گیا۔ سلام دعا کے بعد جمالی صاحب نے اسلام آباد کے ایک اردو اخبار کے مشہور صحافی کا نام لیا اور کہا کہ شکر کریں ان کی وجہ سے میری ملاقات ہو رہی تھی۔ ان کا پروگرام تو بلوچستان جانے کا تھا لیکن اس صحافی دوست نے اصرار کیا کہ آج شام ان کے گھر پر کھانے کی دعوت کھا کر ہی وہ بلوچستان جائیں۔ وہ صحافی دوست کے اصرار کے سامنے انکار نہیں کر سکے اور یوں آج شام انہوں نے اس کے گھر پر کھانا کھانے جانا تھا۔ جونہی میں نے جمالی صاحب سے سوال و جواب کرنے شروع کیے تو انہوں نے اپنے ٹیلی فون آپریٹر کو کہا کہ اب کسی کی اندر کال نہیں ملانی۔ ہماری بات چیت کو چند لمحے ہی گزر رہے تھے کہ ان کے اسٹاف کی [illegible] گھنٹی بجی۔ جمالی صاحب نے غصے سے فون اٹھا کر آپریٹر کو کہا کہ میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ اندر فون نہیں دینا۔ ایک لمحہ آپریٹر کی بات سن کر چپ ہو گئے۔ ریسیور کو ہاتھ لیا۔ دوسری طرف سے کسی سے مختصر سی بات کی۔ ان کے چہرے کا رنگ یکدم فق ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے کوئی ایسی بات کہہ دی تھی جس کی وہ توقع نہیں کر رہے تھے۔

مجھے لگا کہ شاید یہ فون انہیں کسی حکومتی شخصیت کی طرف سے آیا تھا جنہوں نے انہیں استعفیٰ دینے سے روکنے کی کوشش کی تھی کہ جمالی صاحب شاید کہیں ضرورت سے زیادہ [illegible] نہ کر دیں۔

[illegible]

جمالی صاحب تھوڑی دیر اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے رہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ٹیلی فون کرنے والا کون تھا اور اس نے ایسی کون سی بات کہہ دی تھی کہ جس سے جمالی صاحب یکدم بے چین اور چہرے پر افسردہ ہو گئے تھے۔ آخر ان سے رہا نہ گیا اور بول پڑے کہ یہ میرے اسی صحافی دوست کا فون ہے جس نے آج اپنے گھر پر میرے کھانے کی دعوت رکھی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اسے کوئی ضروری کام تھا لہٰذا یہ دعوت کینسل۔ جب جمالی صاحب پھر کبھی بلوچستان سے واپس اسلام آباد آئیں گے تو وہ دوبارہ انہیں گھر کھانے پر بلائے گا۔

جمالی صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ وہ محض اپنے اس صحافی دوست کے اصرار پر دو دن سے بلوچستان ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اب وہی دوست انہیں یہ کہہ رہا تھا کہ اسے کوئی اور ضروری کام پڑ گیا ہے۔

اتنی دیر میں فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ جمالی صاحب نے غصے سے ریسیور اٹھایا اور صرف اتنا کہا کہ میں ان سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ پتہ چلا کہ یہ وہی صحافی دوست تھے جنہوں نے جمالی صاحب کو دوبارہ فون کیا تھا۔

جمالی صاحب کو شاید پہلا دھچکا اس وقت لگا ہوگا جب جنرل مشرف کا انہیں یہ پیغام ملا ہوگا کہ وہ استعفیٰ دے دیں اور اب انہیں اپنے صحافی دوست کی کال ریسیو کر کے کہ اس نے رات کا کھانا کینسل کر دیا تھا دوسرا دھچکا لگا تھا۔ انہیں شاید پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ اب وہ اس ملک کے وزیراعظم نہیں رہے تھے اور وہی صحافی دوست جو گھنٹوں [illegible] کہ جمالی صاحب [illegible] اب انہیں اپنے گھر پر کھانا کھلانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس صحافی دوست کا رویہ جمالی صاحب کے لیے واضح تھا کہ اب وہ وزیراعظم نہیں رہے [illegible] صحافی سے ایک [illegible] سلوک کی توقع رکھیں۔

جمالی صاحب کے ساتھ وہ لمحے [illegible]

میں نے پوچھا ... جمالی صاحب سے پوچھا کہ ان کے ... [illegible]

[illegible]

میں نے بڑی عجیب سی بات محسوس کی کہ اتنی ساری بے عزتی، جلا وطنی اور جیل کاٹ کر بھی ... کے باوجود ابھی جمالی صاحب اس بات پر بڑا فخر محسوس کر رہے تھے کہ ان کے استعفیٰ دینے کے بعد صدر مشرف نے انہیں فیملی کے ساتھ ایوان صدر میں کھانا دیا تھا۔ جمالی صاحب نے اپنی آواز میں ... پیدا کرنے کی کوشش کی کہ وہ پاکستانی تاریخ کے شاید پہلے وزیر اعظم تھے جنہیں بڑی عزت و تکریم سے وزیر اعظم ہاؤس سے رخصت کیا گیا تھا ورنہ ماضی میں تو لیاقت سے لے کر جونیجو، بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کو انتہائی ذلیل کر کے یہاں سے رخصت کیا گیا اور جیلوں میں ڈالا گیا۔

ایوان صدر میں لگی کھانے کی بڑی میز پر بیٹھے ہوئے جمالی نے جنرل مشرف کو بتایا کہ وہ جنرل ایوب اور ضیاء کے ادوار میں جیلوں میں بھی رہے تھے۔

جنرل مشرف کو حیران دیکھ کر جمالی نے انہیں اپنی زندگی میں حاصل کیے گئے چند تجربوں کی کہانی سنانا شروع کی۔ شاید وہ انہیں ابھی بھی جبکہ وہ وزیر اعظم ہاؤس سے نکالے جا چکے تھے، متاثر کرنے کے چکر میں تھے۔

جمالی نے مشرف کو بتایا کہ ایک سیاستدان کی زندگی میں تین قسم کے دوست ہوتے ہیں۔ کالج یونیورسٹی، جیل اور سیاست کے دنوں کے دوست۔

جمالی نے جنرل کو کہا کہ ایک سیاستدان اپنی سیاسی زندگی میں بنائے گئے دوستوں پر کبھی بھی اعتماد نہیں کر سکتا۔ آپ جیل اور کالج یونیورسٹی کے دوستوں پر اب بھی بھروسہ کر سکتے ہیں۔

جنرل مشرف چپ چاپ بیٹھے ان باتوں سے محظوظ ہوتے رہے ... ایک ایسے وزیر اعظم کی ... [illegible] ... کہ جنرل صاحب ... [illegible]

[illegible] ... انہوں نے مجھے ... [illegible]

جمالی کی یہ بات چار سال بعد اس وقت سچ ثابت ہوئی ... [illegible] ... 2007 کے آخری دنوں میں چوہدری شجاعت نے جنرل مشرف کے ... پارٹی کی قیادت چھوڑنے سے انکار کیا ... جمالی کی چار سال پہلے والی وہ بات یاد آ گئی کہ سیاست میں بنائے گئے دوست کبھی قابل اعتماد نہیں ہوتے۔

باتوں باتوں میں جمالی صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جب وہ ... امریکہ جانے لگے تو انہوں نے جن صحافیوں کی لسٹ تیار کی ان میں سے چار صحافیوں کے نام ایوان صدر نے کاٹ دیے۔ ان چار صحافیوں کے نام کاٹنے کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ وہ جنرل مشرف کے خلاف لکھ رہے تھے۔

جب میں یہ انٹرویو جمالی صاحب سے بلوچستان ہاؤس میں کر رہا تھا اس سے چند روز پہلے ہی شوکت عزیز پر اٹک میں خودکش حملہ ہوا تھا جب وہ ایم این اے کا الیکشن لڑنے کے لیے ایک انتخابی جلسے سے خطاب کر کے جا رہے تھے۔ انہیں ایم این اے اس لیے بنایا جا رہا تھا کہ وہ جمالی کی جگہ اس ملک کے وزیر اعظم بن سکیں اور اس دوران چالیس دنوں کے لیے چوہدری شجاعت حسین کو وزیر اعظم بنایا گیا تھا جن کے بارے میں اسلام آباد میں یہ مذاق مشہور تھا کہ وہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم ہیں جو اپنی مقررہ مدت چالیس دن پوری کر کے باعزت طریقے سے گھر چلے جائیں گے۔

میں نے کہا کہ جمالی صاحب! مجھے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ شوکت عزیز پر ہی کیوں خودکش حملہ کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی جا رہی ہے کہ وہ جنرل مشرف کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے اس لیے ان پر خودکش حملہ کیا گیا۔ میں نے کہا اگر یہی معیار ہے تو شوکت عزیز پر حملے کا ... جمالی صاحب آپ پر اور شجاعت حسین پر بھی اسی طرح کا حملہ ہونا چاہیے تھا۔

میرا یہ دلچسپ سوال سن کر جمالی صاحب چونک گئے اور انہوں نے اس کے جواب میں مجھے شوکت عزیز ... کی چند باتیں بتائیں۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ شوکت عزیز کو اپنے آپ کو اٹک سے ایم این اے منتخب کرا کر وزیر اعظم بننے کا فیصلہ غلط تھا۔ اگر شوکت عزیز کو بننا ہی چاہیے تھا تو جمالی صاحب کے بقول وہ اپنی سیٹ ان کے لیے خالی کر دیتے۔

دوسری وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ شوکت عزیز پر قاتلانہ حملے کا سیاسی فائدہ کس کو ہوا تھا۔ ان کے بقول یہ بہت اہم سوال تھا جس پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔

تیسرے انہوں نے کہا کہ بالعموم یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ شوکت عزیز عالمی اداروں اور بیرونی طاقتوں کا نمائندہ ہے لہٰذا اس لیے بھی اس پر حملہ کیا گیا۔

چوتھی وجہ یہ تھی کہ شوکت عزیز جس کا اپنا کوئی سیاسی بیک گراؤنڈ نہیں تھا، وہ ان تمام برسوں میں جنرل مشرف کے بہت قریب رہا تھا۔

پانچویں وجہ یہ تھی کہ بہت سارے پارٹی کے لیڈر بھی شوکت عزیز کے وزیر اعظم بننے پر خوش نہیں تھے اگرچہ وہ اس فیصلے پر خاموش رہے لیکن انہیں یہ فیصلہ پسند نہیں تھا۔

آخری بات یہ تھی کہ شوکت عزیز کو وزیر اعظم نامزد کر کے انہیں پارٹی [illegible] کا ایک بہت بڑا [illegible] تھا کیونکہ ان کو پارٹی کے بہت سارے لوگوں کے سامنے لا کھڑا کیا گیا اور ان پر قاتلانہ حملہ اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ ان کے بقول جب پارٹی کسی کو اہم منصب کے لیے نامزد کرتی ہے تو اس وقت سیاسی اعتماد کا فقدان ہوتا ہے۔ پوری کی پوری پارٹی اس وزیر اعظم کے پیچھے پوری قوت سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ شوکت عزیز کو پارٹی نے وزیر اعظم نامزد نہیں کیا تھا لہٰذا ان کے پاس پارٹی کی کوئی حمایت نہیں تھی۔

آخر میں جمالی صاحب نے کہا کہ مجھے چودھری برادران، ایم این ایز کے علاوہ پاکستان مسلم لیگ کی جانب سے [illegible] نہیں کی تھی۔ [illegible] دنوں میں انہوں نے پارٹی کے کسی اہم رہنما کو [illegible] نہیں دیکھا۔ جمالی کے بقول یہ بھی ممکن تھا کہ [illegible] وہ جمہوری نظام کے خلاف تھیں لہٰذا انہوں نے شوکت عزیز پر حملہ کرا کر جنرل مشرف کو یہ پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہو۔

میں نے ایک بات نوٹ کی کہ جمالی صاحب چودھری شجاعت پر تو بہت ناراض تھے لیکن وہ شوکت عزیز کی برائی نہیں کرتے اور [illegible] لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ [illegible]

بہت قابل آدمی ہیں اور آنے والے دنوں میں اس ملک کو بڑے اچھے طریقے سے چلا لیں گے۔ تاہم انہوں نے یہ بات ضرور کہی کہ شوکت عزیز کو سیاسی طور پر بہت جلد یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ ان قوتوں سے بچ کر رہیں جنہوں نے ان کے خلاف سازشیں کر کے انہیں وزارت عظمیٰ کے عہدے سے ہٹایا۔ جمالی صاحب کے بقول شوکت عزیز باقی تمام محاذوں پر کامیاب رہیں گے لیکن سیاسی محاذ انہیں شدید مشکلات کا شکار کر سکتا تھا۔

جمالی صاحب نے نام تو نہیں لیا لیکن ان کا واضح اشارہ چودھری شجاعت حسین، چودھری پرویز الٰہی اور [illegible] کی طرف تھا جنہوں نے جمالی کو سیاسی طور پر اتنا کمزور کر دیا تھا کہ جب [illegible] گیا تو جمالی صاحب لوگوں میں [illegible] گھر جا چکے تھے۔

جو بعد کے واقعات نے یہ ثابت کیا کہ شوکت عزیز جنہیں سیاست کا کوئی تجربہ نہیں تھا، جمالی صاحب جیسے پچاس برس سے زیادہ سیاست کرنے کے باوجود [illegible] سے زیادہ کامیاب ہوئے تھے۔ انہوں نے 15 نومبر 2007 تک جب انہوں نے وزارت عظمیٰ چھوڑی چودھری شجاعت، پرویز الٰہی اور [illegible] کو اپنے خلاف ایک بھی سازش نہیں کرنے دی اور [illegible] سے اپنا وقت پورا کیا۔ شوکت عزیز نے یہ ثابت کیا کہ وہ جمالی صاحب سے زیادہ [illegible] تھے اور انہیں پتہ تھا کہ ان تینوں چودھری شجاعت، پرویز الٰہی اور [illegible] سے کیسے نمٹنا ہے۔

ان دنوں جمالی صاحب کے بیٹے فرید جمالی کے خلاف کرپشن کی بہت کہانیاں چھپ رہی تھیں۔ جب میں نے یہ بات پوچھی تو انہوں نے بڑے افسوس کا اظہار کیا کہ لوگ کتنے ظالم ہیں کہ انہوں نے ان کے اس پیارے بیٹے کو بھی نہیں بخشا جو کئی سالوں سے [illegible] ہے۔

جمالی صاحب کو پتہ نہیں کیا یاد آیا کہ وہ جنرل ضیاء الحق اور ان کے دور کے ساتھ بھٹو کی پھانسی پر بات چیت کرنے لگے۔ ایک رات 1988 کی ایک [illegible] کے دوران انہوں نے جنرل ضیاء سے بھٹو کی پھانسی کا معاملہ ڈسکس کرنا شروع کیا۔ جمالی جنرل ضیاء سے یہ پوچھ رہے تھے کہ انہوں نے وہ رات کیسے گزاری تھی جس رات ان کے حکم پر بھٹو کو صبح کے وقت پھانسی دی جانی تھی۔

[illegible]

نواز شریف

[illegible] 2004 [illegible]

[illegible] 2004 [illegible]

[illegible]

سال بھی ابھی گزرا تھا۔

میں بڑا حیران ہوا کہ ابھی اللہ کے گھر سے مجھ جیسے گنہگار کے لیے ایک بلاوا آ گیا تھا۔ جہاں خدا کے گھر حاضری دینے کی خوشی تھی وہاں میرے ذہن میں یہ بات بھی جنم لے رہی تھی کہ شاید نواز شریف سے ملاقات کا موقع ملا تو اپنے اخبار کے لیے ان کا انٹرویو ضرور کروں گا۔ میں نے مسلم لیگ نواز کے لیڈر خواجہ محمد آصف سے درخواست کی کہ وہ میاں نواز شریف صاحب کو فون کر دیں کہ اس طرح ان سے ملنے اور بات کرنے میں آسانی رہے گی۔ خواجہ آصف نے شہباز شریف کو میرے بارے میں بتایا تو انہوں نے کہا کہ رؤف جب جدہ آئے تو ان سے رابطہ کر لے۔

میں اور ایکسپریس کے چیف رپورٹر محسن گوندل اسلام آباد ایئرپورٹ سے جدہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے دیں کہ اگر محسن گوندل میرے ساتھ نہ ہوتے تو شاید میں اچھے طریقے سے حج اور اس کے فرائض ادا نہ کر سکتا۔ محسن گوندل نے مجھ سے زیادہ حج کی تیاری کی ہوئی تھی اور ان کی تیاری میرے بہت کام آئی۔ اگر میرا حج خدا کے حضور قبول ہوا تو اس میں یقیناً محسن گوندل کا [illegible] ہوا تو تھا۔ محسن گوندل اور میں نے اپنے ہوٹل کے قریب واقع خوبصورت ساحل پر شام کو دور تک [illegible] سے سنا تھا۔

میں نے ایک دن [illegible] فون کیا۔ [illegible] کو بتایا کہ میں نے شہباز شریف سے بات کرنی ہے۔ [illegible] مجھ سے بات کریں گے۔ [illegible] شہباز شریف سے بات ہو گی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ خواجہ آصف نے [illegible] آ جائیں گے [illegible] شہباز شریف نے [illegible] جب میں [illegible] شہباز شریف [illegible] صاحب سے [illegible] ایک [illegible]

[illegible]

[illegible] شہباز شریف [illegible] بھی اپنی فیملی کے ساتھ وہاں آ گئے تھے [illegible] میاں صاحب سے ملنے سرور پیلس چلے گئے۔ انہوں نے مجھے [illegible]

دیکھا تو بڑے خوش ہوئے۔ میاں صاحب سے میرا بھی تعارف کروایا۔ چوہدری صاحب کی بڑی مہربانی کی انہوں نے میرے بارے میں اتنے اچھے الفاظ استعمال کیے کہ میں آج جب پانچ سال بعد [illegible] سوچتا ہوں تو وہ سب کچھ میرے ذہن میں ہے۔ میاں صاحب ایک بہت بڑے ہال میں بیٹھے ہوئے تھے اور مسلسل قرآن پاک کی تلاوت ہو رہی تھی۔ ان کے ارد گرد بہت سارے لوگ بیٹھے تھے جن میں پاکستان سے آنے والے بھی شامل تھے۔ ایک صاحب کے ذمے یہ تھا کہ پاکستانی اخبارات میں چھپنے والے کالم اور خبریں اونچی آواز میں وہاں موجود سب لوگوں سمیت میاں صاحب کو سنائے۔ جب وہ خبر یا کالم سنا چکا ہوتا تو اس پر بحث مباحثہ شروع ہوتا۔ میاں صاحب تحمل سے سنتے اور پھر کوئی جملہ یا جملہ کستے۔ اتنی دیر میں نماز کا وقت ہوا۔ سب لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ چوہدری نثار علی خان کی کمر میں تکلیف تھی وہ جھک نہیں سکتے تھے لہٰذا ان کے لیے کرسی لائی گئی۔ میاں نواز شریف صاحب اگلی صف میں کھڑے تھے اور میں ان کے پیچھے والی صف میں کھڑا تھا۔ [illegible] اچانک میں نے محسوس کیا کہ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اگلی صف میں کھینچ لیا۔ یہ میاں نواز شریف صاحب تھے جنہوں نے مجھے اپنے دائیں طرف کھڑا کر لیا۔ نماز کے بعد [illegible] شہباز شریف کے بارے میں پوچھا [illegible] شہباز شریف اپنے بیٹے سے ملنے گئے [illegible]

[illegible]

[illegible]

اسی دوران میز پر کھانا لگ چکا تھا۔ میاں صاحب کی یہ کوشش تھی کہ ہر مہمان کی پلیٹ میں پہلے کھانا ڈال دیا جائے۔ اسی دوران کسی نے آ کر میاں صاحب کو بتایا کہ امریکہ سے ڈاکٹر شاہد مسعود ان سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ میاں صاحب نے کھانے کی ٹیبل پر ان سے بات کی اور بار بار میری طرف دیکھا۔ میں یہ حیران ہوا کہ وہ مجھے ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہے تھے۔

ڈاکٹر شاہد مسعود ان سے شہباز شریف کی امریکہ روانگی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ پاکستان میں بہت بڑی خبر تھی کہ شہباز شریف کو سعودی عرب چھوڑ کر امریکہ جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ میاں صاحب اور وہاں موجود لوگوں کی یہ کوشش تھی کہ یہ خبر اس وقت تک آؤٹ نہ ہو جب تک شہباز شریف کا جہاز جدہ ایئرپورٹ سے اڑ نہ جائے کہ کہیں آخری مرحلے پر ہی جنرل مشرف کی حکومت کوئی مسئلہ نہ پیدا کر دے۔

میاں صاحب نے ڈاکٹر شاہد مسعود کا فون بند کرتے ہی مجھ سے پوچھا کہ رؤف صاحب آپ نے ہی یہاں سے بیٹھے ہوئے یہ خبر ڈاکٹر شاہد مسعود کو لیک کی تھی۔

ایک لمحے کے لیے میں ڈر کر رہ گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے بھرے چوک میں ننگا کر دیا ہو۔ میری تو اس وقت ڈاکٹر شاہد مسعود سے جان پہچان ہی نہ تھی۔ سب سے بڑھ کر میں اس بڑی اچھی Exclusive خبر کو دبا رہا تھا اور میں نے سوچا ہوا تھا کہ کھانے کے بعد میاں صاحب سے اجازت لے کر یہ خبر اپنے اخبار دی نیوز کے لیے فائل کروں گا۔ بھلا میں کیوں کر اتنی بڑی خبر ڈاکٹر شاہد مسعود کو دوں گا۔

میں نے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھالا اور میاں صاحب کو بتایا کہ میں تو ڈاکٹر صاحب کو ذاتی طور پر جانتا بھی نہیں اور دوسرے ایک صحافی کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اتنی بڑی خبر اپنے نام سے شائع کرے [illegible] صحافی کو دے کر وہ اس کا کریڈٹ لے سکے۔

میاں صاحب نے چپ کر کے میری بات تو سن لی لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ انہیں ابھی بھی شک تھا کہ [illegible] نے لیک کی ہوگی اور [illegible] بات نہیں کی تھی۔

کھانے کے بعد میں چوہدری نثار کے پاس گیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ میاں صاحب سے میرا ایک انٹرویو کرا دیں۔ نثار نے کہا کہ وہ میاں صاحب سے بات کریں گے۔

اس سے پہلے میں میاں صاحب سے دو تین دفعہ باتوں باتوں میں یہ درخواست کر چکا تھا لیکن انہوں نے مجھے ایک بار بھی اس کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ مسلسل قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے چہرے پر ہر وقت سنجیدگی طاری رہتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب لندن میں دو برس بعد ان سے ملاقات ہوئی تو اتنے ہشاش بشاش اور گپ شپ کرنے والے لگے کہ میں حیران رہ گیا کہ یہ وہی ہیں جن سے دو سال پہلے میں جدہ میں ملا تھا جو ہر وقت قرآن پاک ہاتھ میں لے کر چہرے پر سنجیدگی طاری کیے ہوئے ملتے تھے۔

میاں نواز شریف صاحب میرے انٹرویو کی درخواست کو ٹال گئے۔ آخر طے ہوا کہ جب میں حج کر کے جدہ واپس آؤں گا تو اس وقت اس پر دوبارہ بات کریں گے۔

اگلے ہفتے میں حج کر کے واپس آیا تو میں نے چوہدری نثار علی خان سے دوبارہ رابطہ کیا۔ انہوں نے مجھے پھر وہیں سرور پیلس بلا لیا۔ میاں صاحب کسی طرح بھی انٹرویو پر راضی نہیں ہو رہے تھے۔ چوہدری نثار انہیں راضی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چوہدری نثار دراصل مجھے ممنون کرنا چاہتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میاں صاحب چوہدری نثار کے کہے بغیر شاید اس انٹرویو کے لیے کبھی تیار نہ ہوتے۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ دراصل سعودی حکومت اور جنرل مشرف کے درمیان ہونے والی ڈیل میں یہ بات بھی طے ہوئی تھی کہ نواز شریف کسی پاکستانی اخبار کو انٹرویو نہیں دیں گے اور نہ ہی سیاست پر گفتگو کریں گے۔ میاں صاحب کا خیال تھا کہ اس کا ایک راستہ یہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ مجھے ساری باتیں بتا دیں گے جو میں ان سے پوچھوں گا لیکن میں انہیں اپنی سٹوری میں ان کا نام لیے بغیر اپنی طرف سے لکھوں گا۔ میں اس بات پر بھی تیار ہو گیا۔ تاہم ابھی بھی میاں صاحب کے ذہن میں کوئی بات اٹک رہی تھی اور وہ کوئی بھی رسک لینے کو تیار نہیں تھے۔ آخر جمعہ کی نماز کے بعد یہ بات طے ہوئی کہ میں [illegible] انٹرویو لکھوں گا اور لکھ کر چوہدری نثار علی خان کو دکھاؤں گا۔ [illegible] کریں گے کہ وہ اس انٹرویو میں کیا کچھ شائع کرنے کی اجازت دیں [illegible]۔

میں اس بات پر تیار ہو گیا کیونکہ میرے خیال میں نواز شریف سے [illegible]

لیڈروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جب ان سب نے ایک زبان میں یہ کہا کہ 1947ء سے لے کر اب تک بھارت کی سب سے بڑی کامیابی جمہوریت تھی۔

کسی ایک بھی بھارتی وزیر اعظم نے یہ نہیں کہا کہ بھارتی ٹیکنالوجی یا اس کی فوجی طاقت ان پچاس برسوں میں ان کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔

نواز نے کہا کہ واجپائی کی اس کال کوٹھری میں بیٹھ کر انھوں نے اس گفتگو سے ایک ہی نتیجہ نکالا کہ قوموں کی ترقی میں جمہوریت سب سے اہم چیز ہوتی ہے۔ جمہوریت کے بعد ہی کسی بھی ملک اور قوم کو دیگر کامیابیاں ملتی ہیں۔ نواز شریف نے کہا کہ جب انھوں نے سابق بھارتی وزرائے اعظم کے منہ سے یہ سنا کہ ان پچاس برسوں میں جمہوریت ان کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ انھوں نے اچانک اپنے آپ کو شدید شرمندہ محسوس کیا کہ ہم بھلا، چین کی طرح پی ٹی وی پر بیٹھ کر پوری دنیا کے سامنے یہ دعویٰ کیسے کر سکتے تھے جو ان چھ سابق بھارتی وزرائے اعظم نے کیا تھا۔

میں اب بات کو اصل موضوع کی طرف لانا چاہ رہا تھا۔ یہ ادھر ادھر کی باتیں صرف اس لیے کی تھیں کہ نواز شریف میرے ساتھ اپنے آپ کو پرسکون محسوس کریں اور مجھ سے کھل کر بات کریں۔

مجھے پتا تھا کہ نواز شریف دو دفعہ وزیر اعظم ہونے کی حیثیت سے بہت سارے اہم فیصلے کرنے والے تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ وہ تھا جو 1993ء میں سپریم کورٹ سے اپنی حکومت بحال ہونے کے باوجود بھی انھوں نے استعفیٰ دے دیا تھا یا ان سے لے لیا گیا تھا۔ اب تک میں یہ سنا گیا تھا کہ اس وقت کے آرمی چیف جنرل وحید کاکڑ نے انھیں دھمکیاں دے کر ان سے استعفیٰ لیا تھا۔

جب میں نے نواز شریف سے یہ سوال پوچھا تو انھوں نے مجھے ایک اور کہانی سنائی۔ نواز شریف اور غلام اسحاق خان کے درمیان حکومت بحال ہونے کے بعد بھی اختلافات کم ہونے کے بجائے بڑھتے گئے تو انھوں نے جنرل کاکڑ کو فون کیا کہ وہ استعفیٰ دینا چاہ رہے ہیں کیونکہ ان کے لیے غلام اسحاق خان جیسے صدر کے ساتھ مل کر حکومت چلانا مشکل ہو گیا ہے۔ جب جنرل کاکڑ نے نواز شریف کے منہ سے یہ بات سنی تو ایک لمحے کے لیے وہ ششدر رہ گئے اور بڑی حیرانی سے نواز شریف سے پوچھا کہ آپ کیوں استعفیٰ دیں گے۔ تاہم جب جنرل کاکڑ نے نواز شریف کو اپنی بات پر ڈٹے ہوئے دیکھا [illegible] کہ آپ کو اس ملک کے آئندہ وزیر اعظم ہیں اور ہر ایسے اقدام سے گریز کریں گے

بھی نواز شریف نے یہ تجویز قبول نہیں کی۔ اس کے جواب میں انھوں نے جنرل کاکڑ کے سامنے ایک اور شرط رکھی کہ جنرل صاحب اگر میں استعفیٰ دے کر گھر جا رہا ہوں تو پھر وہ شخص جس کی وجہ سے مجھے استعفیٰ دینا پڑ رہا ہے، اسے بھی میرے ساتھ ہی گھر جانا چاہیے۔

جنرل کاکڑ نے غلام اسحاق خان کے بارے میں لفظ استعمال کیا کہ وزیر اعظم صاحب آپ فکر نہ کریں۔ غلام اسحاق خان کو بھی گھر جانا ہو گا اور اگر انھوں نے مزاحمت کی تو میں انھیں زبردستی گھر لے جاؤں گا۔

نواز شریف کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ ایک فوجی جرنیل ایک سویلین صدر غلام اسحاق خان کے بارے میں اس طرح کی سخت گفتگو کرے چاہے وہ اس وقت ان کا سب سے بڑا سیاسی دشمن ہی کیوں نہ تھا۔ نواز کے خیال میں کسی کو بھی لوگوں کے ووٹوں سے منتخب کیے گئے صدر کی بے عزتی کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ نواز کے خیال میں یہ فوجی لوگ دراصل سویلین لیڈروں سے نفرت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی بڑی عزت کرتے ہیں چاہے ان کا تعلق کسی بھی ادارے سے ہو۔

دوسری دفعہ وزیر اعظم بننے کے بعد نواز شریف نے ایک اہم فیصلہ کیا جو جنرل جہانگیر کرامت سے استعفیٰ لینے کا تھا۔

میرے اصرار پر نواز شریف نے ایک اور کہانی سنائی۔

اب نواز شریف کو یہ پتا چلا کہ آرمی چیف نے نیشنل سکیورٹی کونسل بنانے کا آئیڈیا ان کی حکومت کو دیا تھا تو انھیں شدید غصہ آیا۔ ان کے خیال میں جنرل جہانگیر کرامت نے ایک آرمی چیف ہونے کے ناتے سے اپنی حدود اور اختیارات سے تجاوز کیا تھا اور اب وہ اس قابل نہیں تھے کہ یہ حکومت ان پر بھروسہ کر سکتی۔ یہ جنرل جہانگیر کرامت کا اختیار نہیں تھا کہ وہ اس طرح کی بات کرتے۔ نواز شریف کو محسوس ہوا کہ جنرل جہانگیر کرامت نے ایک بیان دے کر ان کی وزیر اعظم کی حیثیت سے ساری [illegible] ختم کر دی تھی۔ اب نواز شریف کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ ایک سویلین حکومت کے چیف ہونے کے ناتے اپنی اتھارٹی کو منوائیں اور اس کے لیے [illegible] کے لیے یہ ضروری تھی کہ وہ استعفیٰ دے دیں۔ نواز شریف نے بتایا کہ وہ جنرل جہانگیر کرامت کو [illegible] نہیں ہوئے کہ انھوں نے ایک لفظ کہے بغیر ان کی بات مان لی (14)

بچ سکے۔

جنرل جہانگیر کرامت کو پرائم منسٹر ہاؤس بلایا گیا اور نواز شریف نے انھیں [illegible] میں بتایا کہ پاکستان کے وزیر اعظم ہونے کے ناطے ان کے لیے یہ بات قابل قبول نہیں تھی کہ ان کا آرمی چیف اس طرح کے سیاسی بیانات دے۔

جب جنرل جہانگیر کرامت نے نواز شریف کو اس موڈ میں دیکھا تو اچانک انھیں احساس ہوا کہ واقعی انھوں نے ایک سیاسی بیان دے کر ایک شدید غلطی کی تھی۔ چنانچہ نواز شریف نے [illegible] جنرل صاحب سے کہا کہ بہتر ہوگا کہ آپ شام تک اپنا استعفیٰ بھیج دیں۔

نواز شریف اس وقت حیران رہ گئے جب آگے سے جنرل جہانگیر کرامت نے بغیر بحث [illegible] کہا کہ وہ شام تک اپنا استعفیٰ ان کے حوالے کر دیں گے۔

جہانگیر کرامت اپنی بات کے پکے نکلے اور شام کو ڈی جی آئی ایس آئی [illegible] ان کا استعفیٰ لے کر نواز شریف کو دے آئے۔

یہ ساری کہانی سننے کے بعد میں نے نواز شریف سے کہا کہ تو پھر آپ نے یہ طریقہ جنرل مشرف کے ساتھ کیوں نہیں اپنایا۔ جہانگیر کرامت کی طرح آپ انھیں بھی اپنے دفتر بلاتے اور انھیں [illegible] کے [illegible] ان سے استعفیٰ طلب کر لیتے۔ انھیں اس طرح [illegible] کرنے کے لیے [illegible] ضرورت تھی۔

نواز شریف نے میری طرف غور سے دیکھا۔ وہ تھوڑی دیر چپ رہے۔ وہ شاید مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں کر رہے تھے کہ میں شاید جنرل جہانگیر کرامت اور جنرل مشرف کی صورتحال کا [illegible] سوال پوچھوں گا۔

[illegible]

تاہم مجھے نواز شریف نے اس [illegible] جواب [illegible] انھوں نے جنرل مشرف کو [illegible] کرنے کا [illegible] میں کیا تھا [illegible] ان کے پاس [illegible] کوئی [illegible] نہیں تھی۔ یہی وجہ

تھی کہ جنرل مشرف کے کیس میں وہ نتیجہ حاصل نہیں کر سکے جو انھوں نے جنرل جہانگیر کرامت کے سلسلے میں حاصل کیا تھا۔

میرے ذہن میں اچانک جنرل علی قلی خان سے لیے گئے انٹرویو میں پوچھی گئی ایک بات یاد آ گئی جس کے جواب میں علی قلی نے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ جنرل مشرف جہانگیر کرامت کی جگہ آرمی چیف بننے کے لیے نواز شریف سے خفیہ ملاقاتیں کرتے رہے تھے۔ علی قلی خان نے یہ بھی [illegible] نواز شریف کے پرنسپل سیکرٹری نے انھیں یہ کہا تھا کہ اگر وہ آرمی چیف بننا چاہتے تھے تو [illegible] وزیر اعظم سے خفیہ ملاقات کر لیں۔ تاہم جنرل علی قلی خان نے [illegible] نواز شریف سے ملنے سے انکار کر دیا تھا اور یوں وہ آرمی چیف نہیں بن سکے۔

نواز شریف نے ان تمام باتوں سے انکار کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ کبھی جنرل مشرف سے خفیہ طور پر نہیں ملے تھے۔ تاہم انھوں نے کہا کہ جنرل مشرف کو آرمی چیف بنانے کے پیچھے [illegible] وجوہات تھیں۔ جنرل علی قلی خان کو اس لیے آرمی چیف نہیں بنایا تھا کہ ان کے بارے میں [illegible] کی تھی کہ جب ان تک جنرل جہانگیر کرامت کے استعفیٰ کی بات پہنچی تو انھوں نے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کے ان جرنیلوں کا نہیں تھا جنہوں نے کارگل کی پہاڑیوں پر یہ سارا کھیل کھیلا تھا جس میں اب تک بے شمار جوان پاکستانی فوجی بے گور و کفن مارے گئے تھے۔ یہ دراصل اس ملک کی فوج کی عزت اور اس کا مستقبل تھا جسے اس وقت بچانا ضروری تھا۔

یوں اپنی فوج کی عزت بچانے کے نام پر نواز شریف نے فوری طور پر 4 جولائی 1999ء کو امریکہ جانے کا فیصلہ کیا۔ جنرل مشرف انہیں اسلام آباد ایئرپورٹ پر خدا حافظ کہنے کے لیے آئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ امریکہ میں ہوا وہ سب کے سامنے تھا۔ واجپائی کو بڑی مشکل سے بل کلنٹن نے سیز فائر پر راضی کیا۔

اب اس ایک گروہ میں جب نواز شریف کو یہ اطلاعات ملنا شروع ہوئیں کہ جنرل مشرف اور ان کے جرنیل اپنی سرکاری اور نجی محفلوں میں کارگل جنگ کا ذمہ دار انہیں ٹھہرا رہے تھے اور یہ دعوے کیے جا رہے تھے کہ وہ اگر امریکہ جا کر سیز فائر نہ کراتے تو شاید ہماری فوج بھارتی کشمیر پر قبضہ کر لیتی تو انہیں شدید غصہ آیا۔

نواز شریف اب مزید ان وردی والوں کی دھوکہ بازی اور چالوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے بغیر نتائج کی پرواہ کیے جنرل مشرف کو ڈس مس کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ جنرل مشرف نے انہیں دھوکہ دیا تھا۔

میں نے نواز شریف صاحب سے پوچھا کہ پھر بھی انہوں نے جنرل مشرف کو ڈس مس کرنے سے پہلے اس وقت وزیراعظم ہاؤس میں موجود اپنے بھائی شہباز شریف اور چوہدری نثار علی خان سے مشورہ کیوں نہیں کیا تھا تو نواز شریف نے میری طرف دیکھ کر بڑے پختہ لہجے میں کہا کہ جناب اس وقت شہباز یا نثار سے مشورہ کرنے کا وقت گزر گیا تھا۔ اب کچھ کر گزرنے کا وقت آ گیا تھا اور انہوں نے وہ کچھ کیا جو ان کے خیال میں اس وقت کرنا چاہیے تھا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ اگر انہوں نے شہباز اور نثار سے بات کی تو شاید وہ انہیں روکنے کی کوشش کریں اور اس دفعہ انہوں نے رکنا نہیں تھا کیونکہ وہ فیصلہ کر چکے تھے۔

میں نے نواز شریف سے کہا کہ آپ پر یہ الزام لگتا ہے کہ آپ کسی کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ جو بھی صدر آئے یا آرمی چیف وہ آپ کی اس سے ضرور لڑائی ہوتی ہے۔

میری بات سن کر وہ بولے کہ آپ بالکل درست بات کر رہے ہیں۔ وہ پاکستان کے واحد لیڈر ہیں جنہوں نے ہمیشہ ان آرمی چیفس کے ساتھ ٹکر لی جو اپنے قانونی اور آئینی دائرے میں رہنے کے بجائے اس ملک کے حکمران بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا مقصد آرمی چیفس کو سویلین حکومت کے ماتحت لانا تھا۔ آرمی کا کام سرحدوں کی حفاظت کرنا تھا نہ کہ ملک پر حکمرانی کرنا۔

نواز شریف کے منہ سے فوجی جرنیلوں اور آرمی چیفس کے خلاف سخت گفتگو سن کر میں نے کہا کہ سر! آپ تو خود بھی ایک آرمی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء کی پیداوار تھے۔ میری بات کا برا منائے بغیر نواز شریف نے کہا کہ آپ کی بات درست ہے، لیکن اس کے پیچھے دو وجوہات ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ نواز شریف اس بات پر معذرت خواہ نہیں تھے کہ آج اب وہ جمہوریت کے چیمپئن بنے ہوئے تھے اور پاکستان کے آرمی جرنیلوں کے سیاسی کردار کو شدید تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے تو ماضی میں وہ خود بھی جنرل ضیاء کی وجہ سے سیاست میں آئے اور وہیں سے ان کا عروج شروع ہوا۔

تاہم، نواز شریف نے مجھے اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لیے دو وجوہات بتائیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ پاکستان پر زیادہ عرصہ فوجی جرنیلوں نے حکومت کی تھی۔ جتنے بھی لوگ سیاست میں آئے اس وقت ملک پر مارشل لا تھا۔ وہ کوئی اکیلے لیڈر نہیں تھے جو مارشل لا دور میں سیاست میں آئے۔ اگر ملک پر فوجی حکومت نہ ہوتی تو یقیناً سیاستدان بغیر فوجی حکمرانوں کی مدد کے سیاست میں آتے۔

نواز شریف نے کہا کہ آپ کم از کم مجھے اس بات کا کریڈٹ تو دیں کہ انہوں نے طاقتور جرنیلوں پر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ وزیراعظم ہونے کی حیثیت سے ان کی کسی بھی غیر قانونی حرکت کو برداشت نہیں کریں گے۔ وہ واحد وزیراعظم تھے جنہوں نے سویلین حکومت کی رٹ قائم کرنے کے لیے ان سے جو کچھ ہو سکا انہوں نے کیا۔

نواز شریف کا خیال تھا کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انہیں اس بات میں کامیابی ہوئی یا نہیں لیکن کم از کم انہوں نے یہ بات تو ثابت کی کہ وہ کسی آرمی جنرل کی سیاسی معاملات میں مداخلت برداشت نہیں کریں گے کیونکہ یہ قانون اور آئین کی خلاف ورزی تھی۔

میں نے نواز شریف صاحب سے پوچھا کہ جنرل مشرف اکثر یہ کہتے تھے کہ اگر نواز شریف

[illegible]

[illegible]

نواز شریف نے [illegible]

[illegible] ہو گیا ہے۔

نواز شریف کے منہ سے یہ بات سن کر مجھے یوں لگا کہ شاید میں کسی ایک پولیٹیکل [illegible] سے [illegible] گفتگو کر رہا تھا۔

نواز شریف نے اپنی بات جاری رکھی اور بولے کہ میں نے جو کچھ کیا وہ بہت سوچ سمجھ کر کیا [illegible] ان کے پاس ایک ایسے آرمی چیف کو اس [illegible] کرنے کا [illegible] وزیراعظم کے خلاف فوج میں پروپیگنڈہ کر رہا تھا۔

نواز شریف کے لیے اہم بات یہ تھی کہ انہوں نے جو کچھ مشرف کے ساتھ کیا اس کی اجازت [illegible] اگر وہ ایک آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت کو فارغ کر سکتے تھے تو [illegible] کو بھی کر سکتے تھے اگر ان کے پاس اس کے لیے مناسب وجوہات تھیں۔

نواز شریف نے الٹا مجھ سے پوچھا کہ میں اپنے اس فیصلے پر کیوں پچھتاؤں جو [illegible] کیا تھا۔

میں نے نواز شریف سے پوچھا کہ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو جنرل مشرف کی جیل سے رہائی کے [illegible] پہنچے۔

نواز شریف نے مجھے ایک کہانی سنائی۔

جب انہیں وزیراعظم ہاؤس سے ہتھکڑیاں لگا کر لانڈھی جیل کراچی لے جایا گیا تو وہاں کال کوٹھڑی میں بیٹھے انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ کتنے طاقتور لوگ ان کی زندگی بچانے کے لیے کوششیں کر

[illegible]

نواز شریف اس بات پر [illegible] جنرل مشرف [illegible]

میں نے کہا کہ میاں صاحب! آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں [illegible] 2000 [illegible] اسمبلی میں بیٹھے والے سیاسی [illegible] پاکستان میں [illegible] جنرل مشرف کے لیے [illegible]

نواز شریف صاحب نے کہا، ہاں ممکن تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ان کے [illegible] میں اکیلے [illegible] پیپلز پارٹی اور پی ایم ایل نواز [illegible] جنرل مشرف کو اقتدار [illegible] دوسری طرف یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ سیاسی قوتیں [illegible] جنرل مشرف کو اقتدار سے باہر نکال پاتیں۔

میں نے یہ محسوس کیا کہ نواز شریف کو اس بات کا [illegible] پاکستان [illegible]

نواز شریف صاحب نے خود ہی بات کا رخ بدلا اور مجھے بتانے لگے کہ [illegible] پاکستان کی فوجی حکومت نے ان کے والد صاحب کی وفات کے بعد ان کے خاندان کے ساتھ [illegible] کی کوشش کی تھی اس سے انہیں خاص تکلیف ہوئی تھی۔ وہ شہباز اور خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنے باپ کی میت کے ساتھ پاکستان جانا چاہتے تھے۔ اس وقت سعودی عرب میں پاکستان کے [illegible] کے سابق چیف [illegible] مرزا تھے جنہیں نواز شریف نے اپنے [illegible] اس عہدے پر تعینات کیا تھا۔ مرزا صاحب ان سے ملنے کے لیے وہاں آئے اور انہوں نے نواز شریف کے سامنے چند شرائط رکھیں جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ نواز شریف، شہباز شریف اور کلثوم نواز اپنے والد کی میت کے ساتھ پاکستان نہیں جائیں گے۔

نواز شریف نے [illegible] کے ساتھ [illegible] کر دیا۔

چند دنوں بعد جنرل مشرف نے نواز شریف کو [illegible] اور اس بات پر [illegible] کہ نواز شریف صاحب کی بیعت کے ساتھ پاکستان کیوں نہیں آ سکے تھے۔

مشرف کے منہ سے یہ بات سن کر نواز شریف بہت پریشان ہوئے اور انہیں بتایا کہ جب آپ کا [illegible] سعودی سفیر ہی انہیں یہ منع کر گیا تھا کہ وہ پاکستان نہیں جا سکتے اور اب آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ میں پاکستان کیوں نہیں آیا۔

جنرل مشرف نے نواز کی یہ بات سن کر اس طرح جواب دینے کی کوشش کی جیسے پاکستانی سفیر نے انہیں غلط پیغام دیا تھا اور وہ اس کے خلاف شدید ایکشن لیں گے کہ اس نے کیوں غلط پیغام ان تک پہنچایا تھا۔ جنرل مشرف کے بقول وہ دونوں بھائیوں کو پاکستان آنے کی اجازت دینے پر رضامند تھے۔

نواز شریف نے الٹا مجھ سے پوچھا کہ آپ ہی مجھے بتائیں کہ آخر ایک سفیر کیونکر ملک کے صدر اور آرمی چیف کا غلط پیغام ان تک پہنچائے گا اور سب سے بڑھ کر جنرل مشرف کے اس فون کے بعد بھی اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

میں نے نواز شریف صاحب سے پوچھا کہ ان کی کب تک پاکستان واپسی ممکن ہو سکے گی۔ انہوں نے مجھے ایک سیاسی فلاسفر کے سے انداز میں جواب دیا کہ [illegible] صاحب اور [illegible] چلا جائے۔

اپنی اس بات کی وضاحت کرنے کے لیے انہوں نے مجھے بتایا کہ دراصل جب [illegible] 2000ء میں انہیں [illegible]

[illegible]

[illegible] ہے جیسے جنرل [illegible] پارٹی [illegible] کی پارٹی کو [illegible] اب انہیں [illegible] ہے جب وہ پاکستان واپس جائیں گے اور وہاں اپنی پارٹی کی قیادت کریں گے [illegible] انہیں یقین ہے کہ وہ اپنی پارٹی سے [illegible] جنرل مشرف کے ساتھ [illegible] ایک لیڈر ان کی پارٹی میں ہیں۔ نواز کا خیال تھا کہ وہ ابھی بھی ان سیاستدانوں کو اپنی پارٹی میں واپس لینے کے لیے تیار ہیں جو ہو سکتا ہے جنرل مشرف کے دور میں ان کے ساتھ نہیں رہے لیکن انہوں نے عملی طور پر ان کے خلاف کوئی بیان بازی نہیں کی۔ تاہم نواز شریف نے انتہائی سخت لہجے میں مجھے بتایا کہ ان سیاستدانوں کے لیے ان کی پارٹی میں کوئی جگہ نہیں ہے جنہوں نے ان کی حکومت میں بھی مزے اڑائے اور جنرل مشرف کے اقتدار میں آتے ہی موقع ملتے ہی پہلی فرصت میں ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ ایسے موقع پرست سیاسی لیڈروں کے لیے ان کی پارٹی میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ جنرل مشرف ان کے چھوٹے بھائی شہباز شریف کو بہکانے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں اس بات کا یقین ہے کہ شہباز شریف کبھی بھی اس طرح کی سازشوں کا شکار نہیں ہوں گے۔

رات خاصی ہو چکی تھی۔ انٹرویو تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ جب وہ کمرہ [illegible] چھوڑنے سے پہلے نواز شریف نے مجھے آخری بات کی کہ مجھے یہ بات یاد رکھنا کہ میں کسی وقت بھی پاکستان واپس جا سکتا ہوں۔

000

نواز شریف سے [illegible] 2006ء [illegible]

نواز شریف سے [illegible]

میاں صاحب کے ہاں بھرپور اور شاندار کھانے پینے کا دور ہوتا تھا۔ میاں صاحب کے شیدائی دور دراز کے علاقوں سے ہر قسم کی خوراک لے کر آتے تھے۔ عالموں سے لے کر سیاستدانوں اور عام لوگوں تک سب پیٹ بھر کر کھاتے۔ میاں صاحب اکثر اپنے مہمانوں کی پلیٹوں میں کھانا ڈالتے ہوئے بار بار دیکھے جاتے۔

بینظیر اور جنرل مشرف کے درمیان ہونے والی ڈیل کی باتوں نے اگرچہ نواز شریف کیمپ کو خاصا پریشان کیا ہوا تھا تاہم بیشتر سیاستدانوں کی طرح وہ بھی یہ بات سمجھتے تھے کہ بینظیر بھٹو کا ڈیل کر کے پاکستان چلے جانا ہی ان کے سیاسی فائدے میں تھا۔ اگر کل کلاں بینظیر بھٹو اقتدار میں آ گئیں تو یقیناً وہ طالبان کے بجائے نواز شریف کو اپنا اپوزیشن لیڈر دیکھنا زیادہ پسند کریں گی۔ نواز شریف کیمپ کو یہ بھی لگتا تھا کہ پی پی پی کو جنرل مشرف کے ساتھ ہونے والی ڈیل کا زیادہ فائدہ نہیں ہوگا۔ بدنامی بینظیر بھٹو کے حصے میں آئے گی جبکہ وہ بڑے مزے سے لوگوں کو بتائیں گے کہ انہوں نے ڈکٹیٹر سے ڈیل نہیں کی تھی۔ حالانکہ یہ بات بڑے سامنے کی تھی کہ جنرل مشرف اور نواز شریف میں ڈیل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ دونوں نے 12 اکتوبر کو ایک دوسرے کو ڈس کیا تھا۔ اب نواز شریف اور جنرل مشرف کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ایک ساتھ مل بیٹھتے۔ بینظیر بھٹو اور جنرل مشرف میں بہت ساری چیزیں کامن تھیں۔ سب سے بڑھ کر ان دونوں کے درمیان 12 اکتوبر کی طرح کے ماضی کی کوئی زنجیر ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں تھی۔

نواز شریف کیمپ کو اس بات کا یقین تھا کہ ایک دفعہ بینظیر بھٹو پاکستان چلی گئیں تو پھر انہیں روکنا آسان نہیں ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بینظیر سے اپنے سیاسی تعلقات چارٹر آف ڈیموکریسی کی خلاف ورزی کرنے کے باوجود ختم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ بینظیر بھٹو کی ڈیل میں ہی انہیں اپنی سیاسی زندگی نظر آتی تھی۔

نواز شریف اس دن بڑے خوش تھے جب 7 جولائی 2007ء کو لندن میں آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ وہ شخص جو جدہ میں مجھ سے براہ راست جنرل مشرف کے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈر رہا تھا آج پاکستان سے آئے ہوئے امین فہیم، مولانا فضل الرحمن، عمران خان، محمود خان اچکزئی اور دیگر بڑے سیاستدانوں کے سامنے جس طرح جنرل مشرف کو للکار رہا تھا، یہ دیکھ کر مجھے شدید حیرانی ہو رہی تھی۔ جس انداز میں نواز شریف تقریر کر رہے تھے اس سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ انداز وہ کہیں نہ کہیں سے سیکھ کر آئے تھے۔ گزرے برسوں میں ان میں اور کوئی تبدیلی آئی ہو یا نہیں، تاہم وہ ایک اچھے مقرر ضرور بن گئے تھے۔

اس بات پر لندن میں شرطیں لگی ہوئی تھیں کہ بینظیر بھٹو اے پی سی میں شریک ہوں گی یا نہیں۔ سننے میں آ رہا تھا کہ جنرل مشرف نے بینظیر بھٹو سے مذاکرات کامیاب کرنے کے لیے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ نواز شریف کے اس سیاسی شو میں نہیں جائیں گی۔ دوسری طرف نواز شریف کیمپ کا یہ خیال تھا کہ وہ ضرور آئیں گی تاکہ جنرل مشرف پر دباؤ ڈال کر ان سے بہتر ڈیل کی جا سکے۔

نواز شریف اور بینظیر بھٹو دونوں ایک دوسرے کو جنرل مشرف کے مارشل لاء کے بعد استعمال کرتے آئے تھے۔ 10 دسمبر 2000ء کو نواز شریف نے بینظیر کا سیاسی پرچم استعمال کر کے جنرل مشرف سے ڈیل کر لی تھی۔ جدہ روانگی سے آٹھ دن پہلے ہی نواز شریف نے بینظیر بھٹو کی پارٹی کے ساتھ اے آر ڈی بنائی تھی۔ بینظیر بھٹو اب وہی کچھ کرنے جا رہی تھیں۔ وہ نواز شریف کے ساتھ اپنے سیاسی اتحاد کا پرچم جنرل مشرف پر ڈال کر ان سے بہتر شرائط پر پاکستان واپس جا رہی تھیں۔ نواز شریف بھی شاید اس بات پر چپ تھے کہ چلیں اس بہانے دونوں کا مشترکہ ایجنڈا ہو رہا تھا۔ اگر کبھی انہوں نے جنرل مشرف کی قید سے رہائی پانے کے لیے بینظیر بھٹو کے سیاسی پرچم کو استعمال کیا تھا تو آج بینظیر بھٹو بھی ان کا سیاسی دباؤ استعمال کر کے پاکستان واپس جا رہی تھیں۔ یوں دونوں سیاستدانوں کو ایک دوسرے سے کوئی گلہ نہیں تھا۔

اے پی سی کی کامیابی سے نواز شریف میں ایک نیا اعتماد آیا۔ ان کے اردگرد بیٹھے دوستوں نے انہیں یہ یقین دلانا شروع کر دیا کہ اب جنرل مشرف کے لیے انہیں پاکستان آنے سے روکنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ اسی اثناء میں یہ باتیں پھیلنا شروع ہو گئیں کہ بینظیر بھٹو بہت جلد انتخابات سے پہلے پاکستان واپس چلی جائیں گی۔ اس سے نواز شریف کیمپ پر اور پریشر بڑھا اور انہیں یہ احساس ہوا کہ اگر ان کے ہاتھ سے یہ موقع نکل گیا تو پھر کیا پتہ بینظیر بھٹو جنرل مشرف کے ساتھ مل کر نواز شریف کا راستہ ہموار کرنے کی بجائے ان کا راستہ روکنے پر تیار ہو جائیں اور الیکشن جیتنے کے بعد ہی نواز شریف کو واپس آنے دیا جائے۔ اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ نواز شریف کو یہ یقین دلایا جانے لگا کہ پاکستان

اب انقلاب کے لیے تیار ہے۔ وہ آیت اللہ خمینی کی طرح اسلام آباد کے ایئرپورٹ پر اتر کر چند گھنٹوں میں جنرل مشرف کا تختہ الٹ دیں گے۔ لندن میں پی ایم ایل نواز کے جس لیڈر سے بھی بات ہوتی وہ نواز شریف کے پاکستان واپس آنے کو آیت اللہ خمینی کے فرانس سے تہران واپسی کے ساتھ موازنہ کرتا۔

20 جولائی 2007ء کے سپریم کورٹ کے فیصلے نے نواز شریف کو حوصلہ دیا اور پختہ کیا کہ وہ واپس جائیں۔ اب جنرل مشرف دھیرے دھیرے ختم ہو رہے تھے۔ سپریم کورٹ نے چیف جسٹس افتخار چوہدری کو بحال کر دیا تھا۔ پاکستان بدل گیا تھا۔ اب سب سے اچھا موقع تھا کہ اس وقت پاکستان جایا جائے جب چیف جسٹس بحال ہو چکے تھے اور فیصلہ بھی دے چکے تھے کہ نواز شریف اور شہباز شریف کو پاکستان کا شہری ہونے کے ناطے وطن واپسی کا پورا حق تھا۔ یوں سپریم کورٹ نے وہ ڈیل سکریپ کر دی تھی جو بقول نواز شریف کے جنرل مشرف اور سعودی بادشاہ کے درمیان ہوئی تھی۔

ایک دن مجھے لندن میں نواز شریف کے ترجمان نادر چوہدری کا فون آیا کہ میاں صاحب اپنی پارٹی کے لیڈروں کے ساتھ میٹنگ کے بعد ڈورچیسٹر ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کریں گے۔ توقع یہی کی جا رہی تھی کہ وہ اپنی پاکستان روانگی کے پروگرام کا اعلان کریں گے۔

آخر وہ وقت آن پہنچا تھا کہ نواز شریف اپنی جلاوطنی ختم کرنے کے بعد اپنے ان نامزد کردہ آرمی چیف سے ٹکر لینے کو تیار ہو جائیں۔

ڈورچیسٹر ہوٹل میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ پاکستان سے متعدد صحافی وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ عالمی میڈیا بھی اس میں پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ مجھے اس ہال میں کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔ مشہور کالم نگار عرفان صدیقی صاحب ایک کونے میں کھڑے تھے۔ انہوں نے کمال شفقت سے مجھے اپنی طرف بلا لیا اور وہیں کھڑے ہوئے تھوڑی سی جگہ دی۔ تمام کیمرے اور نگاہیں نواز شریف پر مرکوز تھیں کہ وہ کب پاکستان واپسی کی تاریخ کا اعلان کریں گے۔ پہلے انہوں نے ایک بیان انگریزی میں پڑھا اور پھر انہوں نے اردو میں گفتگو شروع کی۔ نواز شریف نے [illegible] کہ وہ [illegible] کے بعد 10 ستمبر کو اسلام آباد [illegible] ایئرپورٹ پر اتریں گے۔ [illegible] ختم کرنے سے پہلے نواز شریف نے جو تقریر [illegible] اپنے [illegible] کھڑے عرفان صدیقی صاحب سے کہا کہ [illegible]

دیا میں تو ایک بات کہوں۔ ہمیشہ بڑی محبت اور پیار سے گفتگو کرنے والے عرفان صدیقی صاحب نے فرمایا کہ بالکل ضرور۔

میں نے کہا کہ صدیقی صاحب! میں اس بات پر شرط لگانے کو تیار ہوں کہ میاں صاحب جو تقریر اس وقت اردو میں کر رہے ہیں وہ آپ نے لکھی ہے۔ آپ سے بہتر اتنی اچھی اردو اور سیاسی تقریر شاید یہاں پر موجود اور کسی سیاستدان، صحافی یا کالم نگار کے بس کی بات نہیں ہے۔ عرفان صدیقی مسکرائے اور بولے کہ اگر آپ نے پہچان ہی لیا ہے تو میں مان لیتا ہوں کہ یہ تقریر میں نے لکھی ہے۔

میاں نواز شریف کے 10 ستمبر کی تاریخ دینے کے ساتھ ہی لندن اور اسلام آباد میں ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔ اسلام آباد کے حکمرانوں نے فوراً اس پر ردعمل کا اظہار کیا کہ نواز شریف کو کسی صورت پاکستان واپس نہیں آنے دیا جائے گا۔ وہ باقاعدہ ایک ڈیل کے ذریعے دس سال کے لیے پاکستان سے باہر گئے تھے اور مقررہ مدت سے پہلے انہیں واپس نہیں آنے دیا جائے گا۔ لندن کے ملاقات میں جنرل مشرف کے قریبی ساتھی بریگیڈیئر نیاز اور شہباز شریف کے درمیان ملاقاتوں کی خبریں آنے لگیں۔ سعودی اور لبنانی پیغام رساں نواز شریف سے ملنے لگے لیکن لگتا تھا جس طرح نواز شریف نے واپس جانے کا فیصلہ کیا تھا اس پر انہیں سعودی حکومت کی حمایت حاصل تھی۔ نواز شریف نے بھی ایک دن یہی بات ہم صحافیوں کو بتائی کہ ان پر سعودی حکومت کا کوئی دباؤ نہیں ہے کیونکہ انہوں نے جنرل مشرف سے براہ راست کوئی ڈیل نہیں کی تھی۔

لندن آئے ہوئے تمام سیاسی لیڈروں کو واپس پاکستان بھیج دیا گیا کہ وہ جائیں اور نواز شریف کے استقبال کی تیاریاں کریں۔ صحافیوں کی فہرستیں بننا شروع ہو گئیں کہ پاکستان سے کون اور کہاں سے آئے گا۔ لندن سے میاں صاحب کے ساتھ کون کون سے صحافی جائیں گے۔ اپنے پروگرام کو خفیہ رکھنے کے لیے تین مختلف ایئرلائنز پر سیٹوں کی بکنگ کرا دی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نواز شریف کے ساتھ دو لوگ محمد عمران اور محمد افضال اس کام میں زبردست تھے۔ انہوں نے آخری لمحے تک اس بات کی ہوا کسی کو نہیں لگنے دی کہ انہوں نے کون سی ایئرلائن پر کس کس کی بکنگ کرا رکھی ہے [illegible] عمران اور افضال نے نواز شریف کے [illegible] آخری لمحے تک [illegible] ایئرلائن سے جائیں گے۔

[illegible]

باتھ سے چلے گئے۔

سعودی پرنس کی اسلام آباد آمد نے نواز شریف کیمپ میں ایک ہلچل پیدا کر دی [illegible] ہم صحافیوں کو [illegible] نواز شریف اور شہباز شریف کے [illegible] پریشانی [illegible] بات کرنے کی کوشش کی [illegible] پرویز رشید بھی زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ نواز شریف بڑی دیر تک ایک کمرے میں بند ہو کر شہباز شریف، پرویز رشید اور پارٹی کے دیگر اہم لوگوں کے ساتھ بڑی دیر تک مشورہ کرنے میں مصروف رہے اور ہم صحافی باہر دفتر میں چائے، بسکٹ اور سینڈوچ کھاتے رہے۔ خاصی دیر بعد نواز شریف کمرے سے باہر نکلے۔ ان کا چہرہ ایک دفعہ پھر سنجیدگی میں ڈوبا ہوا تھا جس سے لگتا تھا کہ وہ کوئی ایسا اہم فیصلہ کر کے نکلے تھے جس پر انہیں ابھی بھی کچھ شکوک تھے۔

اس دفتر میں ہلکی پھلکی سنجیدگی نے ہم صحافیوں کو بھی مسکرانا بھلا دیا تھا۔ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کل 10 ستمبر کو میاں صاحب نے پاکستان روانہ ہونا تھا اور آج 9 ستمبر کو وہ ایمرجنسی میں پریس کانفرنس بلا کر بات چیت کرنا چاہ رہے تھے۔

کیا نواز شریف سعودی شہزادے کے پاکستان آنے کے بعد اپنا پروگرام تبدیل کرنے والے تھے۔

یہ سوال ہم سب صحافیوں کے ذہنوں میں موجود تھا۔ اکثریت کا خیال یہی تھا کہ نواز شریف اب پاکستان واپس نہیں جائیں گے۔ شہباز شریف بھی ان کے ساتھ پاکستان واپس جا رہے تھے۔ کیا دونوں بھائی یہ افورڈ کر سکتے تھے کہ وہ ایک دفعہ پھر گرفتار کر کے جدہ لے جائے جائیں جہاں سے بڑی مشکل

[illegible]

[illegible] کی پارٹی میں شامل ہو گئے۔

ہم سب کا خیال تھا کہ نواز شریف [illegible] شہباز شریف Do or die کی سیاست کے لیے [illegible] انہیں اپنی سیاسی خودکشی نظر آ رہی تھی۔

لیکن سوال یہ تھا کہ اگر ان دونوں کو ابھی گرفتار کر کے جدہ بھیج دیا گیا تو کیا ہوگا۔

میں نواز شریف کے دفتر کے ایک کونے میں بیٹھا یہ سارا کچھ سوچ رہا تھا کہ اتنی دیر میں پریس کانفرنس شروع ہو گئی۔ اسلام آباد سے آنے والے دباؤ نے نواز شریف کو ایک ایسی پریس کانفرنس کرنے پر مجبور کر دیا تھا جس کا احساس انہیں 10 ستمبر کو اسلام آباد کے ایئرپورٹ پر اترنے سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔

جب نواز شریف نے گفتگو شروع کی تو لگ رہا تھا کہ وہ وضاحت کے موڈ میں تھے۔ وہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ سعودی حکمرانوں کو بھی ناراض کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ [illegible] یہاں تک تو بات ٹھیک تھی لیکن جب میاں صاحب نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ایک کاغذ سے یہ پڑھنا شروع کیا کہ ان کا جنرل مشرف کے ساتھ باہر رہنے کا معاہدہ پانچ سال کا تھا [illegible] تو ہم سب چونک پڑے۔ ہمارے خیال میں میاں صاحب ایک ایسی بات کر گئے تھے جس کا نقصان انہیں سیاسی طور پر بہت ہوگا کیونکہ اب تک [illegible] کھاتے رہے تھے کہ انہوں نے جنرل پرویز مشرف سے کوئی ڈیل نہیں کی تھی [illegible] تھے کہ ان کی ڈیل پانچ سال کے لیے تھی۔

پاکستان میں تمام ٹی وی چینل اس وقت موبائل ٹیلی فون کے ذریعے نواز شریف کی باتیں ٹیلی کاسٹ کر رہے تھے۔

میں نے میاں صاحب سے پوچھا کہ کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ سعودی شہزادے کا اسلام آباد آ کر انہیں واپس لے جانے کا اعلان کرنا پاکستان کی خود مختاری پر ایک ضرب نہیں ہے۔

میاں نواز شریف نے میری طرف دیکھا اور انہوں نے اس سوال کا جواب نہیں دیا۔ شاید وہ [illegible] بھی چاہتے تو نہ دے پاتے۔

نواز شریف صاحب اور ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ پانچ سال کی ڈیل کی بات کر کے وہ اپنی واپسی کا جواز حاصل کر لیں گے۔ وہ یہ بات بھول گئے تھے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کو بھی ان وکلاء نے یہ لکھ کر دیا تھا کہ انہوں نے جنرل مشرف کے ساتھ کوئی ڈیل نہیں کی تھی اور آج وہی [illegible] پاکستان کے عوام کو یہ بتا رہے تھے کہ ڈیل تو ہوئی تھی لیکن دس سال کے لیے نہیں بلکہ پانچ سال کے لیے تھی۔

وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ جنرل مشرف اور ان کی کابینہ کے وزیروں نے اسلام آباد میں [illegible] سب سامنے آ گئے تھے۔ باقی وزیروں نے بھی میاں صاحب پر طنز کرنا شروع کر دیا کہ آٹھ سال تک وہ جھوٹ بولتے رہے کہ انہوں نے ڈیل نہیں کی تھی اور [illegible] پہلے انہوں نے خود اپنی زبان سے یہ اعتراف کر لیا تھا۔

پورے پاکستان میں [illegible] نواز شریف کے اس اعتراف کو اس طرح جنرل مشرف کے وزیروں نے استعمال کیا کہ پی ایم ایل کے لیڈروں اور ورکروں کا سارا جوش [illegible] ٹھنڈا ہو گیا اور [illegible] جنرل مشرف کے حق میں ہموار ہو گئی۔

میں نے پریس کانفرنس سے نکلنے کے بعد نواز شریف کے قریبی لیڈر سے پوچھا کہ حضور یہ مشورہ میاں صاحب کو کس نے دیا تھا تو انہوں نے نہایت سیاسی جواب دیا۔ بولے کہ یہ سب کا مشترکہ فیصلہ تھا اگرچہ ایک دو لوگ اس کے خلاف تھے لیکن میاں صاحب کا خیال تھا کہ وہ کوئی جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ وہ کہنا یہ چاہ رہے تھے کہ یہ ڈیل جنرل مشرف اور سعودی حکمرانوں کے درمیان ہوئی تھی جو کہ پانچ سال کے لیے تھی۔ یہ ڈیل نواز شریف اور جنرل مشرف کے درمیان نہیں تھی۔

میں نے ان سے بڑے ادب سے کہا کہ حضور اب آپ یہ بات پاکستان میں کس کس کو کیسے سمجھاتے رہیں گے کہ یہ ڈیل جنرل مشرف اور سعودیوں کے درمیان تھی اور نواز شریف کو اس کی خبر آج آٹھ سال بعد لندن میں بیٹھ کر پہلی دفعہ ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ اس سوال کے جواب سے شاعر ظفر اقبال کا شعر شاید اسی موقع کے لیے کہا گیا تھا کہ

جھوٹ بولا ہے تو قائم بھی اس پہ رہو ظفر
آدمی کو صاحب کردار ہونا چاہیے

میں نے کہا کہ صاحب اگر آٹھ سال تک یہ جھوٹ بولا تھا تو کم از کم ابھی اس جھوٹ پر قائم رہتے۔ کیا ضرورت آن پڑی تھی کہ آپ خود ہی اس کا اعتراف کریں کہ ڈیل پانچ سال کے لیے تھی۔

[illegible] نواز شریف کے ساتھیوں کو ابھی بھی خیال تھا کہ [illegible] نواز شریف کا استقبال کرنے کے لیے [illegible] اٹھا۔

نواز شریف نے خود دیکھا کہ ان صحافیوں کی [illegible] انہوں نے ان کے ساتھ ہی جہاز میں سفر کرنا تھا جس میں وہ اسلام آباد آنے والے تھے۔ [illegible] میاں صاحب سفر کریں گے۔ ہم صحافیوں کو [illegible] نواز شریف اور شہباز شریف اکٹھے ائیرپورٹ پہنچے۔ ہم دونوں نے [illegible] دونوں بھائیوں اور ان کے ساتھیوں نے جانا تھا۔ [illegible]

غلام مصطفیٰ کھر بھی پاکستان سے خصوصی طور پر لندن پہنچے تھے۔ ان کا [illegible] مقصد تھا کہ دنیا بھر کے کیمرے وہاں اکٹھے ہوں گے اور ٹی وی سکرین کے کسی کونے میں میاں صاحب کے پیچھے ان کی شکل بھی نظر آ جائے گی۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی تھی کہ یہ وہی غلام مصطفیٰ کھر ہیں جن کی بیوی تہمینہ درانی سے شہباز شریف نے شادی کی تھی اور آج کھر صاحب اپنی سابقہ بیوی کے نئے شوہر کو لندن سے اسلام آباد لانے کے لیے پہنچے ہوئے تھے۔ جس غیرت اور عزت کا مظاہرہ کھر

[illegible] صاحب [illegible] سے [illegible] گئے تھے۔ [illegible] بھی [illegible] کے لیے [illegible] لگتی ہے [illegible] گاڑی میں [illegible] پر [illegible] گاڑی [illegible] ہے۔

مصطفیٰ کھر [illegible] لگ رہے تھے جیسے [illegible] کہ انہیں پھانسی لگ سکتی ہے [illegible] کرنے کے لیے نواز شریف کو ضرور لندن سے پاکستان جانا ہو گا [illegible] جنرل ضیاء جیسے ڈکٹیٹر کے ہاتھوں پھانسی لگ گئے ہے اس لیے انہیں پھانسی لگ سکتی ہے [illegible] کہ انہیں اپنی جان عزیز تھی لیکن لگتا تھا کہ اب کی دفعہ وہ ضرور نواز شریف کو جنرل مشرف کے ہاتھوں [illegible] کر ضرور پاکستان لے جائیں گے۔

مجھے مصطفیٰ کھر کی لندن ایئرپورٹ پر حرکتیں دیکھ کر بڑی ہنسی آ رہی تھی کہ ستر سال کی عمر میں بھی موصوف ایک بوڑھی نائیکہ کی طرح اپنے جوان عاشقوں سے تھوڑی سی توجہ لینے میں مصروف تھے۔ مصطفیٰ کھر سے زیادہ مجھے نواز شریف اور شہباز شریف کی عقل پر ہنسی آ رہی تھی جنہوں نے بغیر سوچے سمجھے اس کاغذی شیر کو اپنے ساتھ جہاز میں لے جانے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔

وقت کیسے بدلتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ ایسے ہی جب اپریل 2004ء میں آصف زرداری دبئی سے لاہور کے ایئرپورٹ پر صحافیوں کے جھرمٹ میں اترے تھے تو جو شخص سب سے پہلے زرداری صاحب کے لاہور میں واقع گھر پر ان کی پریس کانفرنس میں پیچھے کھڑے ہونے کے لیے پہنچا تھا وہ اور کوئی نہیں مصطفیٰ کھر ہی تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر کھر صاحب کو جلاوطنی سے واپس آنے والے ہر لیڈر سے کیوں محبت ہو جاتی ہے کہ وہ بھاگ کر ان کی پریس کانفرنس کے پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ [illegible] کے آگے آنے کا ایک سیاسی [illegible] تھا جو ستر سال کی عمر میں [illegible] ہی کر سکتا تھا۔

[illegible] مجھے شہباز شریف اور مصطفیٰ کھر کو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے لندن ایئرپورٹ پر چلتے دیکھ کر یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ تہمینہ درانی نے مصطفیٰ کھر کو چھوڑ کر شہباز شریف سے کیوں شادی کر لی تھی؟ [illegible] لگتا تھا کہ تہمینہ درانی بھی سیاستدانوں کے ساتھ رہتے ہوئے یہ سیکھ گئی تھی کہ ہر چڑھتے سورج کو سلام کرنا چاہیے۔ مصطفیٰ کھر کا سیاسی [illegible] کب کا ختم ہو چکا تھا اور شہباز شریف کا ابھی باقی تھا۔

[illegible] شہباز شریف اور مصطفیٰ کھر [illegible]
[illegible] ابھی تک [illegible] کہ ہم نے [illegible]

[illegible]

کہاں ہیں [illegible] پاس ابھی تک [illegible]

ہمیں یہ نہیں پتا تھا کہ اب اصل سرپرائز شروع ہونے والے ہیں۔ [illegible] اس وقت [illegible] انہیں کہا گیا کہ آپ لوگ پی آئی اے کے طیارے پر جا کر بیٹھ جائیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نواز شریف پی آئی اے کی فلائٹ سے اسلام آباد کا سفر کریں گے۔ سب کو اس بات کا خوف تھا کہ ممکن ہے کہ نواز شریف کا طیارہ اسلام آباد نہ اترنے دیا جائے اور اس کا رخ [illegible] موڑ دیا جائے اور وہاں سے انہیں سعودی عرب بھیج دیا جائے۔

ہم صحافیوں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر اس فیصلے کے پیچھے کیا وجہ تھی کہ نواز شریف [illegible] رہے تھے۔ میں نے ارشد شریف سے کہا کہ میرے ذہن میں نواز شریف کے فیصلے کی ایک ہی وجہ آتی ہے کہ وہ جنرل مشرف پر ایک نفسیاتی وار کر رہے ہیں۔ نواز شریف کو پتا تھا کہ جنرل مشرف ان کے طیارے کا رخ کسی اور سمت میں نہیں موڑیں گے۔ جنرل مشرف نے پاکستان میں مارشل لاء اس طیارے پر لگایا تھا کہ سری لنکا سے کراچی آنے والی پی آئی اے کی فلائٹ کو نواز شریف نے نیچے اترنے نہیں دیا تھا اگر چند منٹ اور گزر جاتے تو شاید وہ طیارہ کریش کر جاتا۔ آج اگر نواز شریف کا طیارہ موڑا گیا تو جنرل مشرف پر وہی الزام لگ سکتا ہے جو نواز شریف پر لگا کر انہیں ملک بدر کیا گیا تھا۔ یوں جنرل مشرف [illegible] کہ پی آئی اے کی پرواز کا رخ کسی اور شہر موڑ دیا جائے اور جس طیارے پر [illegible] کہ اس کا [illegible] ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

جب ہم اسلام آباد ایئرپورٹ پر اترے تو میں ارشد شریف کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور کہا کہ نواز شریف نے جنرل مشرف کا ذہن ٹھیک پڑھا تھا کہ طیارے کو [illegible] اسلام آباد تو ضرور [illegible] جائے گا اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

اسلام آباد روانگی سے پہلے لندن ایئرپورٹ پر جب میں اور ارشد شریف پی آئی اے کا [illegible]

جہاز میں پوری رات کوئی نہیں سویا سوائے میاں نواز شریف صاحب کے [illegible]
[illegible] کیسے آئے [illegible] سے جہاز میں ہو سکتا ہے [illegible] صاحب [illegible]
اسلام آباد [illegible] میرا خیال تھا کہ کوئی شخص [illegible]
سکتا تھا [illegible] کے [illegible] چھائی ہوئی ہو۔ نواز شریف نے [illegible]
تھا، وہ [illegible] اپنی نیند پوری کر رہے تھے۔

○○○

سات گھنٹے کی طویل مسافت کے بعد اندیشوں اور انجانے خوف میں گھرے اس طیارے کے مسافر اب اسلام آباد کی فضاؤں میں صبح سویرے پہنچ گئے تھے۔ خبر آئی کہ نواز شریف صاحب جاگ گئے ہیں۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ تھوڑی دیر میں جہاز کی پچھلی سائیڈ میں آنے والے ہیں۔ جہاز میں ایک عجیب سی بے چینی اور خوف کا عنصر نمایاں تھا۔ کسی کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر نواز شریف کا کس طرح کا استقبال ہونے والا تھا۔ نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ صحافی بھی اتنے ہی زیادہ اور کسی حد تک خوفزدہ تھے۔ ہمارے ذہنوں میں لاہور ایئرپورٹ پر پرویز الٰہی کی پولیس کے ہاتھوں شہباز شریف اور آصف علی زرداری کے ساتھ آنے والے صحافیوں کی درگت کے مناظر ابھی تازہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ جنرل مشرف بھی ان صحافیوں کو یقیناً سزا دینے میں دلچسپی رکھتے ہوں گے جو نواز شریف کے ساتھ لندن سے آ رہے تھے۔ پھر نواز شریف نے بھی بڑی عقلمندی کی تھی کہ وہ [illegible] میڈیا کے لوگوں کو اپنے ساتھ لائے تھے تاکہ ان کی نظروں کے سامنے ہی سب کچھ ہو۔

جب جہاز اسلام آباد کی فضاؤں میں داخل ہوا تو نواز شریف آ کر جہاز کی درمیانی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ ان کے ارد گرد ان کی پارٹی کے لیڈر اور صحافی کھڑے ہو گئے۔ [illegible] گئی۔ اتنی دیر میں نواز شریف نے کسی سے موبائل فون لیا اور مختلف نمبر ملانے لگے۔ کسی نے [illegible] کان میں سرگوشی کی کہ وہ اسلام آباد کی طرف آنے والے اپنے لیڈروں کے نمبر ملا رہے ہیں تاکہ ان سے پوچھ سکیں کہ [illegible] استقبال کرنے کے لیے [illegible] پہنچ رہا ہے۔ [illegible] صاحب کے [illegible] جب ان لیڈروں کو موبائل [illegible]

آنے کے بعد میاں صاحب نے اپنا موبائل فون ایک طرف رکھ دیا۔

نواز شریف کی کہانی اسلام آباد کی فضاؤں میں ہی ختم ہو گئی تھی۔ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ وہ اکیلے ہو گئے تھے۔ انہیں ایئرپورٹ پر ریسیو کرنے کے لیے اب تک کوئی نہیں پہنچا تھا۔

جب جہاز اسلام آباد کے رن وے پر اترا تو ہمیں دور سے ہی نظر آ گیا تھا کہ اسلام آباد [illegible] پنجاب پولیس کے کمانڈوز کے نرغے میں تھا جہاں کسی چڑیا کو بھی پر مارنے کی اجازت نہیں تھی۔ [illegible] لگانے لگے کہ [illegible] کون سے جہاز میں سعودی [illegible] جہاز سے نواز شریف کے اترنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب پی آئی اے کا جہاز اپنی مقررہ جگہ پر جا کر رکا تو ہمیں چاروں طرف کالی وردیوں میں ملبوس پنجاب پولیس کے کمانڈوز ہی کمانڈوز نظر آئے۔

میں نے ایک بڑی عجیب بات نوٹ کی کہ اس وقت صحافیوں کی اکثریت جذباتی طور پر نواز شریف صاحب کے ساتھ مل چکی تھی۔ ایک ٹیلی ویژن چینل کا مشہور اینکر تو اس وقت باقاعدہ میاں صاحب کا باڈی گارڈ بن گیا تھا۔ یہی صاحب شوکت عزیز کے بھی سب سے قریبی دوست تھے۔ وہ اس وقت میاں صاحب اور ان کی پارٹی کے لیڈروں کو ہدایات دینے میں مصروف تھے کہ اگر پولیس کے کمانڈوز جہاز میں زبردستی داخل ہوتے ہیں تو انہوں نے کیسے میاں صاحب کی حفاظت کرنی ہے۔ کس نے کہاں پوزیشن لینی ہے۔ اس وقت وہ ایک [illegible] رہے تھے جو ہر قیمت پر میاں صاحب کو پولیس کے نرغے سے نکال کر ایئرپورٹ سے باہر لے جانے پر تلے ہوئے تھے۔

جہاز کے دروازے سے عام مسافروں کو جانے کی اجازت دے دی گئی تھی اور جہاز میں صرف وہی لوگ تھے جو نواز شریف صاحب کے ساتھ لندن سے آئے تھے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] میاں صاحب کو گرفتار کرنے [illegible]
[illegible]

تھا، جو پارٹی کا دفاع کرنے کے بجائے وہاں سے خاموشی سے نکل جائے گا۔

ارشد شریف نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا کہ رؤف! تم صحافت چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ جا کر ان کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ اب تک پی ایم ایل (ن) کے کسی بھی لیڈر کو نہیں آیا [illegible] کو یہ مشورہ دیا ہے۔

میں نے ارشد سے کہا کہ تم دیکھ لینا نواز شریف شکرانے کا بھی کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیں گے۔ دوسرے میں نواز شریف کے اس شکرانے کے بجائے کو ایک سیاستدان کی آنکھ سے نہیں ایک صحافی کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ اس کا عوام پر کیا اثر پڑے گا۔

ارشد شریف نے مجھے کہا کہ تم جا کر یہ بات نواز شریف کو کیوں نہیں کہتے۔

میں نے کہا میرے پیارے! میں تمہیں پہلے کہہ چکا ہوں میں صحافی ہوں کوئی سیاسی ورکر نہیں کہ لیڈروں کو جا کر مشورے دیتا پھروں۔ میاں صاحب میں اتنی سمجھ بوجھ خود ہونی چاہیے کہ جب آٹھ سال بعد وطن واپس لوٹ رہے ہیں تو انہیں جہاز کی سیڑھیوں سے اترتے ہی پہلا کام کیا کرنا چاہیے۔

میں اور ارشد شریف نواز شریف کا ایک ایک قدم گن رہے تھے۔ اب ہم دونوں کی دلچسپی اس بات میں زیادہ ہو چکی تھی کہ نواز شریف نیچے اترتے ہی سجدہ کریں گے یا نہیں کہ ہم ایک لمحے کے لیے اپنے ارد گرد کا سارا ماحول بھول گئے تھے۔

آخر نواز شریف آخری سیڑھی سے نیچے اترے۔ ان کے ارد گرد ان کی پارٹی کے بجائے انہیں کسی ممکنہ کمانڈو ایکشن سے بچانے کے لیے تیار تھے۔

نواز شریف نے وہ موقع گنوا دیا۔ میرا خیال تھا کہ انہیں خدا کے آگے جھک کر اس مٹی کو چومنا چاہیے تھا۔ اس کا انہیں بے پناہ سیاسی فائدہ ہوتا لیکن شاید جس نے ان کی لندن سے اسلام آباد واپسی کا سکرپٹ لکھا تھا اس میں وہ یہ سین ڈالنا بھول گیا تھا یا یہ اس کی ترجیح میں نہیں تھا۔ نواز شریف نے اپنی دھرتی ماں کو گلے نہیں لگایا اور دھرتی ماں بھی شاید اس سے روٹھ چکی تھی کہ ڈیڑھ گھنٹے بعد نواز شریف کو پنجاب پولیس کے کمانڈوز تقریباً گھسیٹتے ہوئے وی آئی پی لاؤنج سے ایک پرانی بس میں بٹھا کر شہزادے مقرن کے جہاز میں بٹھا چکے تھے۔

جہاز سے اترنے کے بعد ایک دفعہ [illegible] بات پہنچ گئی تھی کہ [illegible] میں جہاز کو ایئرپورٹ لاؤنج میں لے جایا گیا جس میں سارے صحافی بیٹھے تھے [illegible] میں بیٹھیں گے جو ان کے لیے لاؤنج کی گئی تھی۔ نواز شریف وہاں سے [illegible] تھا کہ اگر وہ اس بھری ہوئی لاؤنج میں بیٹھ گئے تو یہ ممکن تھا کہ انہیں [illegible] میں گھر سے ایک اور جہاز میں بٹھا کر جدہ لے جائیں گے۔ تھوڑی دیر بعد [illegible] شریف صحافیوں والی بس میں آ کر بیٹھ گئے۔

اب تک کی کارروائی سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ نواز شریف اپنی پارٹی سے کٹ چکے تھے۔ لندن میں جس انقلاب کی کہانیاں سنائی گئی تھیں وہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر اترنے سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھیں۔ اسلام آباد ایئرپورٹ پر انہیں لینے کے لیے پارٹی کا ایک لیڈر یا ورکر بھی موجود نہیں تھا۔ پارٹی کے تمام لیڈران اور ورکرز ایک رات پہلے ہی پولیس کو پکڑا کر گرفتاری دے چکے تھے۔ وہ نواز شریف کے لیے ڈنڈے کھا کر ایئرپورٹ جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اب نواز شریف کا زیادہ تر انحصار اس پاکستانی اور غیر ملکی میڈیا پر تھا جسے وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ پارٹی پیچھے دیکھ کر ان کے اپنے قریبی ساتھیوں کے چہروں پر بھی خوف و ہراس کی نشانیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اگر کسی شخص کا حوصلہ بلند تھا تو وہ نواز شریف کے ساتھ آنے والے لندن کے بیرسٹر تھے۔ نواز شریف کے لندن کے آفس کے ساتھی محمد افضال بھی نواز شریف کی حفاظت کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے تھے۔ بیرسٹر امجد ملک جن کا تعلق فیصل آباد سے ہے وہ جہاز کے اندر بھی خاصی دیر تک امیگریشن افسران سے قانونی معاملات پر جھگڑتے رہے تھے۔ امجد ملک کا اصل امتحان اب شروع ہونے والا تھا جب وی آئی پی لاؤنج میں نواز شریف اور جنرل مشرف کے بھیجے ہوئے [illegible] کے درمیان آخری لڑائی شروع ہونے والی تھی۔

وی آئی پی لاؤنج میں پہنچتے ہی ہمیں یکدم محسوس ہوا کہ شاید کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ ہم لندن سے ایک عام مسافر فلائیٹ میں ابھی ابھی پہنچے ہیں۔ ہم کوئی بڑے وی آئی پی لوگ ہیں جن کے لیے [illegible] ہونے والی [illegible] جا رہا ہے۔ وہاں کچھ اس طرح کا ماحول بنا دیا گیا تھا کہ یکدم سب لوگ ریلیکس ہو گئے۔ کئی گھنٹوں پر محیط اندیشے اور خوف اچانک ختم ہو گئے تھے۔ صحافی بڑے ریلیکس ہو کر صوفوں پر بیٹھ

مجھے [illegible] تھے۔

نواز شریف بھی [illegible] تھی۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ یہ حکومت کی کیا حکمت عملی تھی [illegible] نواز شریف کو ایئر پورٹ سے نکلنے کی اجازت دی جائے گی یا پھر کسی مناسب وقت کا انتظار کیا جا رہا [illegible] کہ نواز شریف [illegible] کر کے انہیں ایئر پورٹ پر پکڑ کر ایک اور جہاز سے جدہ روانہ کر دیا جائے؟ وہاں کا ماحول اب [illegible] سکون ہو چکا تھا کہ وہاں [illegible] سے بیٹھے تھے اور صحافی [illegible] شروع ہو گئے تھے۔

میں نے ارشد شریف سے کہا کہ یار یہ معاملہ جتنا پر سکون لگ رہا ہے یہ اتنا ہے نہیں، یہ ساری خاموشی اور سکون کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

ارشد شریف نے میری طرف دیکھا اور روایتی انداز میں مسکرایا۔ یہ ایک ایسی مسکراہٹ تھی جسے ہم دوست کوئی بھی معنی اپنے مطلب کے جب چاہیں پہنا سکتے تھے۔

آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ ہم سب کے ذہن میں تھا۔ نواز شریف سے ایک دفعہ پھر امیگریشن سٹاف نے اصرار شروع کر دیا کہ وہ پاسپورٹ ان کے حوالے کریں تا کہ ان کی امیگریشن کرائی جا سکے۔ اب کی دفعہ نواز شریف امیگریشن کرانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کسی نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ انہیں ایئر پورٹ سے باہر جانے دیا جائے۔ اگر وہ ایئر پورٹ سے نکلنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو باہر سڑک پر ایک ساتھی بھی نہیں تھا جو ان کا استقبال کرتا۔ حکومت امیگریشن کروا کر دراصل ان کا پاسپورٹ قبضے میں لینا چاہ رہی تھی تا کہ اس پاسپورٹ کو سپریم کورٹ کے سامنے ثبوت کے طور پر پیش کیا جائے کہ نواز شریف پاکستان میں داخل ہوئے تھے اور پھر اپنی مرضی سے ہی وہ جدہ چلے گئے تھے لہٰذا ان پر کسی طرح کا توہین عدالت کا کیس نہیں چل سکتا تھا۔

نواز شریف اور ان کے ساتھیوں کو یہ کہانی سمجھ آ رہی تھی لہٰذا ان کے لیے سب سے اہم بات یہ بن گئی تھی کہ کسی طرح نواز شریف کا پاسپورٹ امیگریشن والوں کے ہاتھ نہ لگے۔

[illegible] امیگریشن والوں نے صحافیوں سے [illegible]

ماحول میں ایک دفعہ پھر تناؤ کی کیفیت طاری تھی۔ [illegible] رہے تھے۔ اسی دوران پولیس کے ایک [illegible] افسران وہاں نمودار ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ نواز شریف کو چند مقدمات میں گرفتار کرنا چاہ رہے ہیں۔ [illegible] تو انہوں نے فوراً عدالت کے وارنٹ دکھا دیے۔ اس سے لگتا تھا کہ حکومت نے پوری تیاری کی ہوئی تھی کہ کسی نہ کسی طرح نواز شریف کو اکیلا کر کے صحافیوں اور اپنے ساتھیوں سے جدا کیا جائے تاکہ انہیں جدہ بھیجنے میں آسانی ہو۔

جب افسران کے وارنٹ دکھانے پر وہاں ایک دفعہ پھر ایک سکون کی سی کیفیت چھا گئی۔ سب نے ایک گہرا سانس لیا کہ چلیں اب نواز شریف کو گرفتار کر کے اٹک قلعے لے جایا جائے گا۔ اس بات کے لیے نواز شریف سمیت ان کی پارٹی کے سارے لیڈر تیار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اٹک قلعے سے چند دنوں بعد وہ سپریم کورٹ سے نواز شریف کی ضمانت کرا لیں گے۔

ارشد شریف نے اپنے ایک جاننے والے افسر سے پوچھا کہ اب آپ لوگوں کا کیا پلان ہے۔ اب آپ لوگ مزید کتنی دیر اس صورتحال کو اس طرح برقرار رکھیں گے۔

وہ افسر مسکرایا اور بولا آپ لوگوں کے جانے کا انتظار کیا جا رہا ہے تا کہ کمانڈو ایکشن کر کے نواز شریف کو جہاز پر سوار کرا دیا جائے۔

اس معنی خیز مسکراہٹ نے سب کچھ واضح کر دیا تھا۔ ہم سب لوگوں کے اندازے غلط ثابت ہو رہے تھے۔ ہم صحافیوں کا خیال تھا کہ شاید نواز شریف کو اب کی دفعہ جدہ نہیں بھیجا جائے گا۔ ہمارے اس یقین کے پیچھے تین وجوہات تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اگر سعودی عرب نواز شریف کے پاکستان آنے پر راضی نہیں تھا تو وہ لندن میں ہی نواز شریف کو روک سکتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ سپریم کورٹ آف پاکستان نے حکومت کو یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ اپنے شہریوں کو واپس آنے سے نہیں روک سکتے

تھے۔ تجربے والے نواز شریف کا رویہ تھا جس کی وجہ سے ہم سب الجھ کر رہ گئے تھے کہ ان سے کس طرح کہا کہ شاید اس دفعہ نواز شریف باقاعدہ پلاننگ اور حکمت عملی کے بعد پاکستان جا رہے تھے اور وہ بے نظیر کی طرح کوئی ایڈونچر کرنے نہیں جا رہے تھے بلکہ معاملہ طے کر کے پاکستان واپس آ رہے تھے۔ آخر کہیں نہ کہیں سے تو انہیں یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ وہ پاکستان واپس جانے کی تیاری کریں تو ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔

نواز شریف لندن میں بار بار یہ بات کہتے تھے کہ انہیں کسی بھی سعودی عہدیدار یا بادشاہ سلامت نے فون کر کے پاکستان جانے سے نہیں روکا ہے۔ ان کے خیال میں یہ پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے جس میں سعودی عرب مداخلت کرنے کو تیار نہیں! ایک دو دفعہ تو نواز شریف اس بات پر چڑ گئے جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا سعودی عرب نے انہیں پاکستان واپس جانے کی اجازت دے دی ہے۔ نواز شریف نے بڑی برہمی سے سوال کرنے والے اس صحافی کو یہ یاد کرانے کی کوشش کی تھی کہ پاکستان ایک خود مختار ملک ہے اور ہم کیوں بار بار سعودی عرب کو پاکستانی معاملات میں گھسیٹ رہے ہیں۔

جب نواز شریف سوال کرنے پر برہمی کا اظہار کر رہے تھے تو ہم سب چپ رہے ورنہ پوچھا جا سکتا تھا کہ میاں صاحب! سعودی عرب کو پاکستانی معاملات میں مداخلت کرنے کا اختیار تو اس وقت ملا تھا جب انہوں نے آپ کو جنرل مشرف کی جیل سے رہائی دلوائی تھی۔ اس وقت سعودی عرب کی مداخلت کا خیر مقدم کیا گیا تھا لیکن آج بدلتے حالات میں اسی ملک کی مداخلت کو پاکستان کی خودمختاری پر ایک ضرب قرار دیا جا رہا تھا۔

یہ وہ باتیں تھیں جن کی بنیاد پر ہم میں سے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ نواز شریف کو جدہ نہیں بھیجا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ انہیں اٹک جیل لے جایا جائے گا۔

اتنی دیر میں ہم نے دیکھا کہ معاملہ اب امیگریشن اور پولیس کے افسران کے ہاتھوں سے انٹیلی جنس ایجنسیوں کے چند لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔ اب یہ ایجنسیاں بے چین نظر آ رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ اوپر سے کہیں یہ پیغام آ گیا تھا کہ اب مزید ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں جو کر رہے ہو وہ کر گزریں۔

بات چیت میاں صاحب آہستہ آہستہ گرمی میں بدلتی جا رہی تھی۔ صحافی بھی اپنی سیٹوں پر چوکس ہو گئے تھے۔ سب کو پتہ چل گیا کہ آخر وہ مرحلہ آن پہنچا ہے جس کے لیے ان سب نے لندن سے اسلام آباد کا سفر کیا تھا۔ گفتگو میں تیزی آنے لگی۔ چند باتیں بھی کھٹکنے لگے۔ اچانک نواز شریف کے گرد انٹیلی جنس افسران نے گھیرا ڈال لیا اور بڑی تیزی سے ان کی پارٹی کے لوگوں کو ان سے علیحدہ کیا۔ وہ میاں صاحب سے بدتمیزی کرنی شروع کی۔ ایک مرحلے پر وہ بدتمیزی اتنی بڑھ گئی کہ میاں صاحب کا چہرہ ایک دفعہ غصے سے سرخ ہوا اور انہوں نے تقریباً چلا کر کہا کہ وہ تمام افسران جو ان کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں انہیں ایک دن اپنے کیے کی سزا بھگتنا پڑے گی۔

اس دوران میاں صاحب کو دھکے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ ان کی پارٹی کے وہ تین لوگ ابھی بھی میاں صاحب کے قریب رہنے کی کوشش کر رہے تھے کہ انہیں دھکے نہ پڑیں۔ ان میں ان کے لندن کے دفتر کے محمد افضال پیش پیش تھے۔ ہم سب صحافی اکٹھے ہو گئے تھے۔ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا کرنے والے تھے۔ راول لاؤنج میں چیخ و پکار اور شور شرابہ بڑھ گیا تھا۔ انٹیلی جنس افسروں کے ساتھ اب پنجاب پولیس کے کمانڈوز بھی مل گئے تھے۔ محمد افضال کا حال اس وقت سب سے زیادہ برا تھا۔ وہ نواز شریف کے ساتھ ابھی تک چمٹے ہوئے تھے کہ کہیں ان کے ساتھ بدتمیزی نہ ہو۔ اسی دھکم پیل میں ہم نے اچانک ایک گونج دار آواز سنی۔ یہ محمد افضال کی آواز تھی جو دور سے انٹیلی جنس ایجنسیوں کے افسران کے رویے کو دیکھ کر چلاتے ہوئے کہا کہ شرم کرو یہ شخص بھی تمہارا دو دفعہ وزیراعظم رہا ہے۔ تم لوگوں کو اپنے وزیراعظم کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔

میں اور ارشد شریف ایک کونے میں کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ہم دونوں پر اچانک ڈپریشن کا دورہ پڑا۔ ہم کس طرح کے ملک کے شہری تھے جہاں دو دفعہ وزیراعظم رہنے والے شخص کو انٹیلی جنس ایجنسیوں کے چند لوگ سرعام ذلیل کر رہے تھے۔ وہ شخص جو کبھی اس ملک کے اچھے برے کا مالک تھا آج چند ایجنٹوں کے ہاتھوں گھسیٹا جا رہا تھا اور اسے باتھ روم میں بند کرنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ لندن میں بیٹھ کر ہمیں یوں لگتا تھا کہ شاید اب پاکستان بدل گیا ہے۔ لیکن ہماری آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہو رہا تھا اس سے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ اس ملک میں کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ جنرل مشرف اور نواز شریف کے درمیان 12 اکتوبر کو شروع ہونے والی ذاتی جنگ آٹھ سال بعد بھی اپنی تمام تر قوت

[illegible]

[illegible]

○○○

[illegible]

[illegible] پاکستان میں مصطفیٰ کھر جیسے ایماندار [illegible] تھے۔ [illegible] مصطفیٰ کھر [illegible] نواز شریف [illegible] مصطفیٰ کھر صاحب پاکستان [illegible] تھے۔

اس ایک واقعہ سے [illegible] پی پی پی [illegible] شروع کر دیں۔ وہاں جنرل مشرف حکومت سے [illegible] نواز شریف پر [illegible] انھوں نے [illegible] کے خلاف [illegible] کی تھی [illegible] ایک وزیر کا نام راجہ حامد بھی تھا۔ [illegible] پاکستان مسلم لیگ (ق) کے ٹکٹ پر [illegible] الیکشن جیت کر قومی اسمبلی میں [illegible] نواز شریف [illegible] قرآن کی قسمیں کھاتے تھے کہ وہ جنرل مشرف کے ساتھ ہاتھ ملانے والے کسی بھی سیاستدان سے ہاتھ تک نہیں ملائیں گے وہی بعد میں راجہ حامد جیسے لوگوں کو اپنی پارٹی کا ٹکٹ دے کر قومی اسمبلی کا ممبر بنواتے دیکھے گئے۔

اس واقعے کے دو ماہ بعد نواز شریف پاکستان لوٹ آئے۔ اب کی دفعہ انھوں نے درست ایئر پورٹ کا انتخاب کیا۔ وہ اسلام آباد کے بجائے لاہور ایئر پورٹ پر اترے۔ اب انھیں ہمارے جیسے صحافیوں کو جہاز پر اپنے ساتھ لاہور لانے کی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ اس دفعہ سعودی عرب کے بادشاہ سلامت نے انھیں اپنے طیارے پر ایک بلٹ پروف مرسیڈیز گاڑی ساتھ دے کر پاکستان واپس بھیجا تھا۔ بھلا اب کی دفعہ جنرل مشرف کی کیا مجال کہ وہ بادشاہ کے بھیجے ہوئے ہمارے لیڈر کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو ہماری آنکھوں کے سامنے اسلام آباد ایئر پورٹ پر کیا گیا تھا۔

سید یوسف رضا گیلانی

وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کو ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں فیصل صالح حیات ایک ایسی بات کہہ دیں گے جس کی وضاحت انھیں ٹی وی کیمروں کے سامنے خود کرنی پڑ جائے گی۔

دراصل وزیر اعظم گیلانی، فیصل صالح حیات اور وفاقی وزیر برائے پانی و بجلی راجہ پرویز اشرف کے درمیان ایک سال سے جاری لڑائی میں کراس فائرنگ کا شکار ہوئے۔ جون 2010ء کے آخری ہفتے میں جب بجٹ پر بحث جاری تھی تو فیصل صالح حیات نے ایک دفعہ پھر راجہ پرویز اشرف پر رینٹل پاور پراجیکٹس میں کرپشن کرنے کے الزامات دہرائے۔ اس وقت وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی بھی ایوان میں موجود تھے۔ فیصل صالح حیات نے اس موقع کا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کہا کہ راجہ پرویز اشرف کے خلاف سکینڈل اس رپورٹر (رؤف کلاسرا) نے کیا ہے جنھوں نے وزیر اعظم گیلانی کی کتاب "چاہ یوسف سے صدا" لکھی ہے۔

یہ بات قومی اسمبلی میں بیٹھے تمام ارکان اور میڈیا کے لوگوں کے لیے ایک بم شیل کے طور پر سامنے آئی۔ کوئی بھی یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ وزیر اعظم گیلانی کو اس طریقے سے سب کے سامنے یہ کہا جائے گا کہ ان کی آپ بیتی دراصل کسی صحافی نے انھیں لکھ کر دی تھی۔ انھوں نے [illegible]

نام لکھ دیا تھا۔

جب فیصل صالح حیات نے یہ ساری بات ختم کی تو وزیر اعظم گیلانی کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اپنی وضاحت پیش کی۔ گیلانی صاحب نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رؤف کلاسرا میرے دوست ہیں۔ پھر انہیں کوئی بات یاد آئی اور بولے کہ نہیں، وہ میرے ذاتی دوست ہیں۔ جب میں اڈیالہ جیل میں تھا تو وہ مجھ سے ملنے آتے تھے۔ گیلانی صاحب نے ایک اور بات بھی کی کہ وہ بھی سرائیکی علاقے سے ہیں اور میں بھی سرائیکی علاقے سے آیا ہوں۔ تاہم یہ کتاب میں نے خود لکھی ہے رؤف کلاسرا نے نہیں لکھی۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے گیلانی صاحب نے یہ بھی کہا کہ وہ انگلش میں لکھتے ہیں، اردو میں نہیں۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر رؤف نے لکھی ہوتی تو وہ کتاب انگلش میں ہوتی نہ کہ اردو میں۔

جب قومی اسمبلی میں یوسف رضا گیلانی اور فیصل صالح حیات میں اس بات پر بحث جاری تھی کہ یوسف رضا گیلانی کی کتاب کس نے لکھی تھی تو میں اس وقت بڑے مزے سے اپنے گھر پر سویا ہوا تھا۔ اسمبلی میں گیلانی کے دوست احمد کا فون آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ آپ کہاں ہیں؟ یہاں تو آپ کی وجہ سے خاصا رولا پڑا ہوا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ فیصل صالح حیات کہتے ہیں کہ کتاب آپ نے لکھی ہے، گیلانی صاحب کہتے ہیں کہ نہیں یہ کتاب انہوں نے خود لکھی تھی۔ میں نے تقریباً سوتے ہوئے احمد کو جواب دیا کہ یار یہ لمبی کہانی ہے۔ پھر کسی وقت اس پر بات کریں گے۔

احمد کا فون بند ہو گیا۔ میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی بستر پر لیٹے لیٹے دس سال پہلے کی ان یادوں میں کھو گیا جب میری پہلی دفعہ یوسف رضا گیلانی سے اڈیالہ جیل میں ملاقات ہوئی تھی۔

○○○

اگست 2001ء کی بات ہے۔ میں نے ان دنوں نیا نیا ڈان اخبار چھوڑ کر دی نیوز کو جوائن کیا تھا۔ جنرل مشرف نے ابھی دنوں ایڈہاک پبلک اکاؤنٹس کمیٹی تشکیل دی تھی۔ ایک منجھے ہوئے ریٹائرڈ بیوروکریٹ ایچ۔ یو بیگ کو اس کا چیئرمین لگایا گیا تھا۔ اس کمیٹی کے باقی ممبران بھی ریٹائرڈ بیوروکریٹس

یہ بھی ایمانداری کی بات ہے کہ ان سب نے ان کے بعد آنے والے سیاسی ادوار میں بننے والی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے ممبران سے بہت اچھا کام کیا تھا۔

ابھی دنوں اچھی بات یہ ہوئی کہ پہلی دفعہ اس کمیٹی کی میٹنگ میں میڈیا کے لوگوں کو شرکت کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اب صحافی وہاں بیٹھ کر اس کی کارروائی کو رپورٹ کرتے تھے۔

ایک دن بڑی عجیب سی بات ہوئی۔ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے سامنے قومی اسمبلی اور سینیٹ سیکرٹریٹ کی دو مختلف آڈٹ رپورٹس پیش کی گئیں۔ ایک رپورٹ اس دور کی تھی جب وسیم سجاد چیئرمین سینیٹ تھے اور یوسف رضا گیلانی اسپیکر قومی اسمبلی تھے۔ ان آڈٹ رپورٹس میں دونوں پر کچھ اسی طرح کے الزامات لگائے گئے تھے جن میں لوگوں کو نوکریاں دینا، گاڑیوں اور ٹیلی فونز کا غیر ضروری استعمال اور اختیارات کا غلط استعمال وغیرہ شامل تھے۔ بیوروکریٹس کا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ پبلک اکاؤنٹس کمیٹی پارلیمنٹ کے معاملات کو چیک نہیں کر سکتی کیونکہ یہ ایک خود مختار ادارہ ہے جس کے تمام معاملات کی منظوری اس کی فنانس کمیٹی سے لی جاتی ہے۔ تاہم کمیٹی نے یہ اعتراض ماننے سے انکار کرتے ہوئے آڈٹ رپورٹ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وسیم سجاد پر گاڑیوں، فون اور گاڑیوں کے غلط استعمال کے معاملے میں کمیٹی روم سے اٹھارہ لاکھ روپے ریکور کرنے کی ہدایت کر دی۔ بعد میں وسیم سجاد نے جنرل مشرف کے نام ایک خط لکھا۔ جنرل مشرف نے صدر پاکستان کی حیثیت سے انہیں اٹھارہ لاکھ معاف کر دیے اور کچھ دنوں بعد وسیم سجاد نے 2002ء کے الیکشن سے پہلے پاکستان مسلم لیگ کو جوائن کر لی۔ یوں یہ سارا سودا اٹھارہ لاکھ روپے میں طے ہو گیا۔

اگلے دن یوسف رضا گیلانی پر بننے والی آڈٹ رپورٹ کی باری تھی۔ ان پر بھی وہی الزامات تھے جو وسیم سجاد پر تھے۔ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ ان پر بھی کوئی جرمانہ وغیرہ کر کے آڈٹ رپورٹ کو سیٹل کر دیا جائے گا۔ تاہم جب رپورٹ سامنے لائی گئی تو کمیٹی کو بتایا گیا کہ نیب نے پہلے ہی اس رپورٹ کی بنیاد پر یوسف رضا گیلانی کو گرفتار کر رکھا ہے اور جب تک ان کیسز کا فیصلہ نہیں ہو جاتا کمیٹی یہ رپورٹ اپنی میٹنگ میں زیر بحث نہیں لا سکتی۔

یوں پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے بھی اپنے اختیارات نیب کے سامنے سرنڈر کیے۔ اگر وہ یوسف رضا گیلانی پر بننے والے ان آڈٹ پیروں کا فیصلہ کر دیتی جیسے وسیم سجاد کے سلسلے میں کیا گیا تھا تو شاید

[illegible] کی عدالت سے سات سال قید اور دس کروڑ روپے کی سزا [illegible]
میں [illegible] چکا تھا۔

اب میں نے [illegible] میں یہ [illegible] دیکھا کہ کس طرح یہ [illegible] حکومت کے آتے ہی [illegible] کر دیا گیا تھا [illegible] یوسف رضا گیلانی [illegible] نہیں کیا گیا تھا تو میں نے اپنے [illegible] ایک [illegible] سٹوری [illegible] کے فرنٹ پیج پر [illegible] میں لگی۔ اس میں میں نے یوسف رضا گیلانی اور [illegible] پر لگنے والے الزامات [illegible] سامنے [illegible] تھے۔ اس خبر کو چھپا تھا کہ ایک [illegible] گیا۔ ان دنوں جنرل مشرف اپنی پوری قوت کے ساتھ [illegible] کر رہے تھے۔ احتساب کا بھی بہت چرچا ہو رہا تھا۔ اس خبر سے ان کے جعلی احتساب کا پردہ ابھی چاک ہوا [illegible] یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ یہ احتساب وغیرہ محض اپوزیشن سیاستدانوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے تھا۔ [illegible] کی طرح جو سیاستدان اٹھارہ لاکھ روپے کا جرمانہ معاف کرا کر پاکستان مسلم لیگ ق میں شامل ہونے کے لیے تیار تھے انہیں معافی تھی اور جو یوسف رضا گیلانی کی طرح مزاحمت کر رہے تھے ان کے لیے آٹھ سال قید اور دس کروڑ روپے جرمانے کی سزا تھی۔

میری یوسف رضا گیلانی سے اس خبر سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے شاید میری یہ خبر اڈیالہ جیل میں پڑھی تھی۔ انہوں نے اپنے جاننے والوں سے پوچھا کہ یہ رپورٹر کون ہے کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔ کسی دوست کے ذریعے مجھ تک ان کے شکریے کے الفاظ پہنچے۔ وہ [illegible] میں واقع ایک ہسپتال میں اپنے چیک اپ کے لیے آئے۔ مجھے پیغام ملا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہاں ان سے ایک کمرے میں [illegible] ملاقات ہوئی۔ ان کے خاندان نے ان کی گرفتاری کو ان کی والدہ سے چھپایا ہوا تھا۔ انہیں یہ تاثر دیا گیا تھا کہ وہ ہسپتال کے اس کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جب گیلانی صاحب کی والدہ وہاں آئیں تو انہوں نے ہسپتال کے اچھے صاف ستھرے کمرے کی تعریف کی اور کہا کہ اب وہ بھی یہیں رک جائیں گی۔ گیلانی صاحب کے لیے [illegible] ہو گیا کہ وہ ماں کو کیسے سمجھائیں کہ وہ تھوڑی دیر بعد اس کمرے سے جیل چلے جائیں گے۔ آخر گیلانی صاحب نے اپنی والدہ کو بتایا کہ جنرل مشرف بھی چاہتے ہیں کہ وہ بھی نواز شریف اور شہباز شریف کی طرح پاکستان چھوڑ کر چلے جائیں۔ اب [illegible] بتائیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ اس پر ان کی والدہ نے کہا کہ بالکل نہیں [illegible]

[illegible] انہوں نے [illegible] جنرل مشرف کی یہ [illegible] ملتان [illegible]

کچھ دن بعد جب گیلانی صاحب [illegible] کے کسی شخص نے [illegible] یہ بات [illegible] گئے۔

ہسپتال کے اسی کمرے میں میری [illegible] یوسف رضا گیلانی سے ملاقات ہوئی۔ وہ بڑی عزت اور احترام سے ملے۔ اس بات کا شکریہ ادا کیا کہ میں نے ان کے حق میں وہ سٹوری فائل کی تھی باوجود اس بات کے کہ میں ان سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔

میں نے گیلانی صاحب سے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ مجھ جیسے لوگ [illegible] بیٹھ کر [illegible] علاقوں کے فیوڈلز کو اس بات پر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کے لیے کچھ نہیں کرتے۔ وہ غریبوں کو نوکریاں نہیں دیتے۔ جب آپ نے نوکریاں دی تھیں تو جیل میں ڈال دیا گیا تھا لہٰذا اس معاملے پر قلم اٹھانا ان پر کوئی احسان نہیں تھا۔

خیر گیلانی صاحب سے ایک نئے تعلق کی بنیاد پڑی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ [illegible] سیاستدانوں کے برعکس ملنے ملانے میں زیادہ بہتر انسان تھے۔ ان کا رویہ عام لوگوں سے بہتر تھا۔ ہر ایک کے ساتھ عزت سے پیش آنا اور شفقت سے گفتگو کرنا ان کے مزاج کا حصہ تھا [illegible] محسوس نہیں ہو رہی تھی جو میں دیگر سیاستدانوں کے معاملے میں کرتا تھا۔

اس کے بعد میں ان سے ملنے کے لیے اڈیالہ جیل گیا۔ وہ بڑی عزت اور احترام سے پیش آئے۔ مجھے ایک نیا شوق ہوا کہ کیوں نہ ان سے ان کی سیاسی زندگی کے بارے میں بات چیت شروع کی جائے تاکہ ماضی میں چھپے ہوئے رازوں پر سے پردہ اٹھایا جا سکے۔ یوں میرا اڈیالہ جیل آنا جانا [illegible] ہو گیا۔ ایک دن گیلانی صاحب نے بتایا کہ وہ اپنی آپ بیتی لکھ رہے ہیں۔ جیل میں [illegible] ماضی کے بارے میں [illegible] لکھتے رہتے۔

[illegible]

میں نے گیلانی صاحب کو وہ پیسے واپس کرتے ہوئے کہا کہ ہم اس کتاب کا ترجمہ کرنے کا [illegible] پیسے نہیں لیں گے۔ ہم اس کتاب پر اپنا نام استعمال کریں گے اور اس کی رائلٹی میں سے اپنا حصہ لیں گے۔

گیلانی صاحب کہنے لگے کہ یہ پیسے میں آپ کو نہیں دے رہا ہوں۔ یہ پیسے آپ کے دوست کے لیے ہیں تاکہ وہ یہ کام محنت سے کرے۔

میں نے وہ پیسے گیلانی صاحب کو لوٹا دیے کیونکہ مجھے علم تھا کہ اس وقت گیلانی صاحب کے گھریلو حالات اچھے نہیں تھے۔ نیب نے جب سے ان کے بینک اکاؤنٹس فریز کیے تھے اور ان کی جائیداد بیچنے پر پابندی لگی تھی ان کے پاس بچوں کے لیے بھی فیسوں کے پیسے نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی ایک گاڑی اور قیمتی گھڑی بیچ کر اپنے مالی معاملات چلانے کی کوشش کی تھی۔ ان حالات میں جیل میں بیٹھے کسی بھی انسان سے پیسے لینا میرے اپنے ضمیر کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں تھا چاہے وہ پیسے مجھے اس انگریزی کتاب کے ترجمے کے لیے ہی کیوں نہیں دیے جا رہے تھے۔

[illegible]

[illegible] پوچھنا شروع کر دیا کہ ان میں سے جنرل مشرف کون ہے۔ ہم دونوں اس گول مٹول بچے کے منہ سے یہ سوال سن کر [illegible] جنرل مشرف سمجھ رہا ہے۔ پتہ چلا کہ وہ پیارا سا بچہ یوسف رضا گیلانی کی بیٹی فضہ کا اکلوتا بیٹا اسفند یار ہے۔ جب وہ گھر پر کوئی شرارت کرتا یا رات کو سونے سے انکار کرتا تو اس کی ماں اسے ڈرانے کے لیے کہتی کہ اگر تم نے شرارت کی یا نہ سوئے تو جنرل مشرف آ کر تمہیں اسی طرح جیل میں بند کر دیں گے جیسے انہوں نے تمہارے نانا ابو کو قید کیا ہوا ہے۔ اس ننھے سے بچے کے نزدیک دنیا میں صرف ایک ہی خوفناک چیز تھی جس کا نام جنرل مشرف تھا۔ جو اتنا طاقتور تھا کہ اس نے ان کے نانا ابو کو بھی قید میں رکھا ہوا تھا اور وہ سارے مل کر بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ وہ جب بھی جیل میں اپنی ماں کے ساتھ اپنے نانا ابو سے ملنے آتا تو وہ گیلانی صاحب سے

ڈاکٹر گیلانی صاحب نے میرے مسلسل اصرار کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ ہم دونوں ان کے بڑے کمرے کی طرف گئے جہاں ان کی بیوی بچے اور ارشد شریف بیٹھے تھے۔ گیلانی صاحب نے اپنی کتاب کا اردو مسودہ میرے حوالے کیا تاکہ میں ارشد شریف کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کرنا شروع کروں۔

میں نے گیلانی صاحب سے مسودہ لیا اور ارشد شریف کے ساتھ جیل کی سلاخوں سے باہر آ گیا۔ میں نے ارشد شریف کو ساری بات بتائی کہ کیسے گیلانی صاحب ہمیں ہزار روپے [illegible] دے رہے تھے۔ ارشد شریف مسکرایا اور مذاق بولا پھر واپس کیوں کر دیے تھے؟ پیسوں کی بڑی ضرورت تھی۔

میرا اور ارشد کا خیال تھا کہ اس کتاب کو دو حصوں میں بانٹ کر اس کا ترجمہ کرنا شروع کرتے ہیں اور پھر اسے اکٹھے بیٹھ کر ایڈٹ کر لیں گے۔ ارشد شریف ان صحافیوں میں سے ہے جو ہر کام دل کے ساتھ کرتے ہیں اور بہت اچھا کرتے ہیں۔ ارشد شریف کا معمول اس وقت یہ مسودہ پڑھ کر [illegible] جب اس نے گیلانی صاحب کی اپنے خاندان کے بارے میں دی گئی چھوٹی چھوٹی معلومات کو پڑھا تو میں نے ارشد کو بتایا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اس کتاب کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کریں۔ ہمیں انگلش قاری کو ذہن میں رکھ کر اس کتاب کو لکھنا تھا جو گیلانی صاحب کے اس خاندان کے بارے میں [illegible] سے بات کر کے لکھ سکتے ہیں۔ میں نے گیلانی صاحب سے اگلی ملاقات پر یہ بات کی تو انہوں نے مجھے اس بات کی اجازت دی کہ ہم جیسے چاہیں اپنی سمجھ کے مطابق اس کتاب کو انگلش میں لکھ دیں۔

میں واپس آیا اور ارشد شریف سے بات کی تو میں نے محسوس کیا کہ ارشد شریف اس پراجیکٹ میں زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کر رہے تھے۔ میں نے ارشد کو سمجھانے کی کوشش کی کہ [illegible] پاکستان میں ہی ہم صحافی اس طرح کے کام نہیں کرتے تھے۔ دنیا بھر کے صحافی تحقیقات کر کے شاندار کتابیں چھاپتے تھے۔ میں نے ارشد سے کہا کہ اگر آج ہم نے گیلانی صاحب کی یہ کتاب انگلش میں کر لی تو نہ صرف ہمارے اپنے صحافیانہ کیریئر کو پروفیشنل فائدہ ہوگا بلکہ ہم اور بھی سیاستدانوں کی آپ بیتیاں لکھنے کا ایک نیا سلسلہ شروع کر سکتے ہیں۔ میں نے ارشد سے مذاق میں بھی کہا کہ کون جانتا ہے کہ کل کو یہ جیل میں بیٹھا یوسف رضا گیلانی اس ملک کا وزیر اعظم بن جائے اور ہم

اس کی سیاست اور ذات پر کبھی بھی کوئی گفتگو کرنے کے لیے ہم دونوں سے بہتر تبصرہ نگار اور کوئی نہیں ہوگا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ گیلانی صاحب واقعی وزیر اعظم بن گئے۔

میری یہ آخری کوشش بھی رائیگاں گئی کیونکہ اس کے بعد ارشد بالکل اس پراجیکٹ میں دلچسپی ختم کر گیا۔ اسی دوران میں پتہ چلا کہ ارشد کو برطانیہ میں ماسٹرز کرنے کے لیے ایک اسکالرشپ مل گئی ہے اور وہ کچھ دنوں بعد پاکستان چھوڑ گیا۔ یوں گیلانی صاحب کی یہ کتاب کبھی بھی انگریزی میں نہیں چھپ سکی اور اس کے ذمہ دار اور کوئی نہیں، میں اور ارشد شریف ہیں۔ گیلانی صاحب کی آپ شرافت دیکھیں کہ اتنے برسوں میں انہوں نے مجھے کبھی یاد تک بھی نہیں دلایا کہ میں نے ان سے ان کی کتاب کا انگریزی ترجمہ کرنے کا وعدہ کیا تھا اور کوئی وجہ بتائے بغیر آج تک اس پر کام نہیں کیا۔

اسی دوران میں ایک دن اس وقت کے وزیر داخلہ فیصل صالح حیات سے ملنے ان کے دفتر گیا۔ میں نے باتوں باتوں میں ان سے کہا کہ وہ بھی اپنی آپ بیتی لکھیں کیونکہ ان کی زندگی بھی بہت بھرپور گزری تھی کہ پڑھنے والوں کے لیے اس میں بہت کچھ ہو گا۔ میں نے ان سے یہاں تک کہا کہ اگر وہ چاہتے ہیں تو میں ان سے ساری داستان سن کر وہ کتاب لکھوں گا [illegible]۔ فیصل صالح حیات نے میری بات کو مذاق میں اڑا دیا [illegible] گیلانی بھی جیل میں کتاب لکھ رہے تھے [illegible] صالح حیات نے یہ کہا کہ [illegible] گیلانی کی کتاب بھی لکھی [illegible] رضا گیلانی کی طرح اپنی آپ بیتی لکھنی چاہیے۔

[illegible]

[illegible]

جب وزیر اعظم گیلانی نے اس بات کی وضاحت کی کہ یہ کتاب انہوں نے خود لکھی ہے اور [illegible]

[illegible]

یہ گیلانی صاحب کی اصل طرز ہے کہ انہوں نے قومی اسمبلی میں کھڑے ہو کر یہ کہا کہ روؤف کلاسرا ان کا دوست ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں لوگ یہ دعوے کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان کا دوست ہے چاہے اس نے کبھی انہیں مڑ کر بھی نہ دیکھا ہو۔ وزیراعظم گیلانی کا مجھے زیادہ دوست سمجھنا اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ میں نے ان کی حکومت اور ان کے خلاف بہت کچھ لکھا اور چھاپا ہے۔ ان کے قریبی لوگوں نے ان کے کان بھرنے کی کئی دفعہ کوشش کی۔ انہیں میرے خلاف بھڑکانے کے لیے کئی باتیں کی گئیں لیکن انہوں نے ہمیشہ یہ کہا کہ روؤف کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ صحافی ہونے کے ناطے جو لکھنا چاہے لکھے۔ وہ اس وقت میرے حق میں خبریں چھاپتا تھا جب جیل میں مجھ سے کوئی نہیں آتا تھا۔ آج وہ دراصل میرے خلاف نہیں بلکہ پاکستان کے وزیراعظم کے خلاف خبریں چھاپتا ہے۔

گیلانی صاحب ایک چیز پر بڑے واضح تھے کہ مجھ سے دوستی کے تمام تر دعووں کے باوجود انہوں نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ وہ سب صحافیوں کو بیرون ملک دوروں پر ساتھ لے کر جائیں گے لیکن مجھے نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ شاید میں ان سے عام صحافیوں کی طرح یہ کہوں گا کہ میرا نام بھی دوروں میں ڈالا جائے۔ شاید وہ بھول گئے تھے کہ اگر ہم غیر ملکی دورے کرنے والے صحافی ہوتے تو کیا ہم جنرل مشرف

[illegible]

○○○

جب گیلانی صاحب عدالت سے رہا ہوئے تو میں ان دنوں لندن میں تھا۔ یہ اگست 2006 کے دن تھے۔ بینظیر بھٹو نے لندن میں اپنی پارٹی کے لیڈروں کا اجلاس انہی دنوں رکھا ہوا تھا۔ مجھے ایک فون آیا۔ میں نے اٹھایا تو دوسری طرف لائن پر یوسف رضا گیلانی تھے۔ مجھے وہاں دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ لندن کیسے پہنچ گئے تھے۔ پتہ چلا کہ وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سات سال بعد پاکستان سے باہر جیل سے رہا ہونے کے بعد آئے ہیں۔ وہ ایجوئر روڈ کے قریب واقع ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں ان دنوں رسل اسکوائر میں رہتا تھا۔ میں ان سے ملنے گیا تو وہ ہوٹل کی لابی میں اپنے بچوں کے ساتھ گپ شپ کر رہے تھے۔ ایک خوبصورت فرانسیسی ویٹرس انہیں سرو کر رہی تھی۔ گیلانی صاحب کے اردگرد سب لوگ اس ویٹرس کو متاثر کرنے کے چکر میں تھے۔ گیلانی صاحب بھی اس کارخیر میں اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔ انہوں نے کسی کو اشارہ کیا کہ وہ اس ویٹرس کو ان کا پورا تعارف کرائیں تاکہ اسے متاثر کرنے میں آسانی رہے۔ اس بیچاری کو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں سمجھایا گیا کہ وہ پاکستان کے بہت بڑے سیاستدان سے بات چیت کر رہی ہے۔ گیلانی صاحب کی ذات کے بارے میں اسے اور بھی بہت کچھ بتایا جا رہا تھا۔ اب اس مذاق میں گیلانی صاحب کے بچے بھی شامل ہو گئے تھے۔ میں چپ بیٹھا رہا کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ یورپ کی ویٹرس کو بھلا پاکستان کی سیاست یا سیاستدانوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ وہ ویٹرس بہرحال پروفیشنل ضروریات کے تحت ایک ایک سے مسکرا کر ملتی

رہی تھی۔ مجھے پچھلی [illegible] کس کی ہوئی تھی کیونکہ گیلانی صاحب کے ساتھ ساتھ ان کا [illegible] عزیز بھی اس محفل میں شریک ہو گیا تھا۔ ہم سارے اس شخص کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہے [illegible] اب سوچتا ہوں کہ کیا اس وقت ان دونوں کو پتہ ہوگا کہ وہ کسی ایسے شخص کو سرو کر رہی تھی جو ایک دن [illegible] پاکستان کا وزیراعظم ہوگا۔

ابھی ہم وہاں بیٹھے ہی تھے کہ گیلانی صاحب نے مجھے بتایا کہ ان سے ملنے کے لیے آصف علی زرداری کے ایک بڑے قریبی دوست فیصل کی بٹ آ رہے ہیں۔ میں انہیں نہیں جانتا تھا۔ گیلانی صاحب کہنے لگے کہ وہ انہیں کھانے پر لے جانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی کہا کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں۔ میں نے محسوس کیا کہ گیلانی صاحب کچھ چپ چپ سے تھے۔ ان کی آج بینظیر بھٹو سے سات سال بعد پارٹی میٹنگ میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ شاید سمجھ رہے تھے کہ پارٹی کے لیے پانچ سال جیل میں رہنے کے بعد اور جنرل مشرف کی پیشکش ٹھکرانے کے بعد بینظیر بھٹو شاید انہیں بڑا پروٹوکول دیں گی۔ جو ہم میٹنگ میں بینظیر بھٹو نے یوسف رضا گیلانی کو شاید وہ پروٹوکول نہیں دیا جس کے وہ واقعی حقدار تھے۔ جب فیصل کی بٹ وہاں پہنچے تو میرا ان سے تعارف ہوا۔ انہوں نے بھی تھوڑی دیر بعد یہ بات محسوس کی کہ گیلانی صاحب کچھ بجھے بجھے سے تھے۔ فیصل بٹ بڑے سمجھدار نکلے۔ انہوں نے گیلانی صاحب کا موڈ بدلنے کے لیے اسی وقت اپنے موبائل فون سے آصف علی زرداری کو فون کیا جو اس وقت نیویارک میں تھے۔ انہوں نے یوسف رضا گیلانی کی آصف زرداری سے بات کرائی۔ فیصل بٹ زرداری صاحب کو اشارتاً بتا چکے تھے کہ گیلانی صاحب کا موڈ کچھ بہتر نہیں ہے۔ آصف زرداری کو احساس ہو گیا تھا کہ شاید لندن میں ہونے والی پارٹی میٹنگ میں ان کے جیل کے ساتھی کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کی وہ توقع کر رہے تھے۔ زرداری صاحب بڑی دیر تک گیلانی صاحب کے ساتھ ٹیلی فون پر باتیں کرتے رہے۔ اتنی دیر میں فیصل بٹ ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر کھانا کھلانے کے لیے ایک خوبصورت ترکش ریسٹورنٹ لے گئے۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن اس ریسٹورنٹ کے اندر مستی اور خوبصورتی ابھی جنم لے رہی تھی۔ میں گیلانی صاحب اور فیصل بٹ اس ریسٹورنٹ کے اندر ایک کونے والی محفل پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہاں عربی موسیقی کی دھنوں پر عربی لڑکیوں نے وہ رقص پیش کیا کہ ہم تینوں اپنی اپنی پریشانیاں بھول گئے اور ہمارے سامنے پڑی لذیذ ڈشیں بھی سانسوں کو گرمانے والے

اس ماحول میں کب کی ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔

○○○

اگلے دن بینظیر بھٹو نے شہباز پارٹی کی ایک اور میٹنگ بلائی ہوئی تھی۔ گیلانی صاحب نے مجھے کہا کہ میں اس میٹنگ کے بعد ایجوئے روڈ پر آ جاؤں۔ فارغ ہو کر وہاں بھی بات کریں گے۔ جب میں طے شدہ وقت پر وہاں پہنچا تو میٹنگ ختم ہو چکی تھی۔ میں اور گیلانی صاحب ایجوئے روڈ پر پیدل چلنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ آج ایک دفعہ پھر چپ چپ سے تھے۔ آگے ایک عربی کی دکان پر کھجوریں پڑی دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا اور میں نے گیلانی صاحب سے کہا کہ مجھے پہلے یہ کھجوریں خرید لینے دیں۔ ہم ابھی وہیں کھجوریں خرید رہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے آ کر انہیں زور سے پکڑ لیا۔ گیلانی صاحب بڑے حیران ہوئے کہ ایجوئے روڈ کی اس سرد شام میں بھلا ان کا کون جاننے والا اتنی بے تکلفی سے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ ہم دونوں نے مڑ کر دیکھا تو شہباز شریف وہاں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ گیلانی صاحب اور شہباز شریف آٹھ سال بعد ایجوئے روڈ پر یوں مل رہے تھے۔ دونوں بڑی دیر تک وفور حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دو تین منٹ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا۔ شہباز شریف ذرا سی جلدی میں تھے۔ وہ اجازت لے کر روانہ ہو گئے۔ تقدیر کی بھی اپنی ایک کہانی ہوتی ہے۔ ان دونوں نے بھلا یہ کب سوچا تھا کہ چھ ماہ بعد ان میں سے ایک ملک کا وزیراعظم اور دوسرا پنجاب کا وزیراعلیٰ بنے گا۔

میں نے اور گیلانی صاحب نے ایک مرتبہ پھر ایجوئے روڈ پر چلنا شروع کیا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ تمہیں پتہ ہے کہ ایک سیاستدان کتنے عرصے بعد اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ جب چاہے، جس وقت چاہے اور جہاں چاہے لوگوں کو استعمال کرنے کا فن سیکھ لیتا ہے۔

میں بڑا حیران ہوا کہ گیلانی صاحب بھلا یہ کس طرح کی بات مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ میں کیسے ان کے اس بیان کی تائید یا تردید کر سکتا تھا۔ خیر، میں نے بڑی سمجھداری سے ان کی بات سنی اور جواب دینے کی بجائے چپ رہنا مناسب سمجھا کیونکہ میرا تجربہ کہتا ہے کہ ایسے موقعوں پر جب کوئی شخص اس طرح کی بات کرے تو اس کا مطلب بڑا واضح ہوتا ہے کہ وہ خود ہی کوئی بات کرنے کے موڈ میں تھا لہٰذا اپنے آپ کو سمجھدار سمجھ کر بولنے کے بجائے بہتر ہے انتظار کر کے اس کی بات سنی جائے کہ آخر وہ

کے ہی میں گیا ہے۔

میرا پیپ، ہمارے حق میں بہتر نکلا کیونکہ گیلانی صاحب نے پھر اپنی ذات سے تعلق رکھنے والی ایک کہانی سنائی جس سے مجھے سیاستدانوں کے مزاج اور نفسیات کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوئی۔

گیلانی صاحب بولے کہ آج جب بینظیر بھٹو صاحبہ پارٹی کی میٹنگ کی صدارت کر رہی تھیں تو انہیں دیکھ کر پیر پگاڑا کی بائیس سال پہلے کی یہ بات یاد آ رہی تھی کہ ایک سیاستدان بیس سال بعد لوگوں کو استعمال کرنے کا فن سیکھ لیتا ہے۔ کامیاب سیاستدان بھی وہی ہوتا ہے جو دوسروں کو استعمال کرنے کا فن سیکھ لے ورنہ تو ساری عمر خود استعمال ہوتا رہے گا۔ گیلانی صاحب کا خیال تھا کہ بینظیر بھٹو اب اتنی بڑی سیاستدان بن چکی ہیں کہ آج انہیں محسوس ہوا کہ پیر پگاڑا کی یہ بات پکی تھی۔ وہ جس طرح پیچھے سے پارٹی کے لوگوں کو ڈیل کر رہی تھیں اس سے صاف واضح تھا کہ وہ نہ صرف سیاستدان کو سمجھتی تھیں بلکہ سیاستدانوں کو استعمال کرنے کے فن سے بھی اچھی طرح آشنا تھیں۔

میں بینظیر بھٹو کے بارے میں گیلانی صاحب کا تبصرہ بھول کر ان سے پوچھنے لگا کہ بھلا پیر پگاڑا نے ان سے یہ بات کیوں اور کب کی تھی اور اس کے پیچھے کیا کہانی تھی۔

یوسف رضا گیلانی نے اٹھتے اور پھر چلتے چلتے مجھے بائیس سال پہلے کی وہ کہانی سنائی جو انہیں آج بینظیر بھٹو کو دیکھ کر یاد آ گئی تھی۔

○○○

یوسف رضا گیلانی محمد خان جونیجو کی حکومت میں ایک نوجوان وزیر تھے۔ ان کو وزیر ریلوے بھی بنایا گیا تھا۔ وزیراعظم جونیجو اور پیر صاحب پگاڑا دونوں پنجاب کے وزیراعلیٰ نواز شریف سے نالاں تھے۔ دوسری طرف جنرل ضیاء الحق کو بھی یہ علم تھا کہ نواز شریف یہ سمجھتے تھے کہ وہ وزیراعلیٰ پنجاب اس لیے تھے کہ ان کو صوبائی اسمبلی کی اکثریت ان کے ساتھ تھی۔ یہ بات جنرل ضیاء سے منسوب کی جاتی تھی کہ نواز شریف یہ سمجھیں کہ وہ اپنی وجہ سے وزیراعلیٰ تھے نہ کہ جنرل ضیاء کی بدولت، تو جنرل ضیاء نے اپنی چال کی بات پیر پگاڑا کے سامنے رکھی۔ جنرل ضیاء کا دکھ سن کر پیر پگاڑا نے فرمایا کہ سائیں فکر نہ کریں، نواز شریف ٹھیک ہو جائیں گے۔ اگلے دن پیر پگاڑا نے یوسف رضا گیلانی کو بلایا اور انہیں کہا کہ آپ

پنجاب جائیں اور اپنے آپ کو وزیراعلیٰ پنجاب کے طور پر ممبران اسمبلی کے سامنے پیش کرنا شروع کریں اور اپنے ساتھ چند بڑے بڑے سیاسی لوگوں کو شامل کریں۔ گیلانی صاحب نے پیر پگاڑا کے کہنے پر پنجاب میں جا کر ڈیرے لگا دیے۔ وہ ان دنوں وزیر ریلوے تھے۔ ایئرپورٹ اور ریلوے اسٹیشن سے آتے جاتے پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے درجنوں اراکین اسمبلی نے ان کا استقبال کرنا شروع کر دیا۔ یہ خبر پھیل چکی تھی کہ وفاقی حکومت یوسف رضا گیلانی کو نیا وزیراعلیٰ بنانا چاہتی ہے۔ جب بات زیادہ پھیل گئی تو بڑے بڑے لوگوں نے ان سے خفیہ رابطے کرنا شروع کر دیے۔ ان میں نصر اللہ دریشک، عاشق گوپانگ، ملک اللہ یار کھنڈا، مخدوم الطاف، رفیق لغاری اور دیگر بے شمار ایم پی اے ان کے گروپ میں آ گئے۔ سب سے بڑی کامیابی اس وقت ہوئی جب چوہدری پرویز الٰہی نے ان سے رابطہ کیا۔ وہ نواز شریف کو چھوڑ کر ان کے ساتھ شامل ہونا چاہتے تھے۔ اور تو اور [illegible] کو بھی جب اس سارے معاملے کی بھنک ملی تو وہ بھی گیلانی صاحب سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ یوں بہت کم عرصے میں گیلانی صاحب نے ایم پی ایز کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

پیر پگاڑا صاحب کو پیغام بھیجا گیا کہ جناب اب آپ بتائیں کہ نیا وزیراعلیٰ کس کو بنانا ہے کیونکہ نواز شریف کے خلاف بغاوت ہو چکی ہے۔ پیر صاحب سیاست کے پرانے کھلاڑی تھے۔ انہوں نے نوجوان گیلانی کو کہا کہ انتظار کرو۔

گیلانی صاحب ابھی لاہور میں تھے اور اپنے تئیں اپنی مرضی کے وزیراعلیٰ کا منصوبہ بنا رہے تھے کہ پتہ چلا کہ نواز شریف جنرل ضیاء الحق سے ملنے کے لیے اسلام آباد تشریف لے گئے ہیں۔ نواز شریف کو احساس ہو گیا تھا کہ جنرل ضیاء سے معافی تلافی کیے بغیر ان کی وزارت اعلیٰ نہیں بچے گی۔ وہ جنرل صاحب سے ملنے گئے اور اپنی وفاداری کا نئے سرے سے حلف اٹھایا۔ جب جنرل ضیاء اور نواز شریف کی ملاقات ختم ہوئی تو جنرل ضیاء الحق نے ایک بیان جاری کیا کہ نواز شریف کا کلہ مضبوط ہے۔ وزیراعظم محمد خان جونیجو نے بھی یہ بیان دیا کہ پنجاب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ رہی سہی کسر پیر صاحب پگاڑا کے بیان نے پوری کر دی کہ نواز شریف کی جوڑی میں سوراخ تھا جس کی میں نے مرمت کر دی ہے۔ کھیل ختم ہو گیا تھا۔

جونہی یہ خبر لاہور پہنچی، سارے کے سارے ایم پی ایز تو غائب ہو کر بھاگ گئے۔ ایک ایک

احساس ہو گیا کہ انہیں استعمال کیا گیا تھا۔ اس سے زیادہ گیلانی صاحب کو احساس ہوا کہ مجھے جنرل ضیاء، محمد خان جونیجو اور پیر پگاڑا نے مل کر استعمال کیا تھا۔ میں بڑے دکھے دل کے ساتھ پیر پگاڑا صاحب سے ملنے گیا اور ان سے پوچھا کہ انہوں نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا تھا۔

وہ مسکرائے اور بولے بچہ یہ سب سیاست ہے۔ نواز شریف جنرل ضیاء کو آنکھیں دکھا رہا تھا۔ میں نے جنرل ضیاء سے کہا کہ ہم نواز شریف کو ٹھیک کر دیں گے۔ اب ہم نے ایک ایسے بندے کا انتخاب کرنا تھا جس کو استعمال کر کے نواز شریف کو سبق سکھایا جا سکتا۔ میری نظر تمہارے اوپر پڑی۔ تم نوجوان ہو۔ تمہاری ابھی سیاست میں پوری گرپ مضبوط نہیں ہے۔ ملتان کے ایک بڑے سیاسی گھرانے سے تمہارا تعلق ہے۔ دوسرے تم میرے رشتہ دار ہو لہٰذا تمہارے لیے ایم پی ایز کو یقین دلانا آسان تھا کہ وہ نواز شریف کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ مل جائیں۔ شکر ہے میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ تم نے مجھے مایوس نہیں کیا۔

گیلانی صاحب نے ٹوٹے دل کے ساتھ کہا کہ اس کا مطلب ہے آپ نے مجھے استعمال کیا ہے۔

پیر صاحب مسکرائے اور بولے جی ہاں میں نے آپ کو استعمال کیا ہے۔

ایک شکست خوردہ گیلانی نے سیاست کے گرو سے پوچھا کہ ایک سیاستدان کب اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ جب چاہے کسی کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔

پیر صاحب نے کہا، بیس سال بعد۔

○○○

اب سے دو دن پہلے ہوئے مجھے ایک لمحے میں یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ یوسف رضا گیلانی کے کہنے کا کیا مطلب تھا اور انہیں وزیر اعظم ہوتے ہوئے آج پارٹی کی میٹنگ میں کیوں پیر پگاڑا کا بیس سال پرانا فقرہ یاد آ گیا تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے گیلانی صاحب سے پوچھا کہ آپ کو سیاست میں کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔

میری بات کا مطلب سمجھ کر وہ مسکرائے اور بولے بیس سال ہو چکے ہیں۔ اب وہ کاروائی بھی کریں گے۔

لندن میں ہونے والی اس ملاقات کے ٹھیک سات ماہ بعد مارچ 2008ء کی ایک شام میں گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ یوسف رضا گیلانی گھر پر ایک کیک دے کر گئے تھے۔ وہ اپنے وزیر اعظم بننے کی خوشی میں تھا۔ یہ بھی ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ انہوں نے یہ بات یاد رکھی کہ جس دن وہ ملک کے وزیر اعظم بن رہے تھے اس صحافی کے گھر جا کر انہوں نے ایک وعدہ نبھایا تھا جو کہ ان سے جیل میں آ کر لیا تھا۔

○○○

جب گیلانی صاحب وزیر اعظم بنے تو ان کے لیے سب سے بڑا چیلنج ان کے وہ دوست تھے جو ان کے ساتھ ان پانچ سالوں میں جیل میں رہے تھے۔ وہ ایک بہت بڑے مخمصے کا شکار تھے۔ اگر وہ جیل کے دنوں کے ان دوستوں کو بھلاتے تو ان پر یہ الزامات لگتے کہ وہ ایک خود غرض انسان تھے جو اقتدار میں آتے ہی بدل گئے تھے لیکن اگر وہ انہیں اہمیت دیتے تو پھر ان کی اپنی بدنامی ہوتی تھی۔ اور بدنامی ہو کر رہی کیونکہ جیل کے دنوں کے ان ساتھیوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ وزیر اعظم کے ذاتی دوست ہیں۔ کسی نے کہیں پلاٹوں پر قبضہ کر لیا تو کسی نے چھوٹی کی کنسٹرکشن اپنے نام کرنی شروع کر دیں۔ کوئی ان کا نام استعمال کر کے ٹرانسفر پوسٹنگ کرانے لگ گیا تو کسی نے ٹھیکے لینے شروع کر دیے۔ جب مجھ تک اس طرح کی خبریں پہنچیں تو میں نے گیلانی صاحب کے خلاف دو درجن کی سٹوریاں فائل کیں۔ گیلانی صاحب کو پہلا دھچکا اس وقت لگا جب میں نے اپنے اخبار دی نیوز میں ایک خبر لگائی کہ جس دن ملتان میں پاور لوڈ شیڈنگ کے خلاف ہنگامے کر رہے تھے اور پورے شہر کو آگ لگی ہوئی تھی، اسی شام گیلانی صاحب اسلام آباد میں ملک ریاض کے گھر ایک بہت بڑی دعوت میں شریک تھے۔ ان کے نزدیک جلتے ہوئے ملتان جانے سے ملک ریاض کے گھر دعوت میں جانا زیادہ اہم تھا۔

پھر یہ خبر کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ میری اور گیلانی صاحب کی اتنی قربت رہی تھی اور میں بار بار ان کے خلاف اتنی بڑی خبر فائل کروں گا۔ مجھے بعد میں وزیر اعظم گیلانی کے پرنسپل سٹاف آفیسر خالد سلطان نے بتایا کہ جونہی صبح اس نے خبر پڑھی تو اس نے وزیر اعظم گیلانی کو فون کیا اور انہیں بتایا کہ

کے سب مشہور صحافی ایک چھت تلے اکٹھے تھے۔ اچانک ان سب کے سامنے "ایکسپریس" ٹی وی چینل کے اینکر پرسن راشد نے ان سے پوچھا کہ گیلانی صاحب اعتنا ہے کہ آپ نے لاہور و ملتان میں چار بڑے گھر خریدے ہیں۔ راشد کے سوال پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ پیسے کہاں سے آئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے پورے ہال میں ایک سناٹا چھا گیا۔ سب صحافیوں نے وزیراعظم گیلانی کی طرف دیکھنا شروع کیا کہ اب وہ کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ میں آپ کو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر یہ سوال شوکت عزیز، جنرل پرویز مشرف یا نواز شریف سے کیا جاتا تو انہوں نے اس رپورٹر کی زندگی حرام کر دینی تھی۔ گیلانی صاحب نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا کہ اگر خریدے ہیں تو چھپ کر نہیں خریدے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف دیکھ کر کہا کہ کسی اور نے کوئی سوال پوچھنا ہو تو پوچھ لے۔ یوں ایک لمحے میں انہوں نے اپنے خلاف ایک سکینڈل کو وہیں ختم کر دیا۔ انہوں نے اس کی کوئی لمبی چوڑی وضاحت دینا مناسب نہیں سمجھا اور اس کے بعد میں نے کبھی ان کے ان چار گھروں والا معاملہ اخبارات یا ٹیلی ویژن چینلز پر نہ کبھی پڑھا اور نہ سنا۔

گیلانی صاحب سے پوچھے گئے اس سوال کا موازنہ اب نواز شریف سے جولائی 2010ء کے پہلے ہفتے میں لاہور کے ایک صحافی کی جانب سے پوچھے گئے سوال کے جواب میں دکھائے گئے شدید ردعمل سے کریں۔ داتا دربار پر ہونے والے خودکش حملوں کے حوالے سے ایک رپورٹر نے جرأت کر کے صرف اتنا پوچھ لیا کہ میاں صاحب! آپ کی سیکیورٹی پر سینکڑوں کی تعداد میں پنجاب پولیس کے لوگ تعینات ہیں۔ یہ سن کر میاں صاحب بھڑک اٹھے اور انہوں نے رپورٹر کو غصے میں جواب دیا کہ آپ نے مجھ سے کس طرح کا سوال پوچھا ہے۔ میاں صاحب نے فوری طور پر اس سوال کو یہ کہہ کر مسترد کیا کہ صحافی نے ان کی ذاتیات پر حملہ کیا ہے۔ آپ تصور کریں کہ اگر ہمارے صحافی دوست راشد میاں صاحب سے اسی طرح کا کوئی سوال پوچھ لیتے جیسا انہوں نے یوسف رضا گیلانی صاحب سے پوچھا تھا تو کیا ردعمل ہوتا۔

ممکن ہے کہ گیلانی صاحب نے یہ سوچ لیا ہو کہ عوام اور میڈیا کچھ بھی کہتے رہیں، وہ وہی کچھ کرتے رہیں گے جو ان کے سیاسی مفاد میں ہے۔ ایک بات طے ہے کہ گیلانی صاحب اس پائے کے لیڈر نہیں ہیں جس کی ملک کو ان مشکل وقتوں میں ضرورت ہے۔ وہ شریف اور مروت بھرے انسان ضرور ہیں لیکن قابل نہیں۔ مجھے ان کی جو بات اچھی لگتی ہے وہ ان کی قوت برداشت ہے جس کو صحافی ہونے کے

ناطے میں [illegible] کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں لیکن اب تک ناکام رہا ہوں [illegible]

گیلانی صاحب قوم کی قسمت بدلنے والے بھی ہیں وہ والے بھی لیکن بدقسمتی سے ان کی [illegible] ہیں اور دو شخصوں کی قسمت ضرور بدل دی ہے۔ اس سے زیادہ شاید گیلانی صاحب کو نہ [illegible] ہے اور نہ ہی طلب!!

ذوالفقار علی بھٹو

انٹرویو: اوریانا فلاچی

میں وہ دعوت نامہ دیکھ کر بڑی حیران ہوئی تھی۔ یہ دعوت ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے تھی۔ میرے پاس کوئی بہانہ بھی نہیں تھا کہ میں اسے مسترد کرتی۔ مجھے صرف اتنا کہا گیا تھا کہ جتنا جلدی ممکن ہو میں راولپنڈی پہنچ جاؤں۔ میں حیران ہوئی کہ اتنی جلدی کیوں؟ یہ بات درست ہے کہ ہر صحافی کی زندگی میں یہ بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اسے ایک دفعہ وہ لوگ خود دعوت دے کر ملنے کی خواہش کا اظہار کریں جو اس وقت آپ سے ملنے سے انکاری ہوتے ہیں جب آپ کو ان کی ضرورت پڑتی ہے۔

میرے ذہن میں مختلف باتیں آنے لگیں۔ بھٹو صاحب مجھ سے کیوں ملنا چاہ رہے تھے۔ کیا وہ مجھے اندرا گاندھی کے نام کوئی پیغام دے کر بھارت بھیجنا چاہتے تھے۔ میں نے اپنے یہ مفروضے خود ہی مسترد کر دیے۔ بھٹو صاحب کو اپنے دشمن کے ساتھ رابطہ کرنے کے لیے مجھ جیسی صحافی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یہ کام سوئس اور روسی سفارتکاروں کے ذریعے بخوبی سرانجام دے سکتے تھے۔ میرے ذہن میں ایک اور بات آئی لیکن وہ بھی میں نے فوری طور پر مسترد کر دی کیونکہ بھٹو صاحب ایک تہذیب یافتہ شخص ہیں اور ایسے لوگ اپنے مہمانوں کو بلا کر قتل نہیں کرتے۔ ایک اور خیال آیا کہ شاید مجھے بلا کر اپنا انٹرویو دینا چاہ رہے ہوں اور یوں ایک طرح کا سرپرائز میرا انتظار کر رہا تھا۔ شاید یہی بات بھٹو صاحب کے

[illegible] تھی۔ بھٹو صاحب سے انہوں نے بنگلہ دیش کے بانی صدر مجیب الرحمٰن کے بارے میں [illegible] پڑھا تھا۔

پھر میرا تجسس میرے شک پر حاوی ہو گیا اور میں نے بھٹو صاحب کی یہ دعوت قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم یہ دعوت قبول کرنے سے پہلے میں نے یہ بات ان پر واضح کر دی کہ ان سے ملاقات کا یہ مطلب نہیں ہو گا کہ میں مکمل طور پر ان کے بارے میں جو چاہوں وہ نہیں لکھوں گی۔ میں جیسے ان کے بارے میں اپنی مرضی کا تاثر رکھتی ہوں اسی طرح میں ان کے بارے میں بھی لکھوں گی چاہے وہ مجھے آداب ہوں یا معمولی خوشامد، مجھے کوئی پرواہ نہیں ہو گی۔

بھٹو صاحب کا جواب آیا کہ پہنچیں آپ کا جو جی چاہے وہی لکھیے گا۔

یہ تھا بھٹو صاحب کے بارے میں پہلا تاثر۔

بھٹو صاحب ایک ایسے شخص ہیں جن کے بارے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کی جا سکتی۔ وہ بڑی تیزی سے اپنا ذہن بدلتے رہتے ہیں۔ ایک عجیب و غریب شخص ہیں جو اسی طرح کے فیصلے کرتے ہیں۔ تاہم یہ بات ماننی پڑے گی کہ وہ بہت ذہین شخص ہیں۔ وہ ایک لومڑی کی طرح بہت چالاک، لوگوں کو اپنی خوبصورتی سے متاثر کرنے والے یا انہیں کنفیوژ کرنے والے ہیں۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ ان میں آپ کو ایک مچور دانائی اور گہری یادداشت کی جھلکیاں بھی نظر آئیں گی۔

جب میں راولپنڈی ایئرپورٹ پر اتری تو دو افسران نے مجھے ریسیو کیا۔ دونوں نے بڑے جذباتی انداز میں مجھے بتایا کہ صدر پاکستان ایک گھنٹے کے اندر اندر ان سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ اس وقت پاکستان میں صبح کے دس بج رہے تھے اور میں پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے نہیں سو پائی تھی۔

میں نے ان دونوں افسروں کو بتایا کہ ایک گھنٹے کے اندر ہرگز ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ اس وقت مجھے ایک اچھے باتھ اور نیند کی ضرورت ہے۔

شاید یہ بات اگر کسی اور صدر کے لیے مجھ جیسی صحافی نے کی ہوتی تو وہ شاید ان کے لیے بہت بڑی توہین ہوتی لیکن بھٹو صاحب نے اس بات کا برا نہیں منایا۔ انہوں نے اس ملاقات کو شام ساڑھے سات بجے تک یہ کہہ کر ملتوی کر دیا کہ وہ رات کو کھانے پر میرا انتظار کریں گے۔

جب میں شام کو بھٹو صاحب سے ملنے گئی تو بھٹو صاحب نے کھلے بازوؤں اور مسکراتے چہرے

کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ میرے سامنے ایک ایسا دراز قد شخص کھڑا تھا جو مجھے ایک ایسے ڈاکٹر کی طرح لگا جو آپ سے اپنے بینک میں اکاؤنٹ کھلوانا چاہتا ہو۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ان کی عمر چوالیس سال ہے لیکن مجھے وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑے لگے۔ ان کے سر کے بال جھڑنا شروع ہو چکے تھے اور جو باقی بچ گئے تھے وہ بھورے تھے۔ ان کی گہری پلکوں کے پیچھے ان کا چہرہ گول، ہونٹ، حتی کہ آنکھوں کی پتلیاں بھی مجھے بھاری لگ رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں بھٹو صاحب کی آنکھوں میں مجھے ایک عجیب سی اداسی نظر آئی۔ ان کی مسکراہٹ میں بھی ایک عجیب سا شرمیلا پن تھا۔

بہت سارے طاقتور لیڈروں کی طرح بھٹو صاحب میں بھی بہت زیادہ شرمیلا پن ہے۔ ان میں اور بھی بہت ساری ایسی باتیں ہیں جو آپ کو اندرا گاندھی میں بھی نظر آتی ہیں۔ آپ بھٹو صاحب کو جتنا بھی پڑھتے جائیں گے آپ اتنے ہی زیادہ کنفیوژ اور غیر یقینی نتائج اخذ کرتے جائیں گے۔ آپ بھٹو صاحب کو کئی طریقوں سے دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ آپ جس طریقے سے بھی دیکھیں گے وہی آپ کو درست لگے گا۔ بھٹو صاحب آپ کو ایک لبرل، ایک سخت گیر حکمران، فاشسٹ، کمیونسٹ، ایک انتہائی مخلص اور ایک جھوٹے شخص بھی لگیں گے۔ مجھے یہ کہنے میں حرج نہیں ہے کہ بھٹو صاحب ہمارے وقت کے سب سے زیادہ مشکل لیڈر ہیں۔ اگر پاکستان نے آج تک کوئی انتہائی دلچسپ چیز پیدا کی ہے تو وہ خود بھٹو صاحب ہیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اگر اس وقت کوئی بھی پاکستان کو محفوظ رکھ سکتا ہے تو وہ بھٹو صاحب ہیں۔ آپ کو یہ بات ہر کوئی بتائے گا کہ بھٹو صاحب کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ اگر بھٹو نہ رہا تو پاکستان بھی دنیا کے نقشے سے مٹ جائے گا۔

جب آپ یہ بات سوچتے ہیں تو پھر آپ کے ذہن میں اندرا گاندھی کی بجائے اردن کے شاہ حسین کا خیال آتا ہے۔ شاہ حسین کی طرح بھٹو صاحب پر بھی یہ الزام لگتا ہے کہ وہ ایک ایسی قوم کی قیادت کر رہے ہیں جو مصنوعی طریقے سے وجود میں آئی ہے۔ وہ بھی شاہ حسین کی طرح سوویت یونین، انڈیا، چائنا اور امریکہ کے درمیان ایک سینڈوچ بنے ہوئے ہیں۔ شاہ حسین کی طرح وہ اس بات پر اتنے بضد ہیں کہ وہ کسی کے آگے نہیں جھکیں گے۔ اس کے ساتھ آپ کو یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ شاید وہ امریکی صدر جان کینیڈی کی طرح ہیں۔ وہ ایک ایسے دولت مند گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں کوئی بھی شخص یقین رکھتا ہے کہ آپ سیاسی طاقت بھی حاصل کر سکتے ہیں چاہے اس پر کتنی ہی قیمت کیوں نہ صرف

وہ کینیڈی ہی کی طرح بھٹو صاحب نے بھی بڑا خوبصورت، آرام دہ ماحول اور بڑا اچھا بچپن گزارا۔ جب جان کینیڈی کی طرح ہی وہ اقتدار کی غلام گردشوں میں اوائل عمری میں ہی داخل ہو گئے تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بھٹو صاحب جاگیرداروں اور اشرافیہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے پہلے برکلے اور پھر آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی جہاں انہوں نے انٹرنیشنل لاء میں ڈگری لی۔ ابھی ان کی عمر تیس برس سے کچھ ہی زیادہ ہوئی تھی کہ وہ ایوب خان کی کابینہ کے وزیر بن چکے تھے مگر وہ ان سے شدید نفرت کرتے تھے۔ ابھی چالیس سال کی عمر پوری ہونے میں کچھ عرصہ باقی تھا کہ وہ جنرل یحییٰ خان کے وزیر بن چکے تھے اور ان سے بھی وہ نفرت کرتے تھے۔ بھٹو صاحب بہت تکلیف دہ صبر کے مراحل سے گزرنے کے بعد ایوان صدر میں براجمان ہوئے۔

طاقت محبت سے زیادہ بڑا جذبہ ہے اور جو لوگ طاقت سے محبت کرتے ہیں ان کے نہ صرف معدے بلکہ ناک بھی طاقتور ہوتے ہیں۔ انہیں بڑی خوشبوئیں تنگ نہیں کرتیں۔ بھٹو صاحب نے بھی اس طرح کی بڑی خوشبوؤں کو ناپسند نہیں کیا کیونکہ بھٹو صاحب کو بھی طاقت سے پیار ہے۔ تاہم جس طرح کے پاور سے وہ پیار کرتے ہیں اس کے بارے میں اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ وہ خود بھی اس بات کا جواب انتہائی مبہم انداز میں دیتے ہیں۔ وہ ان سیاستدانوں کے بارے میں آپ کو پہلے سے ہی خبردار کر دیتے ہیں جو سچ بولتے ہیں یا ایک بوائے اسکاؤٹ مورالٹی کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ جب آپ بھٹو صاحب کو سن رہے ہوتے ہیں تو آپ تقریباً اس بات پر یقین کرنا شروع ہو جاتے ہیں کہ شاید ان کی خواہشات بہت اچھی ہیں اور وہ یقیناً ایک اچھا سوشلزم پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم جب آپ کراچی میں ان کی شاندار لائبریری میں داخل ہوتے ہیں تو آپ پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مسولینی اور ہٹلر جیسے فاشسٹ لیڈروں کی کتابوں کو کتنے احترام کے ساتھ سنہری جلدوں میں رکھا گیا ہے۔ جتنی نفاست سے مسولینی اور ہٹلر کی کتابوں کو وہاں لائبریری میں رکھا گیا ہے تو آپ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ کتابیں محض اس وجہ سے وہاں نہیں رکھی گئیں کہ اس لائبریری کا مالک انہیں ایک الماری میں رکھنا چاہتا تھا۔ آپ کے اندر شک اور غصہ ابھرنا شروع ہو جاتا ہے۔ آپ بھٹو صاحب سے پوچھتے ہیں تو آپ کو پتہ چلتا ہے کہ ان کے [illegible] اور عمر [illegible] آپ کو ایک عجیب سی اذیت ہوتی ہے۔ کیا بھٹو صاحب نے کوئی عجیب خواب دیکھ رکھا ہے کہ وہ ایک دن ڈکٹیٹر بن جائیں گے

[illegible]

[illegible] بھٹو صاحب [illegible] مجھے انٹرویو [illegible] ایک [illegible] انٹرویو لیے تھے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کو بھی [illegible] مملکت کو تباہ نہیں کر سکتے اگر آپ اس کے اندر صرف ایک انسان حائل [illegible] آپ کو اس کے اندر ایک آدمی [illegible] کیونکہ اس لیے آپ [illegible] انصاف [illegible] ہے کہ وہ بھی محض ایک آدمی ہی ہے جس کے اندر آپ کی طرح کی خوبیاں اور خامیاں ہیں تو پھر [illegible] آپ اس [illegible] مملکت کو [illegible] کر لیتے ہیں اور باقی باتیں بھول جاتے ہیں۔

○○○

بھٹو صاحب کے اس انٹرویو کے چھپنے کی دیر تھی کہ ایک نیا شور شرابہ شروع ہو گیا۔ یہ ہنگامہ محض صحافیانہ انداز کا نہیں تھا جیسے کہ امریکی وزیر خارجہ ہنری کیسنجر کے سلسلے میں کھڑا ہو گیا تھا بلکہ اس کی نوعیت سفارتی اور عالمی بھی تھی۔ جیسے بھٹو صاحب اندرا گاندھی کے انٹرویو میں اپنے بارے میں ان کا یہ تبصرہ پڑھ کر بڑے غصے میں آ گئے تھے کہ وہ ایک غیر متوازن شخص ہیں۔ اسی طرح اندرا گاندھی بھی بھٹو صاحب کا یہ فقرہ پڑھ کر بہت ناراض ہوئیں جب انہوں نے مسز گاندھی کو ایک ایسی درمیانی ذہانت کی عورت قرار دیا جس میں کوئی خاص خوبی نہیں تھی اور سب سے بڑھ کر اپنے والد نہرو کے مقابلے میں اس میں آدھی خوبیاں بھی نہیں تھیں۔ بھٹو صاحب کا یہ بھی کہنا تھا کہ اندرا گاندھی سے ملنا اور ہاتھ ملانے کے بارے میں سوچ کر انہیں ہمیشہ ایک چڑ سی رہتی تھی۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اندرا گاندھی کا بھٹو صاحب کے ایک تبصرے سے ناراض ہونا واقعی درست تھا کیونکہ میرے خیال میں بھٹو صاحب نے وہ تبصرہ مسز گاندھی سے اپنی نفرت کی بنیاد پر کیا تھا نہ کہ انہوں نے انصاف کے تقاضوں سے کام لیا تھا۔ مجھے خود بھی بھٹو صاحب کی یہ بات سن کر خاصی

[illegible] انہیں [illegible] کی کوشش بھی کی تھی [illegible] جنگ کے دوران [illegible] کے لیے [illegible] لے گئے تھے۔ [illegible] انٹرویو [illegible] کے ساتھ چھپا تو اندرا گاندھی [illegible] بھٹو صاحب کا یہ انٹرویو [illegible] پھٹ گئیں۔ انہوں نے اس [illegible] کا اظہار کیا کہ وہ بھٹو صاحب کا یہ پورا انٹرویو پڑھنا چاہتی ہیں اور انہوں نے روم سے خصوصی طور پر اس انٹرویو کا سارا ٹیکسٹ منگوایا۔ بھٹو صاحب کا یہ سارا انٹرویو پڑھنے کے بعد اندرا گاندھی نے یہ اعلان کیا کہ اب وہ پاکستان کے وزیراعظم سے ملاقات نہیں کریں گی۔ یہاں بھٹو صاحب مزید غصے میں آ گئے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنا غصہ کس پر نکالیں۔ آخر انہوں نے اپنی توپوں کا رخ میری طرف کر لیا۔ انہوں نے ایک دفعہ پھر اٹلی میں پاکستانی سفیر کے ذریعے مجھے طلب کیا۔ بھٹو صاحب نے مجھے ادیس ابابا (شہر کا نام) میں ڈھونڈ نکالا جہاں میں ایک اور انٹرویو کرنے گئی ہوئی تھی۔ اس سفیر نے مجھ سے بہت غیر معمولی درخواست کی۔ وہ بولے کہ میں ایک دوسرا آرٹیکل لکھوں جس میں میں یہ کہوں کہ میں نے کبھی بھٹو صاحب کا انٹرویو نہیں کیا تھا۔ یہ محض ایک خواب تھا اور اسی کی بنیاد پر میں نے وہ سب کچھ لکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں یہ لکھوں کہ اندرا گاندھی کے بارے میں انہوں نے کوئی رائے نہیں دی تھی بلکہ یہ رائے میرے اپنے خیالات کی پیداوار تھی۔

پہلے تو مجھے بھٹو صاحب کی بھیجی ہوئی یہ فرمائش کی سمجھ نہیں آئی۔

میں نے پاکستانی سفیر سے کہا کہ آپ نے کیا کہا؟

وہ بولے کہ میں آپ سے یہ درخواست کر رہا ہوں کہ آپ ایک نیا کالم لکھیں اور اس میں یہ لکھیں کہ یہ سارا انٹرویو آپ کی اپنی ذہنی تخلیق تھا، خصوصاً جو کچھ مسز گاندھی کے بارے میں لکھا گیا تھا۔

میں چلائی کہ آپ لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ آپ لوگوں کا وزیراعظم بھی پاگل ہو گیا ہے۔

پاکستانی میجر نے کہا کہ مس فلاسی! آپ یہ بات سمجھنے کی کوشش کریں کہ ساٹھ کروڑ لوگوں کی زندگیوں کا انحصار آپ پر ہے۔ ان کی زندگی اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔

میں نے اس پر لعنت بھیجی اور کہا کہ بھاڑ میں جاؤ۔

بہرحال، بھٹو صاحب نے ہمت نہیں ہاری اور وہ میرے پیچھے لگے رہے۔ میں جہاں بھی جاتی تو میرے پیچھے کوئی نہ کوئی اہم پاکستانی تعاقب میں لگا رہتا جس کا کام ایک ہی تھا کہ وہ مجھ سے ایک ہی درخواست کرے کہ میں بھٹو صاحب کے اس انٹرویو کی تردید کروں۔ یہ پاکستانی مجھے یہ بات یاد دلانا نہ بھولتے کہ ساٹھ کروڑ لوگوں کی زندگیاں میرے ہاتھوں میں تھیں۔

آخر تنگ آ کر میں نے ایک دن جواب دیا کہ میرے ہاتھ اتنے بڑے نہیں ہیں کہ میں ساٹھ کروڑ لوگوں کو اپنی دو ہتھیلیوں میں تھام سکوں۔ میں نے اس پر بھی بس نہیں کی بلکہ ان پر چلائی کہ ان کا مطالبہ نہ صرف احمقانہ ہے بلکہ میری توہین کے بھی مترادف ہے۔

آخر میرے سر سے اس وقت یہ عذاب اترا جب اندرا گاندھی نے بہت بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھٹو صاحب سے امن معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اندرا گاندھی نے اس طرح کا اظہار کیا جیسے بھٹو صاحب نے ان کے بارے میں اتنے توہین آمیز بیانات کبھی دیے ہی نہیں تھے۔

جب میں نے ان دونوں کو ٹیلی ویژن کیمروں پر ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے اور مسکراہٹیں تبدیل کرتے دیکھا تو میں نے [illegible] انجوائے کیا۔ اندرا گاندھی کی مسکراہٹ میں فاتحانہ پن صاف نظر آ رہا تھا۔ ان کی اس مسکراہٹ میں [illegible] تھی۔ بھٹو صاحب کی حالت دیکھنے والی تھی۔ ایک پی ٹی وی کی بلیک اینڈ وائٹ سکرین پر بھی آپ ان کی شرمندگی کو واضح محسوس کر سکتے تھے۔

○○○

بھٹو صاحب [illegible] آپ سے ملنے کا بہت زیادہ خواہاں تھا۔ [illegible] آپ دو [illegible] شیخ مجیب الرحمٰن کے بارے میں [illegible] لکھا ہے۔ مجھے آپ کا وہ مضمون [illegible]

میں بڑی حیران ہوئی اور بولی جناب صدر! آپ کیا کہہ رہے ہیں کہ شاید آپ کو معلوم نہیں تھا۔ ڈھاکہ میں تو سارے لوگ سڑکوں پر آ کر یہی بات کر رہے تھے کہ یہ آپ ہی تھے جو وہاں قتل عام چاہتے تھے۔ آپ شیخ مجیب کو گرفتار کرانا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے آپ 25 مارچ کی صبح تک ڈھاکہ میں موجود بھی رہے۔

بھٹو صاحب طنزیہ انداز میں بولے ہاں، شاید میں ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کے آخری فلور پر واقع اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے قتل عام کے اس منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہاں رکا ہوا تھا اور ہاتھ میں وہسکی کا گلاس لیے شاید میں نیرو بادشاہ کی طرح بانسری بجا رہا تھا۔

بھٹو صاحب بولتے رہے۔ انہوں نے کیسے یہ جرأت کی کہ وہ اتنے بڑے وحشیانہ اور احمقانہ انداز میں کیے گئے قتل عام کا بوجھ میرے کندھوں پر ڈالیں۔ یہ سارا کام انتہائی احمقانہ طریقے سے کیا گیا تھا۔ انہوں نے تمام لیڈروں کو بھارت فرار ہونے کا موقع دیا اور پھر اپنا سارا غصہ اس غریب عوام پر اتارا جن کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ صرف شیخ مجیب کو گرفتار کیا گیا۔ ہمیں تھوڑی سی عقل سے کام لینا چاہیے۔ اگر یہ کام میں کرتا تو میں اسے زیادہ سمجھداری، تھوڑے وحشیانہ پن اور زیادہ سائنسی انداز میں کرتا۔ میں ان پر آنسو گیس اور ربڑ کی گولیاں چلا کر ان کے تمام لیڈروں کو گرفتار کرتا۔ اس طرح کا کام جیسا کہ ڈھاکہ میں کیا گیا، یہ ایک انتہائی احمق اور شرابی سابق صدر یحییٰ خان ہی کر سکتا تھا جس نے انتہائی بھونڈے طریقے سے اتنا بڑا فوجی آپریشن کیا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں پاگل پن کے اس مظاہرے سے بھلا کیا نتیجہ حاصل کر سکتا تھا۔ آپ کو اس بات کا پتہ ہے کہ یحییٰ خان کا پہلا شکار شیخ مجیب کے بجائے میں خود ہوتا۔ میری پارٹی کے بہت سارے لوگ اس وقت جیلوں میں تھے۔ 1970ء کے آخر کی بات ہے جس میں آپ کو تاریخ بتاؤں 15 دسمبر 1970ء کا دن تھا۔ جنرل یحییٰ نے مجیب سے کہا "کیا میں بھٹو کو گرفتار کروں یا نہیں؟" جنرل یحییٰ نے یہ فیصلہ صرف اس وجہ سے تبدیل کیا اور مجھے گرفتار نہیں کیا کیونکہ اسے پتہ تھا کہ وہ مغربی پاکستان میں میری گرفتاری سے پیدا ہونے والی صورتحال کو شاید اس طرح نہ سنبھال سکے جیسے کہ وہ مشرقی پاکستان میں سنبھال سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجیب الرحمٰن کبھی بھی [illegible] نہیں تھا۔ اس [illegible] یحییٰ خان کے ہاتھوں [illegible] ہوا تھا۔

بہت سارے لوگوں کا قتل بھی کروایا تھا۔ ہمارے ملک کو بھی بہت سارے لوگوں کو مارنے کے لیے طاقت کا استعمال کرنا پڑا تھا۔ میں آپ کو صرف دو واقعات بتا رہا ہوں۔ میں پوری انسانی تاریخ میں سے دو مثالیں نہیں ڈھونڈ رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اوقات حالات ایسے ہو جاتے ہیں جہاں آپ طاقت کے فوری استعمال کا جواز ڈھونڈ سکتے ہیں اور اس کا جواز بھی قائل کر سکتے ہیں۔ مارچ کے مہینے میں پاکستان کے اتحاد کا انحصار ان علیحدگی پسندوں کو کچلنے پر تھا لیکن میرے خیال میں طاقت کا فوری استعمال کا جواز عام لوگوں پر کیا گیا نہ کہ ان لیڈروں پر جو اس کے ذمہ دار تھے۔ اس طرح کے وحشیانہ پن کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ یہ کوئی طریقہ نہیں تھا کہ آپ غریب لوگوں کو اس طریقے سے قائل کرنے کی کوشش کریں جنہیں یہ بتایا گیا ہو کہ شیخ مجیب کے چھ نکاتی پروگرام سے نہ تو سمندری طوفان آئیں گے نہ سیلاب اور نہ ہی کوئی بھوک سے مرے گا۔ میں تو خود اس طرح کے ہتھکنڈوں کے خلاف اس وقت پورے ارادے سے بولا تھا جب کسی کو بات کرنے کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی۔

میں آگے سے بولی بھٹو صاحب اچھا ہے کچھ بھی ہو کیا آپ نے اسی جنرل ٹکا کو اپنا آرمی چیف نہیں بنایا جس نے بنگالیوں کے ڈھاکہ میں قتل عام کا حکم دیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟

بھٹو صاحب بولے ٹکا خان ایک فوجی تھا اور وہ اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا۔ اسے ایک حکم کے ذریعے مشرقی پاکستان بھیجا گیا تھا اور دوسرے حکم کے تحت اسے واپس بلایا گیا تھا۔ اس نے وہی کچھ کیا جس کا اسے حکم دیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ اس طرح کے احکامات سے ہر وقت مطمئن نہیں تھا۔ میں نے اسے اس لیے آرمی چیف بنایا کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ وہ اسی ڈسپلن کے ساتھ میرے آرڈرز مانے گا۔ وہ سیاست میں دخل دینے کی کوشش نہیں کرے گا۔ میں پوری پاکستان آرمی تباہ نہیں کر سکتا اور ویسے بھی میں آپ کو بتاتا چلوں کہ ڈھاکہ میں ہونے والے واقعات کے حوالے سے اس کی ریپوٹیشن کے بارے میں باتیں بڑھا چڑھا کر بیان کی جاتی رہی ہیں۔ ان تمام واقعات کا ذمہ دار صرف ایک ہی شخص ہے جس کا نام یحییٰ خان ہے۔ یحییٰ خان اور اس کے مشیر جب طاقت اور کرپشن کے نشے میں چور تھے وہ یہ بھی بھول گئے کہ فوج کی بھی کوئی عزت تھی۔ انہیں خوبصورت کاریں، خوبصورت گھر تعمیر کرنے، بینکرز سے دوستیاں کرنے اور پیسہ کما کر بیرون ملک بھیجنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا۔ یحییٰ خان ملک کی حکومت میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اسے اگر کسی چیز میں دلچسپی تھی تو وہ اپنے لیے طاقت حاصل کرنے میں تھی اور کچھ نہیں! آپ

اس شخص کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جو نیند سے اٹھتے ہی صبح سویرے شراب پینا شروع کر دے اور اس کی یہ حالت ہو کہ جب رات گئے وہ بالکل دھت ہو جائے۔ آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ یحییٰ خان کے ساتھ ان کے لیے قتل معمول کا کام تھا۔ He was really Jack the Ripper.

میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ آج کل جنرل یحییٰ خان کہاں ہے اور اب آپ ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟

بھٹو صاحب بولے وہ راولپنڈی میں واقع اپنے گھر میں قید ہیں۔ وہ بنگلہ جس میں انہیں رکھا گیا ہے وہ سرکاری ہے۔ میں نے ایک وار کمیشن بنا لیا ہے (حمود الرحمٰن کمیشن) جو اس مشرقی پاکستان کے سانحے کی ساری تحقیقات کر رہا ہے۔ میں اس کمیشن کی رپورٹ کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس رپورٹ سے ہی فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔ اگر کمیشن نے اسے مجرم قرار دیا تو میرا خیال ہے کہ پھر یحییٰ خان کا ٹرائل ہو گا۔ ساری شکست کی ذمہ داری جنرل یحییٰ خان پر آتی ہے۔ اندرا گاندھی اس بات پر بالکل صحیح اکڑ رہی ہیں کہ انہوں نے ایک جنگ جیتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اگر انہوں نے یہ جنگ جیتی ہے تو پھر سب سے پہلے مسز گاندھی کو جنرل یحییٰ خان اور اس کے جاہل خوشامدیوں کے ٹولے کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ یحییٰ خان سے عقل کی بات کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور بندہ بات سمجھاتے سمجھاتے غصے میں آ جاتا ہے۔

25 مارچ کو ڈھاکہ میں قتل عام کے بعد اپریل کے مہینے میں یحییٰ خان نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا۔ اس وقت وہ بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اسے اس چیز کا یقین تھا کہ اب صورتحال پوری طرح قابو میں تھی۔ یحییٰ خان نے مجھے شراب کا گلاس پیش کیا اور بولا "تم سیاستدان تو ختم ہو کر رہ گئے ہو۔"

جنرل بولا نہ صرف مجیب بلکہ بھٹو صاحب آپ بھی ان لیڈروں میں شمار ہوتے ہیں جو بہت بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے اور پاکستان کی سلامتی کے خلاف تقریریں کر رہے تھے۔

یحییٰ خان بولے "بھٹو تمہیں پتہ ہے میرے اوپر تمہیں گرفتار کرنے کے لیے ہمیشہ پریشر رہتا ہے۔"

یحییٰ خان کی یہ بات سن کر میرا پارہ چڑھ گیا اور میں نے اسے جواب دیا کہ وہ اس طرح کی باتیں کر کے مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتا تھا اور اس کے انہی ہتھکنڈوں کی وجہ سے ہم تباہی کے دہانے پر

کمرے سے نکلے۔ میں نے وہسکی کا گلاس وہیں چھوڑا اور اس کمرے سے نکل گیا۔ باہر نکلا تو مجھے جنرل [illegible] نے روک لیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر کہنے لگا:

"No. Come on, calm down, have a seat, go back in."

میں ٹھنڈا پڑ گیا اور کمرے میں واپس چلا گیا۔ میں نے جنرل یحییٰ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ میرے اور مجیب میں بہت فرق ہے۔ مجیب ایک ضدی پاگل تھا میں نہیں۔

لیکن میری یہ ساری گفتگو بیکار گئی۔ میری بات سننے کے بجائے جنرل یحییٰ خان ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا اور پھر چوتھا اور پتہ نہیں کتنے گلاس شراب کے پیتا چلا گیا اور پھر اس کا رویہ ناقابل برداشت ہو گیا۔

میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ کیا ایک لمحے کے لیے ہم دوبارہ یہ بات سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ آپ مارچ کے اس خوفناک مہینے میں وہاں تک کیسے پہنچے تھے چاہے اس مہینے میں ہونے والے قتل عام کا اخلاقی جواز تھا یا نہیں۔

بھٹو صاحب بولے میری طرف دیکھو۔ 27 جنوری کو میں شیخ مجیب سے ملنے کے لیے ڈھاکہ گیا تھا۔ اگر میں نے شیخ مجیب سے بات چیت کرنی تھی تو پھر مجھے ڈھاکہ جانا ہی تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے راولپنڈی آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں اس دن شیخ مجیب سے ملنے کے لیے گیا تھا جس دن میری اپنی سگی بہن کے خاوند کی موت ہوئی تھی۔ اسے لاڑکانہ کے خاندانی قبرستان میں دفن کرنا تھا۔ میری بہن مجھ سے بہت شدید ناراض ہو گئی۔ قومی انتخابات میں شیخ مجیب نے مشرقی پاکستان اور میں نے مغربی پاکستان میں اکثریت حاصل کر لی تھی لیکن اب وہ اپنے چھ نکات پر اڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں کو کسی نہ کسی معاہدے پر پہنچنا تھا۔ جنرل یحییٰ خان مسلسل یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ ہم چار مہینے کے اندر اندر آئین پر کام کر لیں ورنہ وہ اسمبلی توڑ کر نئے انتخابات کرائے گا۔ شیخ مجیب کو یہ بات سمجھانے کے لیے بہت زیادہ کوششوں کی ضرورت تھی۔ آپ ان لوگوں سے ذہانت کی توقع نہیں کر سکتے جن کے پاس ذہانت ہی نہ ہو۔ میں نے شیخ مجیب سے ان باتوں کی بار بار وضاحت کی۔ اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی ایک ہی بات پر اڑا رہا کہ کیا آپ میرے چھ نکات کو مانتے ہیں۔ میں ان چھ میں سے پہلے میں تین نکات پر بات چیت کے لیے تیار تھا لیکن میں چوتھا نکتہ کیسے مانتا جس میں یہ لکھا تھا کہ ہر صوبہ کسی بھی غیر ملک سے تجارت کر سکتا

[illegible] اپنی مرضی سے [illegible] اور سب سے زیادہ کہ ملک کا اتحاد کیسے قائم رہتا۔ اس کے علاوہ وہاں اچانک سب کو پتہ چل گیا کہ شیخ مجیب الرحمن مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ کرنا چاہتا تھا اور اس کے بھارتیوں کے ساتھ 1966ء سے رابطے بھی تھے۔ یوں جنوری کے مہینے میں ہماری بات چیت آگے نہ بڑھ سکی اور بات مارچ تک آ گئی۔

وسط مارچ میں یحییٰ خان کراچی آئے اور مجھے بتایا کہ وہ ڈھاکہ جا رہے تھے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں وہاں جانا چاہتا تھا۔

میں نے انہیں جواب دیا ہاں اگر شیخ مجیب مجھ سے بات چیت کے لیے تیار ہے تو میں ڈھاکہ جاؤں گا۔ اگلے روز مجھے ایک ٹیلی گرام ملا کہ شیخ مجیب بات چیت کے لیے تیار ہیں۔ یہ ٹیلی گرام ڈھاکہ سے جنرل یحییٰ خان نے مجھے خود بھیجا تھا۔ میں 19 مارچ کو ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوا۔ 20 مارچ کو میری یحییٰ خان سے ملاقات ہوئی اور 21 مارچ کو میں شیخ مجیب الرحمن سے ملا۔ اس ملاقات میں یحییٰ خان بھی میرے ساتھ تھے۔ میں اس وقت بڑا حیران ہوا جب میں نے دیکھا کہ شیخ مجیب یحییٰ خان سے بڑے پیار بھرے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ شیخ مجیب بولے کہ یحییٰ خان صاحب اب تو آپ سے معاہدہ ہو گیا ہے۔ میرا بھٹو صاحب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں پریس کو بتاؤں گا کہ میری صدر صاحب سے ملاقات ہوئی ہے اور بھٹو صاحب وہاں اتفاقاً موجود تھے۔

یہ بات سن کر یحییٰ خان بولے نو نو مجیب تم صرف اپنی بات کرو۔

شیخ مجیب نے یحییٰ کو جواب دیا کہ سمندری طوفانوں میں پہلے ہی بہت سارے لوگ مارے گئے تھے۔ بہت سارے لوگ مارے گئے تھے۔ شیخ مجیب نے اپنی بات کو دہرایا۔

یہ ہے شیخ مجیب۔ اچانک اس کے بیچارے ذہن میں ایک فقرہ اٹک سا جاتا ہے۔ ایک ایسا فقرہ جس کا اس گفتگو سے دور دور تک تعلق ہی نہیں ہوتا جو آپ کر رہے ہوتے ہیں اور وہ ایک جنونی کی طرح اسے بار بار دہراتا رہتا ہے۔

اس میٹنگ میں ایک موقع ایسا بھی آیا کہ مجھے غصہ آ گیا کہ بھلا مشرقی پاکستان میں آنے والے سمندری طوفان کی ذمہ داری مجھ پر کیسے آ جاتی تھی۔ کیا وہ سمندری طوفان میں نے مشرقی پاکستان

بیٹھا تھا۔ میری یہ بات سن کر شیخ مجیب اٹھ کھڑا ہوا۔ کیونکہ اس نے ایک جنازے میں شرکت کرنا تھی لہٰذا وہ جا رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی آپ شیخ مجیب کے بارے میں بات کرتے ہیں تو آپ کو ہر بات ناقابل یقین لگتی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ بھلا دنیا کیسے اسے سنجیدگی سے لیتی ہے۔

پھر، جب شیخ مجیب نے جانے کی بات کی تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا تا کہ اسے باہر تک چھوڑ آؤں۔ اگرچہ میں نے محسوس کیا کہ شیخ مجیب یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں انہیں چھوڑنے جاؤں۔ ایک کمرے میں تین لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن میں یحییٰ خان کے ملٹری سیکرٹری اور اس کا سیاسی چالاک جنرل عمر بھی شامل تھے۔ انہیں دیکھ کر شیخ مجیب چلایا کہ کمرہ خالی کرو۔ سب لوگ باہر چلے جاؤ۔ میں نے مسٹر بھٹو سے بات کرنی ہے۔ وہ تینوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ شیخ مجیب میرے ساتھ بیٹھ گیا اور بولا میرے بھائی... میرے بھائی ہمیں کوئی معاہدہ کر لینا چاہیے۔ خدا کے نام پر میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ہم یہ معاہدہ کر لیں۔

میں اس کی بات سن کر شدید حیران ہوا۔ میں اسے باہر لے گیا تا کہ کوئی اس کی بات نہ سن سکے۔ جب ہم باہر گئے تو اس نے انتہائی پُرجوش سی آواز میں مجھے کہا کہ بھٹو صاحب! آپ مغربی پاکستان رکھ لو اور اسے مشرقی پاکستان دے دو۔ وہ بولا اس نے ایک خفیہ ملاقات کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ رات کے اندھیرے میں بھی وہ مجھے بلوائے گا اور وہ یہ سارے معاملات طے کریں گے۔

میں نے اسے بتایا کہ مجھے اس طرح کی چیزیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اصل میں ایک چور کی طرح رات کے اندھیرے میں کیلے کے کسی درخت کے نیچے چھپ کر نہیں ملنے آیا ہوں اور نہ ہی میں پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم بھی کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ قومی اسمبلی میں یہ معاملہ اٹھائے اور اپنی عددی اکثریت پر بھروسہ کرے۔

مجھے یوں لگا کہ میں کسی دیوار سے باتیں کر رہا تھا۔ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ میں اپنے ترجمان کے ذریعے بات چیت کو جاری رکھنے کے اعلان پر کچھ دباؤ کرتا۔ یہ تھی وہ ساری اصل کہانی اور وہ سارا قصہ۔ ان دنوں وہ ایک طرح سے پاگل ہوا ہوا تھا۔ اس کا دماغ گھوم گیا تھا

...ڈھاکہ کا وہ دن آیا جس دن بنگالیوں کا بڑے وحشیانہ طریقے سے قتل عام ہوا۔

میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ کیا انہوں نے 25 مارچ کو کوئی عجیب و غریب چیزیں محسوس کی تھیں۔

بھٹو صاحب بولے یقیناً اس دن کوئی عجیب سا ماحول تھا۔ انہوں نے بھی ایک عجیب سی بے چینی محسوس کی تھی۔ وہ ہر شام یحییٰ خان سے ملنے جاتے اور اسے بتاتے کہ ان کے اور مجیب کے درمیان مذاکرات آگے نہیں بڑھ رہے تھے لیکن یحییٰ خان ان باتوں میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کرتے۔ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی کر لیتے یا پھر ٹیلی ویژن کی شکایتیں کرنے لگ جاتے۔ وہ اس بات پر بڑبڑاتے کہ راولپنڈی سے ابھی ان کا ریکارڈ نہیں پہنچا تھا اور وہ اپنی پسند کے گانے نہیں سن سکتے تھے۔ 25 مارچ کی شام جنرل یحییٰ نے مجھ سے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر میں ششدر رہ گیا۔ وہ بولے آج مجیب سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کل صبح میں اور تم دونوں مجیب سے اکٹھے ملیں گے۔ میں نے پھر بھی کہا کہ ٹھیک ہے۔ میں نے اسی شام یہ بات شیخ مجیب کے ایک بندے کو بتائی تو وہ بولا "وہ کتے کا بچہ پہلے ہی ڈھاکہ سے چلا گیا ہے۔"

میں نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ میں نے صدارتی رہائش گاہ فون کیا اور بتایا کہ میں یحییٰ خان سے بات کرنا چاہ رہا ہوں۔ مجھے بتایا گیا کہ ان سے بات نہیں ہو سکتی۔ وہ رات کے کھانے پر جنرل ٹکا خان کے ساتھ ہیں۔ میں نے ٹکا خان کو فون کیا تو وہاں سے مجھے بتایا گیا کہ ان سے بات نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ اس وقت یحییٰ خان کے ساتھ کھانے پر ہیں۔ اس وقت مجھے کچھ کچھ سمجھ آنا شروع ہو گئی تھی۔ مجھے پتہ چل گیا کہ کوئی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے بعد میں رات کا کھانا کھانے چلا گیا اور پھر سو گیا۔ میری آنکھ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے کھلی۔ میں نے اپنے دوستوں کو کمروں سے بھاگنے کی آوازیں سنیں۔ میں دوڑ کر کھڑکی کی طرف گیا اور میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں رو پڑا اور میرے منہ سے نکلا My country is finished۔

میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ انہوں نے اپنی کھڑکی سے کیا دیکھا تھا؟

بھٹو صاحب بتانے لگے کہ اگرچہ لوگوں کو اندھا دھند نہیں مارا جا رہا تھا تاہم یہ ضرور تھا کہ فوجی پاکستان کے People نامی اخبار کے دفاتر کو گرانے کی کوشش کر رہے تھے جو ہمارے ہوٹل کے بالکل

سامنے واقع تھے۔ فوجی دو وفاداروں پر بیچ کر لوگوں کو اس جگہ سے دور جانے کا کہہ رہے تھے۔ جو لوگ باہر آرہے انہیں مشین گنیں دکھا کر ایک طرف کر دیا گیا۔ دوسرے گروہ کو دوسری جانب مشین گنوں کی مدد سے واسطے پر روک لیا گیا تھا۔ ایک ہوٹل کو ٹینکوں نے گھیرا ہوا تھا۔ جس نے بھی ہوٹل میں پناہ لینے کی کوشش کی وہ سیدھا فوجیوں کے ہاتھ لگا۔

میں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

صبح آٹھ بجے جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ شیخ مجیب کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ چلیں شیخ مجیب زندہ تھا۔ یہ بات میرے ذہن میں ضرور آئی کہ انہوں نے شیخ مجیب کے ساتھ بدتمیزی کی ہوگی۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید اس کی گرفتاری سے اس کے ساتھ کچھ وار کرنے میں آسانی رہے گی۔ وہ اسے ایک دو ماہ سے زیادہ جیل میں نہیں رکھیں گے اور اسی اثناء میں ہم ڈھاکہ میں امن و امان پر قابو پالیں گے۔

میں نے ان سے کہا کہ جناب صدر! مجیب نے آپ سے کہا کہ آپ مغربی پاکستان لے لو اور میں مشرقی پاکستان رکھ لیتا ہوں اور بعد میں بالکل یہی کچھ ہوا۔ کیا آپ شیخ مجیب سے اس بات پر نفرت کرتے ہیں؟

بھٹو صاحب نے زور سے کہا کہ بالکل نہیں اور میں یہ بات انڈین فیشن میں بھی نہیں کہہ رہا۔ میں آپ کو پورے خلوص سے کہہ رہا ہوں کہ میں اسے نفرت کرنے کے بجائے بہت زیادہ ہمدردی محسوس کرتا ہوں۔ اس میں نہ کامن سینس ہے نہ ہی کوئی کلچر۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اس پوزیشن میں ہی نہیں ہے کہ کوئی سیاسی، سماجی، معاشی یا عالمی مسئلہ حل کر سکے۔ اسے صرف ایک ہی طریقہ آتا ہے کہ چلانا کیسے ہے۔ میں اسے 1954ء سے جانتا ہوں اور میں نے کبھی اسے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ میری اس سے جس لمحے ملاقات ہوئی تھی میں اسی وقت سے اس کے بارے میں یہی رائے رکھتا ہوں کہ اس میں کوئی گہرائی نہیں تھی۔ وہ محض ایک Agitator تھا جس کے اندر بہت آگ بھری ہوئی تھی لیکن آئیڈیا ایک بھی نہیں تھا۔ اگر اس کے ذہن میں کوئی آئیڈیا تھا بھی سہی تو وہ علیحدگی پسندی کا تھا۔ اب ایسے شخص کے ساتھ آپ بھلا ہمدردی کا جذبہ محسوس کرنے کے علاوہ اور کیا محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ 1981ء کی بات ہے۔ میں ڈھاکہ گیا اور میری شیخ مجیب سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ وہ

ہوٹل کی لابی میں بیٹھا تھا۔ میں چل کر اس کے پاس گیا اور کہا ہیلو مجیب! آؤ چائے کا ایک کپ پیتے ہیں۔

وہ ابھی دنوں نیا نیا جیل سے باہر آیا تھا اور اس میں تلخی بھری ہوئی تھی اور ہم نے اس دفعہ بڑے جذبے سے گفتگو کی۔ شیخ مجیب مجھے بتاتا رہا کہ کیسے مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان کے ہاتھوں استحصال ہوتا رہا۔ ڈھاکہ پر ایک کالونی کی طرح حکومت کی جارہی تھی۔ اس کا خون چوسا جا رہا تھا۔ شیخ مجیب کی وہ باتیں سچی تھیں۔ میں نے بالکل یہی باتیں ایک کتاب میں بھی لکھی تھیں۔ تاہم شیخ مجیب الرحمن نے ان باتوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکالا۔ اس نے یہ وضاحت نہیں کی کہ غلطی معاشی نظام میں تھی۔ اس دور کے حکمرانوں میں تھی۔ اس نے اس وقت سوشلزم یا جدوجہد کی کوئی بات نہیں کی۔ اس کے برعکس اس نے کہا کہ مشرقی پاکستان کے لوگ اس وقت جدوجہد کے لیے تیار نہیں تھے اور کوئی بھی فوج کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔ فوج کو چاہیے تھا کہ وہ ان ناانصافیوں کا خاتمہ کرے۔ اس کے اندر جرأت بھی تھی ہی نہیں۔ بیچارہ وہ واقعی اپنے آپ کو صحافیوں کے سامنے شیر بنگال کہتا ہے۔

بھٹو صاحب کی یہ بات سن کر میں نے کہا کہ ہاں وہ تو یہ بھی کہتا ہے کہ جب اس کا ٹرائل کیا گیا تو اس نے اپنا دفاع کرنے سے انکار کر دیا تھا اور گرفتاری کے بعد اس نے ایک ہیرو کی طرح کا رویہ اختیار کیا۔ اسے ایک ایسے سیل میں رکھا گیا جہاں سونے کے لیے ایک گدا تک بھی نہ تھا۔

بھٹو صاحب نے کہا کم آن۔ اسے کبھی کسی جیل کے سیل میں نہیں رکھا گیا۔ اسے ایک ایسے اپارٹمنٹ میں رکھا گیا تھا جو خصوصی طور پر بڑے اہم سیاسی قیدیوں کے لیے تیار کرایا گیا تھا۔ اسے پنجاب کی میانوالی کی جیل میں رکھا گیا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ اسے پڑھنے کے لیے اخبارات اور سننے کے لیے ریڈیو فراہم نہیں کیا جاتا تھا۔ تاہم اس کے پاس گورنر پنجاب کی بہت بڑی لائبریری کی سہولت موجود تھی اور وہ وہاں بڑے اچھے طریقے سے رہا۔ کئی موقعوں پر تو اسے بنگالی خانساماں بھی دیا گیا کیونکہ وہ بنگالی ڈشز کھانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ٹرائل کے موقع پر اپنا دفاع بھی کیا۔ اس نے اپنے دفاع کے لیے دو بڑے وکیلوں کمال حسین اور اے کے بروہی کی خدمات بھی مانگیں جو اس کا قانونی مشیر اور دوست بھی تھا۔ کمال حسین ان دنوں جیل میں تھا لیکن بروہی صاحب آزاد تھے۔ بروہی کو اپنا وکیل بنانے کا مقصد یہ تھا کہ آپ کے پاس بہتر سے بہتر وکیل آپ کا دفاع کرنے کے لیے موجود ہو۔ میں

آپ کو ایک اور بات بتاتا ہوں۔ پہلے تو بروہی نے اس کا وکیل بننے سے انکار کیا تاہم یحییٰ خان نے اسے مجبور کیا اور وہ شیخ مجیب کے مقدمے میں اپنے چار یا پانچ تیز وکیلوں کے ساتھ پیش ہوا۔ بروہی کے ساتھ صرف ایک ہی مسئلہ ہے کہ وہ بولتا بہت ہے۔ جب بھی وہ لائل پور سے کراچی واپس آتا تو وہ شیخ مجیب کے ساتھ ہوئی اپنی ساری گفتگو لوگوں کو سناتا اور کہتا کہ اسے مجرم ثابت کرنا بہت مشکل ہوگا۔ مجیب نے اسے بہترین انداز میں وہ ساری باتیں اسے بتائی ہوتیں کہ جیسے وہ جنرل یحییٰ کا بھی احترام کرتا تھا اور پاکستان توڑنے میں بھی اسے دلچسپی نہیں تھی۔ شیخ مجیب یہ بات کہتے ہوئے کبھی نہیں تھکتا تھا کہ یحییٰ خان ایک زبردست آدمی تھا۔ بہت بڑا محب وطن لیکن بھٹو نے اسے دور کر دیا تھا۔ شیخ مجیب کا خیال تھا کہ اس کی گرفتاری کا ذمہ دار بھٹو تھا۔ یہ مجھے جنرل پیرزادہ نے بھی مجھے بعد میں کنفرم کی تھی اور میں نے اسے کہا تھا کہ آپ اسے میرے حوالے کر دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ مجھے بھی یہی کہے گا کہ بھٹو ایک زبردست انسان، بہت بڑا محب وطن ہے اور آپ لوگوں کی بے عزتی کرے گا۔

میں نے کہا کہ بھٹو صاحب! شیخ مجیب کو تو اس ٹرائل میں باقاعدہ سزا بھی سنائی گئی تھی؟

بھٹو صاحب بولے نہیں! ایک اسپیشل ٹریبونل نے اسے مجرم قرار دیا تھا۔ اس کے بعد مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طور پر یہ پاور یحییٰ خان کے پاس تھے کہ وہ سزا کا فیصلہ کرے جو پانچ سال سے لے کر عمر قید یا سزائے موت ہو سکتی تھی۔ یحییٰ خان نے کوئی فیصلہ نہیں کیا کیونکہ جنگ پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ اس کے ذہن پر اور بہت ساری چیزیں سوار تھیں۔

میں نے کہا کہ بھٹو صاحب! شیخ مجیب نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی قبر تک کھود دی گئی تھی۔

بھٹو صاحب بولے کہ کیا آپ کو پتہ ہے کہ یہ قبر کیا تھی۔ یہ ایئر ریڈ شیلٹر تھی۔ انہوں نے جیل کی دیواروں کے اردگرد کھدائی کی ہوئی تھی۔ بیچارہ مجیب وہ اتنا خوفزدہ تھا کہ وہ ہر چیز کو اپنی موت کا پروانہ سمجھتا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ یحییٰ خان اسے قتل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ 27 دسمبر کو جب مجھے پاکستان کے نئے صدر کا حلف دیا گیا تو میں جنرل یحییٰ خان سے ملا۔ اس وقت وہ نشے میں دھت تھا اور Dorian Gray کے پورٹریٹ کی طرح لگ رہا تھا۔ یحییٰ خان نے مجھے بتایا کہ "میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ میں نے شیخ مجیب کو پھانسی پر نہیں چڑھایا۔ تم اگر چاہتے ہو تو یہ کام کر گزرو۔"

میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا پھر کیا ہوا؟

بھٹو صاحب بولے میں نے کہا کہ میں اسے پھانسی نہیں لگاؤں گا اور بار بار سوچنے کے بعد میں نے یہ سوچا کہ مجھے شیخ مجیب کو رہا کر دینا چاہیے۔ پاکستان آرمی کے مظالم کی کہانیوں کے بعد جس کی وجہ سے نفرت کی جا رہی تھی، میرے ملک کو چند ہمدردیوں کی ضرورت بھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شیخ مجیب کو رہا کر کے ہمیں زیادہ ہمدردیاں ملیں گی۔ اس کے علاوہ میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ اس کی رہائی سے مسئلہ حل ہو جائے گا اور ہمارے جنگی قیدی جلدی واپس آ سکیں گے۔ یہ سوچ کر میں نے فوری طور پر حکم دیا کہ شیخ مجیب کو لائل پور سے راولپنڈی لایا جائے۔ جب شیخ مجیب کو یہ آرڈرز دیئے گئے تو وہ خوفزدہ ہو گیا اور سسکیاں بھرنے لگا کہ وہ اسے باہر نکال کر مار دیں گے۔ وہ لائل پور سے راولپنڈی کے سفر کے دوران بھی پرسکون نہیں تھا۔ اس کی اس وقت بھی تسلی نہیں ہوئی جب اسے بڑے خوبصورت بنگلے میں لے جایا گیا۔ وہ خوبصورت بنگلہ چند بڑے لوگوں کے استعمال کے لیے مخصوص تھا۔ جب میں وہاں اپنے ساتھ ایک ریڈیو، ایک ٹیلی ویژن سیٹ اور کپڑوں کا ایک بنڈل لے کر گیا تو اس نے میرے اوپر چڑھائی کر دی۔ وہ بولا تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس وقت پاکستان میں صدر بن چکا ہوں۔ یہ سن کر اس کی آواز فوراً بدل گئی۔ وہ آ کر میرے گلے لگ گیا اور بولا کہ یہ اس کی زندگی کی سب سے اچھی خبر ہے اور یہ کہ خدا اسے ہمیشہ بچانے کے لیے مجھے وقت پر بھیج دیتا ہے۔ میں اس سے پہلے بھی اسے ایک دفعہ اسی طرح جیل سے نکلوا چکا تھا۔ جیسا کہ میرا اندازہ تھا شیخ مجیب نے جنرل یحییٰ خان پر تنقید شروع کر دی۔ اپنی اس تنقید میں وہ وقفہ صرف اس وقت کرتا جب وہ مجھ سے یہ پوچھتا کہ کیا اب اپنے آپ کو آزاد سمجھے۔ اسے بذریعہ لندن ڈھاکہ جانے سے پہلے میں اس سے دو دفعہ ملا اور دونوں دفعہ اس نے قرآن پاک نکالا اور اس پر ہاتھ رکھ کر قسم کھا کر کہا کہ وہ مغربی پاکستان کے ساتھ تعلقات رکھے گا۔ جب وہ جہاز پر سوار ہوا تو اس نے تب بھی قرآن پاک پر قسم کھائی۔ جب میں اسے صبح اسے چھوڑنے ایئرپورٹ گیا تو یقین کریں میں اس کی ان باتوں سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس نے ایک اور قسم کھائی، مجھے گلے سے لگایا، میرا شکریہ ادا کیا اور ہمیشہ کے لیے میرا ممنون رہنے کی باتیں کیں۔ جہاز پر چڑھنے سے پہلے وہ مجھ سے بولا کہ صدر صاحب! میں بہت جلد واپس آؤں گا۔ میں اب آپ لوگوں کو بہتر طریقے سے جاننا چاہتا ہوں۔ میں اب یہاں بار بار آتا رہوں گا۔

میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ کیا کبھی انہیں شیخ مجیب کو رہا کرنے کا افسوس ہوا؟

بھٹو صاحب نے کہا نہیں، ریکھی جی نہیں اور یہ کہ بھی کہا ہے وہ مشرقی طرز کا ایک پاکستانی ہے
اور ہم دونوں ہی فخر سے ایک طرز کے انداز سے جیتے رہے ہیں۔ ہم نے ایک طرز کے حقیقے دار کا سامنا
کیا ہے۔ ان تمام برسوں کے دوران بھی اور اب بھی ایک مشکل موجود ہے۔ میں آج بھی اسے یاد کرتا
ہوں جب مجھے اداری کا دورہ آتا ہے جب اس نے مجھ سے یاد دلایا تھا اور سکیاں لے کر
پورا استاد کی تھی کہ مجھے بچا لو۔ میں واقعی اس کے لیے ہمدردی محسوس کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ
مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ بیچارہ مجیب زیادہ دیر تک اقتدار میں نہیں رہے گا۔ آٹھ ماہ گزر گئے ہیں۔ ہو سکتا
ایک سال پورا ہو، وہ بڑی جلد بازی سے چلتا تھا وہ اسے خود نگل جائے گی۔ آج آپ دیکھ رہے
ہیں بنگلہ دیش انڈیا کا سیٹلائٹ بن گیا ہے۔ بہت جلد یہ روس کا سیٹلائٹ بنے گا اور مجیب کی بساط نہیں
ہے۔ اگر مجیب ان تمام معاملات کو اچھے طریقے سے سنبھال بھی لے جس کا امکان مجھے نہیں لگتا تو بھی
بہت جلد اس کا سامنا Maoists سے ہوگا جو اس رنگ کے اصل فاتح ہیں۔ وہ پہلے ہی اس پر دباؤ بڑھا
رہے تھے۔ سیاسی طور پر مکتی باہنی کچھ بھی نہیں۔ اگر معاشرتی طور پر دیکھا جائے تو وہ ایک طرح سے کوئی
طاقت ہی نہیں۔ مکتی باہنی کو صرف ایک چیز آتی ہے کہ ہوا میں گولی کیسے چلائی ہے۔ لوگوں کو خوفزدہ کیسے کرنا
ہے۔ کیسے مال چرانا ہے اور Joi Bangla کے نعرے کیسے لگانے ہیں۔ اور آپ محض نعرے لگا کر ایک
ملک نہیں چلا سکتے جبکہ دوسری طرف بنگالی Maoists نے ماؤزے تنگ کی آدھی لال کتاب پڑھی ہوئی
ہے لیکن وہ سمجھدار ہیں اور بھارتیوں کو یا بھارت نہیں دیتے کہ وہ انہیں استعمال کر سکیں۔ میرا انہیں خیال
کہ وہ پاکستان کے اتحاد کے خلاف ہیں۔ آپ دیکھیے گا برتری انہیں کو ہی لے گی۔ اتنے خوفناک اور
وسیع مسائل کا سامنا کرنے کے لیے آپ کو ایک جینئس کی ضرورت ہوگی۔ اب آپ ذرا تصور کریں کہ
شیخ مجیب الرحمن جیسا شخص ان تمام مسائل سے ڈیل کر رہا ہے اور پھر یہ زمین (بنگلہ دیش) بہت بدنصیب
دھرتی ہے۔ سمندری طوفان، سیلاب اور دیگر مصیبتیں ہر وقت ٹوٹتی رہتی ہیں۔ ان کے بارے میں کیا
جائے گا کہ وہ کسی منحوس ستارے کے زیر اثر پیدا ہوا تھا۔ آپ نے ڈھاکہ کو 1947ء میں دیکھا تھا اور
1958ء میں بھی ایک گندہ سا گاؤں جہاں گلیاں تک نہیں تھیں اب وہاں ہر چیز تباہ ہو چکی ہے اور اسے
تباہ کرنے میں بنگلہ دیش کی مکتی باہنی کے ڈاکو ایجنسی نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔

میں نے جب بھٹو صاحب کے منہ سے بنگلہ دیش کا نام سنا تو میں بڑی حیران ہوئی اور ان سے

پوچھا کہ آپ کے منہ سے بنگلہ دیش کا نام سن کر مجھے حیرت ہو رہی ہے؟

بھٹو صاحب میری حیرانی دیکھ کر بولے کہ صاف ظاہر ہے میں بنگلہ دیش کا نام لیتے اور لکھتے
ہوئے گھبراتا ہوں۔ میرے لیے تو ابھی تک یہ مشرقی پاکستان ہے۔ اب گئی یا غلط۔ اگر یہ پوچھ بھی
لیں کہ سامنا سے دوچار ہوں تو بھی اسے
بھاریوں کی کوئی واپسی کا نتیجہ ہے۔ پچاس ملک اسے تسلیم کر چکے ہیں۔ اب مجھے بھی اسے تسلیم کرنا
پڑے گا۔ میں بھی اسے تسلیم کرنے کو تیار ہوں اگر بھارت ہمارے قیدی واپس کرے اور بہاریوں کا واپس
آنا قبول کیا جائے اور پاکستان کے حامیوں کو رہا کیا جائے۔ اگر ہم نے دوبارہ ایک فیڈریشن میں ضم
ہونا ہے تو ہمیں سفارتی تعلقات قائم کرنے چاہئیں۔ میرا خیال ہے کہ اگلے پندرہ سالوں میں پاکستان
اور بنگلہ دیش دوبارہ ایک فیڈریشن بن سکتے ہیں۔ یہ بن سکتے ہیں اور انہیں بننا بھی چاہیے ورنہ اس
کا نقصان بھارت کو ہوگا۔ دوسری طرف مغربی بنگال بھی بھارت سے علیحدگی چاہتا ہے۔ مشرقی بنگالیوں
اور مغربی بنگالیوں میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے جبکہ ہمارے اور مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کے درمیان
ایک مذہب مشترک ہے۔ 1947ء میں ہونے والی تقسیم بہت اچھی تھی۔

میں نے کہا کہ بھٹو صاحب اور یہ کہ کیا آپ نے ایک ایسا ملک 1947ء میں بنایا جو ایک
دوسرے سے دو ہزار کلو میٹر دور اور درمیان میں انڈیا تھا۔

بھٹو صاحب بولے کہ آپ یہ بات کیوں بھول رہی ہیں کہ یہ دونوں علاقے باوجود بہت ساری
خامیوں کے پچیس سال تک ایک ملک کا حصہ رہے۔ ایک ریاست محض علاقائی یا جغرافیائی تصور بھی نہیں
ہوتی۔ جب آپ کا جھنڈا، قومی ترانہ، مذہب ایک ہو تو پھر فاصلوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب
مغلوں نے انڈیا کو فتح کیا تھا تو مسلمانوں کو اس کے دوسرے سرے تک پہنچنے کے لیے پورا ایک سو سال
لگا تھا اب ہوائی جہاز کے ذریعے محض دو گھنٹے لگتے ہیں۔ کیا آپ میری بات سمجھ رہی ہیں۔

میں نے کہا جناب صدر! نہیں۔ مجھے اندرا گاندھی کی بات زیادہ بہتر سمجھ میں آتی ہے جب وہ یہ
کہتی ہیں کہ 1947ء کی تقسیم غلط تھی اور 1970ء کی دہائی میں مذہب کی لڑائی ایک احمقانہ چیز تھی!

بھٹو صاحب بولے مسز گاندھی کے ذہن میں صرف یہ خواب ہے کہ وہ پورے برصغیر پر قبضہ کر
کے اس میں اپنی رعایا بنانا چاہتی ہے۔ وہ ایک کنفیڈریشن بنا کر پاکستان کو دنیا کے نقشے سے غائب کرنا
چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یہ کہتی ہیں کہ ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ہم بھائی بھائی نہیں

[illegible]

آپ کو پتہ ہے کہ ہندوستان میں [illegible] اس کے بارے میں اس طرح [illegible] مسلمانوں کی [illegible] نہیں۔ انہوں نے [illegible] میں ان کی ایک [illegible] 1944ء میں [illegible] آیا۔ میں بچپن میں اپنے والدین کے ساتھ [illegible] گیا تھا۔ میں ایک پہاڑی [illegible] مجھے شدید پیاس لگی۔ میں ایک شخص کے پاس گیا جو پانی [illegible] تھا اس سے میں نے پینے کے لیے پانی مانگا۔ اس شخص نے پانی کا گلاس بھر کر مجھے دینے کی بجائے [illegible] پوچھا کہ تم ہندو ہو یا مسلمان؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے میں جھجکا کیونکہ مجھے شدید پیاس لگی ہوئی تھی۔ خیر میں نے ہمت کر کے کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ یہ سن کر اس شخص نے وہ پانی زمین پر گرا دیا۔

اب تم ہی بتاؤ کہ [illegible] اندرا گاندھی [illegible]۔

کیا آپ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے نہیں ہو سکتے۔ میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا۔

بھٹو صاحب بولے [illegible] اندرا گاندھی کی [illegible] ایک معمولی [illegible] بات نہیں ہے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] میں نے اس سے پوچھا کہ [illegible] آکسفورڈ یونیورسٹی [illegible] میں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں اپنی تین سالہ ڈگری کو دو سالوں میں مکمل کیا تھا جبکہ وہ تین سالوں میں بھی اپنا کورس مکمل نہیں کر سکی تھی۔

بھٹو صاحب کی یہ باتیں سن کر میں ان سے یہ کہے بغیر نہ رہ سکی کہ آپ مسز گاندھی کے ساتھ کہیں زیادتی تو نہیں کر رہے ہیں۔ اگر ان میں کوئی ایسی خاص بات نہ ہوتی تو بھلا وہ اتنے عرصے تک کیسے اقتدار میں رہ سکتی تھیں یا آپ یہ بات اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ ایک عورت ہے اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے؟

بھٹو صاحب فوراً بولے نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پاکستان کا سربراہ ہونے کے ناطے میں عورتوں کے خلاف نہیں ہوں۔ تاہم میں یہ نہیں سوچتا کہ عورتیں مردوں سے بہتر ریاست کی سربراہ ہو سکتی ہیں۔ میری مسز گاندھی کے بارے میں رائے [illegible] ہے۔ اس میں کوئی [illegible] نہیں

ہے۔ میں یہ بات اس لیے بھی نہیں کہہ رہا کہ وہ ہمارے خلاف چیزوں کو فنی واضح کرنے کو تیار نہیں ہے اور میں ان کا احترام نہیں کرتی۔ میں تو آپ کو دراصل جیسا میں نے اسے پایا ہے، وہ ایک ایسی خاتون ہیں جن میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بالکل نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کہ آج وہ ان دنوں سے زیادہ بہتر ہیں جب وہ آکسفورڈ میں پڑھتی تھیں یا لندن میں ہونے والے ایک لیکچر میں بیٹھی نوٹس لے رہی تھیں۔ اقتدار نے انہیں اعتماد دیا ہے اور کامیابی سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ لیکن اصل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں ان کی خوبیوں سے زیادہ کامیابی ملی ہے۔ اگر پاکستان اور انڈیا نے ایک کنفیڈریشن بنا لی تو مجھے مسز اندرا گاندھی سے ان کا یہ عہدہ لینے میں کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ میں ان سے Intellectual Confrontations سے بھی خوفزدہ نہیں ہوں۔ یہ سب کچھ کہنے کے باوجود بھی میں مسز گاندھی سے کسی بھی جگہ ملنے کو تیار ہوں جہاں وہ پسند کریں۔ میں نئی دہلی جا کر بھی ان سے ملاقات کے لیے جا سکتا ہوں۔ جی ہاں! میں ان سے ملنے کے لیے نئی دہلی بھی جانے کو تیار ہوں۔ تاہم، جو بات مجھے پریشان کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مجھے بھارتی فوج گارڈ آف آنر پیش کر رہی ہے اور میں اندرا گاندھی سے ملاقات کر رہا ہوں۔ یہ دونوں چیزیں مجھے پتہ نہیں کیوں اچھی نہیں لگتیں۔ خدارا مجھے ان دونوں چیزوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور بھی نہ کرو۔

بھٹو صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ یہ باتیں چھوڑیں اور مجھے یہ بتائیں کہ مسز اندرا گاندھی نے ان کے بارے میں مجھے اپنے انٹرویو میں کیا کہا تھا۔

میں نے بھٹو صاحب کو جواب دیا کہ وہ کہتی تھیں کہ آپ ایک غیر متوازن شخصیت کے مالک انسان ہیں۔ آپ ایک دن ایک بات کرتے ہیں اور دوسرے دن دوسری۔ وہ یہ بھی کہتی تھیں کہ آپ کے بارے میں کسی کو کوئی پتہ نہیں چلتا کہ آپ کے ذہن میں کیا ہے۔

بھٹو صاحب بولے۔ واقعی؟

بھٹو صاحب نے کہا میں آپ کو اس کا ایک سیدھا سا جواب دیتا ہوں۔ مجھے مشہور فلاسفر والٹیر کی صرف ایک بات اچھی لگتی ہے کہ Consistency is a virtue of small minds (اگرچہ بھٹو صاحب نے یہ مشہور فقرہ والٹیر کے نام سے کہا، دراصل یہ بات ایمرسن نے کہی تھی۔ اس نے کہا A foolish consistency is the hobgoblin of little minds۔ مترجم)

بھٹو صاحب نے کہا کہ دوسرے لفظوں میں میرے خیال میں آپ کا بنیادی تصور ضرور ایک ہونا چاہیے لیکن اس کے اندر بھی تبدیلی کی گنجائش ہونی چاہیے۔ آپ کبھی ایک پول پر چلے جائیں تو کبھی دوسرے پر۔ ایک دانشور کو صرف ایک خیال کے ساتھ چمٹ کر نہیں رہنا چاہیے۔ اس کے خیالات میں لچک ہونی چاہیے ورنہ اس کے خیالات ڈرامے یا فلم میں کسی کردار کی لکھی تحریر جیسے ہی ہوں گے۔ یہ بات سیاستدان پر بھی صادق آتی ہے۔ سیاست بھی ایک تحریک کی طرح ہوتی ہے اور ایک سیاستدان کو بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔ اسے کبھی رائٹ تو کبھی لیفٹ کی طرف گھومنا چاہیے تو کبھی اس کے اندر شک اور شکوک بھی ابھرنے چاہئیں۔ اسے مسلسل اپنے آپ کو بدلتے رہنا چاہیے۔ چیزوں کو ٹیسٹ کرتے رہنا چاہیے اور ان پر ہر سائیڈ سے حملہ کرتے رہنا چاہیے تاکہ وہ اپنے مخالفین کے کمزور پوائنٹ ڈھونڈ کر ان پر حملہ کر سکے۔ اس شخص پر ترس کھانا چاہیے جو ہر وقت اپنے ایک بنیادی خیال سے چمٹا رہے اور اس سے ہمدردی کرنی چاہیے کہ اگر وہ اپنے اس بنیادی نقطے کا انکشاف کرتا ہے۔ بظاہر ایک غیر مستقل مزاجی کسی بھی ذہین شخص اور منجھے ہوئے شخص کی بہت بڑی خوبی ہوتی ہے۔ اگر یہ بات مسز اندرا گاندھی کو سمجھ نہیں آتی تو پھر مجھے یہ کہنے میں حرج نہیں ہے کہ وہ اپنے سیاسی پیشے کی اس خوبصورتی سے ناآشنا ہے۔ یہ بات بہرحال مسز گاندھی کے والد نہرو کو اچھی طرح پتہ تھی۔

میں نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ اندرا گاندھی تو کہتی ہیں کہ ان کے والد صاحب نہرو سیاستدان نہیں بلکہ ایک Saint تھے۔ (یہ خطاب دراصل رومن کیتھولک اور آرتھوڈوکس چرچ ایک بہت ہی اچھے اور نیک انسان کو اس کی موت کے بعد دیا کرتے تھے۔ مترجم)

بھٹو صاحب فوراً بول پڑے اور ان کے منہ سے نکلا اوہ۔ مسز گاندھی اپنے باپ کے بارے میں غلط بات کہہ رہی ہیں۔ ان کا باپ ایک بہت عظیم سیاستدان تھا۔ میری خواہش تھی کہ ان میں اپنے باپ کی آدھی خوبیاں بھی ہوتیں۔ اگرچہ نہرو پاکستان کے قیام کے خلاف تھا لیکن پھر بھی میں اس کی خوبیوں کا معترف ہوں بلکہ جب میں نوجوان تھا تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں ان کا بہت بڑا فین تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ان میں بھی بہت ساری خامیاں تھیں۔ ان کے حصے کی اپنی ناکامیاں تھیں۔ ان میں بھی خوبیاں تھیں اور وہ شاندار، چرچل یا ماؤزے تنگ کی کلاس سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔

بھٹو صاحب نے پھر مجھ سے پوچھا کہ اس کے علاوہ مسز گاندھی نے ان کے بارے میں اور کیا کہا؟

[illegible]

[illegible] Palermo [illegible] Marseilles [illegible]

دراصل [illegible] بھی یہ بات بھولتے کو تیار نہیں ہیں کہ ہم نے مقبوضہ کشمیر پر حملہ 3 دسمبر کو کیا تھا۔ مجھے یاد ہے میری نومبر 29 کو جنرل یحییٰ خان سے ملاقات ہوئی تھی اور میں نے ان سے اس بات پر خاصی بحث کی تھی کہ ہم نے بھارتیوں پر جوابی حملہ کیوں نہیں کیا تھا۔ میں نے یحییٰ خان کو کہا تھا کہ آپ تو ایسے بیٹھے ہوئے ہیں جیسے مشرقی پاکستان میں کچھ نہیں ہوا تھا۔ آپ بھارت پر حملہ نہ کر کے دراصل بھارتیوں کا کھیل کھیل رہے تھے۔ آپ لوگوں کو اس بات کا یقین دلا رہے تھے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان ایک ملک کا حصہ نہیں تھے۔

میں نے یہ ساری باتیں جنرل یحییٰ کو بتائیں لیکن اس نے میری ایک بھی نہیں سنی۔ اس نے چار دفعہ بھارت پر جوابی حملے کی کارروائی کے احکامات دیکر واپس لیے۔ جب چوتھی دفعہ جنرل یحییٰ نے بھارت پر حملے کے احکامات دیکر واپس لیے تو ہمارے فوجی افسران اور فوجی شدید مایوسی میں اپنے سر اپنے ٹینکوں کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔

جہاں تک ڈھاکہ کی بات ہے میں نے جنرل یحییٰ سے کہا کہ ہم باقی محاذ چھوڑ کر ڈھاکہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم ڈھاکہ کو ایک بہت بڑا قلعہ بنائیں گے اور وہاں دس ماہ سے لے کر ایک سال تک بھارت سے جنگ لڑیں گے اور پوری دنیا ہمارے ساتھ ہوگی۔ تاہم یحییٰ خان کے ذہن میں صرف ایک بات سمائی ہوئی تھی کہ کہیں بھارتی ہمارے چھوٹے سے علاقے پر بھی قبضہ نہ کر لیں اور وہاں بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا دیں اور جب اسی جنرل یحییٰ نے جنرل نیازی کو بھارتی جنرل کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا تو میں نے خدا سے کہا تھا بہتر ہوتا کہ میں اس سے پہلے ہی مر جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں اس

[illegible]

[illegible] جذبات پر قابو نہ رہا اور میں نے پھر وہ تقریر کی تھی جس میں میں نے ان سب سے کہا تھا کہ آپ لوگ جائیں جہنم میں۔ میں اس وقت رو پڑا تھا۔ آپ نے ان دنوں میں کبھی کبھار روتا بھی ہوں۔ میں اس وقت روتا ہوں جب میں کہیں ناانصافی ہوتے دیکھتا ہوں۔ میں ایک بہت جذباتی آدمی ہوں۔

میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ یعنی آپ ایک جذباتی، ایک مشکل اور ایک ایسے انسان ہیں جن کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ سب سے زیادہ زیر بحث بھی رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے بہتر ہوگا کہ ہم آپ کی شخصیت کے بارے میں تھوڑی سی گفتگو کریں۔ اب اس بات پر بات کرتے ہیں کہ آپ ایک بہت امیر آدمی ہیں پھر بھی آپ ایک سوشلسٹ ہیں۔ آپ مغربی انداز میں زندگی گزارتے ہیں اور پھر بھی آپ کی دو بیویاں ہیں۔

بھٹو صاحب بولے کہ میری شخصیت تضادات سے بھری ہوئی ہے اور مجھے ان کا علم بھی ہے۔ میں ان تضادات کو ایک دوسرے سے ملانے اور ان پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن مجھے اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ میں مشرق اور مغرب کا ایک عجیب سا ملاپ ہوں۔ میں نے ایک عام آدمی کی تعلیم حاصل کی ہوئی ہے اور ایک مسلم گھرانے میں میری پرورش ہوئی ہے۔ میرا ذہن مغربی اور میری روح مشرقی ہے۔ جہاں تک میری دو بیویوں کی بات ہے، میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میری شادی اس وقت کر دی گئی تھی جب میں 13 سال کا تھا۔ میری پہلی بیوی میری کزن تھی۔ میں 13 برس کا اور وہ 23 برس کی تھی۔ اس وقت تو مجھے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ بیوی کیا چیز ہوتی ہے۔ جب انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تو مجھے اس وقت شدید غصہ آیا تھا۔ مجھے اس وقت بیوی نہیں چاہیے تھی۔ میں کرکٹ کھیلنا چاہتا تھا۔ مجھے کرکٹ بہت پسند تھی۔ مجھے اس شادی پر راضی کرنے کے لیے انہوں نے

مجھے کرکٹ سے دور رکھنے کا ایک فریب کر رہے ہیں۔ جونہی میری شادی کی رسومات ختم ہوئیں میں بھاگ کر کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔

مجھے احساس ہے کہ میرے ملک میں ایسی بہت ساری چیزیں ہوتی ہیں جنھیں تبدیل ہو جانا چاہیے۔ میں پھر بھی اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ میرے گاؤں میں تو میرے ساتھ کرکٹ کھیلنے والے ایک کھلاڑی دوست جس کی عمر اس وقت گیارہ سال تھی، کی شادی ایک 32 سالہ خاتون سے کر دی گئی تھی۔ وہ مجھے ہمیشہ کہتا تھا کہ یار تم تو خوش قسمت ہو کہ تمہاری بیوی 23 برس کی تھی اور تم 13 برس کے!

جب میں اپنی دوسری بیوی نصرت کی محبت میں گرفتار ہوا تو میری عمر اس وقت 23 برس تھی۔ نصرت اس وقت لندن میں پڑھ رہی تھی۔ اگرچہ وہ ایرانی تھی اور ایران میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی روایت تھی، پھر بھی میرے لیے اسے شادی پر رضامند کرنا بہت مشکل تھا۔ میرے پاس اسے منانے کے لیے کوئی زیادہ دلیلیں نہیں تھیں۔ میں نے اسے صرف دو تین الفاظ ہی کہے تھے کہ کیا ہوا اگر میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔ لعنت بھیجو اس پر۔ اب میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ اپنی پہلی بیوی کا خیال میرے ذہن میں کبھی نہیں آیا۔ نہ صرف یہ کہ وہ میری کزن ہے بلکہ یہ بھی کہ اب وہ میری ذمہ داری ہے۔ اس بیچاری کی تمام عمر اس احمقانہ شادی کی وجہ سے تباہ ہو کر رہ گئی جو ایک 13 سال کے بچے سے کی گئی تھی۔ یہ ایک ایسی بیہودہ روایت ہے جس میں ہم سب پل بڑھ کر جوان ہوئے ہیں۔ وہ میرے لاڑکانہ والے گھر میں رہتی ہے۔ ہم اکثر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ وہ زیادہ تر تنہا زندگی گزارتی ہے۔ وہ ماں بھی نہیں بن سکی جبکہ میری دوسری بیوی سے میرے چار بچے ہیں۔ میں نے اپنی پہلی بیوی کے ساتھ بہت کم وقت گزارا ہے۔ میں جونہی تھوڑا سا بڑا ہوا میں پڑھنے کے لیے لندن چلا گیا۔ یہ ناانصافی کی ایک ایسی داستان ہے۔ میں وزیر اعظم کی حیثیت سے وہ سب کچھ کروں گا جس سے لوگ دوسری شادی نہ کریں۔ پھر دوسری شادی کے بعد بہت بڑے معاشی مسائل بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اکثر یہ بیویاں الگ گھروں اور شہروں میں رہتی ہیں جیسا کہ میرے ساتھ ہوا، لیکن اب ہر کوئی میری طرح بھی دو بیویاں مختلف شہروں اور گھروں میں افورڈ نہیں کر سکتا۔ اگرچہ میں کوئی اتنا امیر آدمی بھی نہیں ہوں۔

میں نے حیرانی سے بھٹو صاحب سے پوچھا، کیا آپ واقعی امیر نہیں ہیں؟

بھٹو صاحب نے فوراً جواب دیا کہ نہیں، میں اس طرح امیر نہیں ہوں جیسا آپ کے ہاں سمجھا

جاتا ہے۔ یہاں جس کے پاس بہت ساری زمین ہو اسے امیر کہا جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس یورپ کے ان نوابوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو شاندار بنگلوں میں رہتے ہیں اور زندہ رہنے کے لیے Gigolo کھیلتے ہیں۔ ہماری زمینیں خشک ہیں اور پیداوار کم ہے۔ اس لیے یہ کہنے کے بجائے کہ میں ایک امیر آدمی ہوں، آپ یہ کہہ سکتی ہیں کہ میں نسبتاً ایک امیر آدمی ہوں۔ میں ایک اچھی زندگی گزارتا ہوں۔ میری بہن بھی ایک اچھی لائف گزار رہی ہے۔ میرے بھائی نے بھی اچھی زندگی گزاری اور ہم اچھے سکولوں میں پڑھنے گئے لیکن ہم نے کبھی ایک روپیہ بھی ضائع نہیں کیا۔ میں کبھی بھی پلے بوائے نہیں رہا۔ جب میں امریکہ میں سٹوڈنٹ تھا اور بعد میں آکسفورڈ میں پڑھ رہا تھا، میں نے وہاں کوئی کار نہیں خریدی۔ میں نے پیسوں کو ہمیشہ بڑی احتیاط سے خرچ کیا ہے۔ مثلاً میں نے پیسے کو یورپ جانے اور اچھے لوگوں سے ملنے اور کتابیں خریدنے پر خرچ کیا ہے۔ اگر آپ میری لائبریری پر ایک نظر دوڑائیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ میں نے اپنی دولت کا بڑا حصہ کتابوں پر خرچ کیا ہے۔ میرے پاس ہزاروں کتابیں ہیں جن میں بہت ساری پرانی اور نئی کتابیں ہیں۔ میں مطالعے سے بہت لطف اندوز ہوتا ہوں جس طرح سپورٹس سے! چند لوگ میرے اوپر یہ الزام لگاتے ہیں کہ میں ڈریسی کپڑے پہنتا ہوں۔ یہ بات درست ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنی دولت کپڑوں پر اڑاتا ہوں۔ اچھے کپڑے پہننے کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک صاف ستھرا انسان ہوں۔ میں نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے سے محبت کرتا ہوں۔ میں ان بھارتی اور پاکستانی شہزادوں کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا جو گندے رہتے ہیں اور ان سے بُو آتی ہے۔ میرے پاس خوبصورت اور آرام دہ گھر ہیں۔ یہ بات بھی درست ہے، لیکن بہت بڑے عرصے تک میرے ان گھروں میں ایئر کنڈیشنر تک نہیں تھے۔ میں لوگوں کو کھلا پلا کر خوش ہوتا ہوں لیکن احمق اور بیوقوف لوگوں کو نہیں! مجھے رقص کرنا آتا ہے لیکن اس وجہ سے کیونکہ مجھے میوزک پسند ہے۔ دوسرے میں اس وقت دیوار پر لگا ہوا ایک ساکت پھول بن کر نہیں رہ سکتا جب دوسرے رقص میں مصروف ہوں اور آخر میں۔۔۔۔

میں نے بھٹو صاحب کی بات ان کے منہ سے اچک لی اور بولی کہ آخر میں آپ کی یہ ریپوٹیشن ہے کہ خوبصورت عورتیں آپ پر مرتی ہیں۔ آپ ایک Don Juan ہیں۔ جناب صدر! کیا یہ بات درست ہے؟

بھٹو صاحب نے کہا کہ یہ بات بھی بڑھا چڑھا کر بیان کی گئی ہے۔ میں ایک روشن خیال شخص ہوں۔ میرا یہ خیال نہیں کہ روشن خیال ہونے کے لیے آپ [illegible] روشن خیال شخص ہونے کے ناتے میرا خیال ہے کہ [illegible] آپ [illegible] کرنے کی اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کسی کی محبت میں گرفتار ہونا یا کسی عورت سے [illegible] کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ آپ کو ان لوگوں پر رحم کرنا چاہیے جو محبت میں گرفتار نہیں ہوتے۔ آپ سمجھتی ہیں [illegible] محبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں اور میں بھی محبت میں گرفتار ہوتا ہوں۔ میں اخلاقیات پر بہت یقین رکھنے والا ایک شخص ہوں۔ میں عورتوں کی عزت کرتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان مرد عورتوں کی عزت نہیں کرتے۔ وہ لوگ جو ایسا سوچتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ عورتوں کی عزت اور ان کا تحفظ کرنا ہمارے حضور پاک کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ کو [illegible] ایک دفعہ ایک شخص [illegible] آپ کو پتہ ہے [illegible] ایک چھوٹی سی لڑکی [illegible] میں غصے سے پاگل ہو گیا تھا [illegible] کے ساتھ [illegible] کہ میں انہیں [illegible] کروں گا۔ میں اس [illegible] مجھے اس [illegible] یقین ہو گیا کہ [illegible] میں ہمارے فوجیوں نے وہاں کی عورتوں [illegible] ایک شخص ہوں جو اس بات پر اصرار کرے گا کہ ایسے فوجیوں کو [illegible] جانی چاہیے۔

میں نے گفتگو کا موضوع بدلنے کے لیے بھٹو صاحب سے کہا کہ بھٹو صاحب آپ [illegible] کی بات کرتے ہیں۔ آپ ان نظریات کا اپنی [illegible] اور اسلام کے نظریات سے کیسے [illegible] کرتے ہیں؟

بھٹو صاحب بولے میں محض معاشی معاملات میں اپنے آپ کو [illegible] کہتا ہوں۔ میں صرف معاشی معاملات میں [illegible] کو تسلیم کرتا ہوں۔ تاہم میں [illegible] کے بارے میں [illegible] اور اس سوال پر کہ خدا کا وجود ہے کہ نہیں [illegible] پر یقین نہیں رکھتا۔ ایک اچھے مسلمان کی طرح میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں۔ [illegible] میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ایمان ایک

[illegible] آزاد [illegible] کا وجود ہے [illegible] کے تحفظ کے [illegible] کرنے [illegible] کی وجہ سے [illegible] مسلمان [illegible] کے ساتھ ساتھ میں اس بات پر بھی یقین رکھتا ہوں کہ اپنے آپ کو [illegible] اور مسلمان [illegible] جو ایک ساتھ [illegible] پاکستان جیسے غیر ترقی یافتہ ملک میں جہاں [illegible] کوئی [illegible] نہیں آتا۔

میں نے پاکستان کی بات کی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کوئی عالمی [illegible] میں اور دوسرے لوگوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ میں صرف اپنے [illegible] ہوں۔ میں ایک انقلابی شخص ہوں جس میں [illegible] اور [illegible] انقلابات [illegible] نہیں کر سکتا۔ [illegible] پاکستان ایسے انقلابات کا متحمل نہیں ہو سکتا [illegible] کے ساتھ معاملات [illegible] کروانی ہوں گی اور ایسے اقدامات کرنے ہوں گے جو [illegible] جہاں [illegible] پیدا [illegible] جائے اور جب [illegible] سب سے پہلے [illegible] ایک ایسے [illegible] آپ سے [illegible] آپ کی [illegible] ایک [illegible] آپ کو [illegible] آپ [illegible] کے لیے [illegible] ہیں۔ اس کے علاوہ [illegible] جیسے [illegible] تھے۔

میں بولی کہ بھٹو صاحب البتہ ہمارے لوگ آپ کی ان باتوں پر یقین نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ آپ کو صرف طاقت چاہیے اور کچھ نہیں اور اقتدار میں رہنے کے لیے آپ کچھ بھی کر گزریں گے اور آپ کبھی بھی ان [illegible] سے دستبردار نہیں ہوں گے جو اس وقت آپ کے پاس ہیں؟

بھٹو صاحب بولے کہ یہ بالکل غلط ہے۔ میں نے تین مہینوں میں زرعی اصلاحات کی ہیں اور میرے اپنے خاندان کو 45 ہزار ایکڑ زمین چھوڑنی پڑی ہے۔ میری اپنی ذاتی چھ سے سات ہزار ایکڑ

[illegible]
[illegible] Vanity [illegible]
[illegible] ہے لیکن [illegible]
[illegible] ایک [illegible]
آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں [illegible]
[illegible] ہے کہ ایک [illegible]
بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔ ایک [illegible] سے تعلق رکھتا ہے جبکہ میرا تعلق [illegible] سے
ہے۔ ایک [illegible] ہے جبکہ میرا تعلق اریسٹوکریسی سے ہے۔ اگر آپ کسی شخص کے
بارے میں کوئی کتاب پڑھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ آپ کا ہیرو ہے۔ میرے بھی اپنے
ہیرو تھے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ایک طالب علم تھا۔ یہ ہیرو بھی ایک چیونگم کی طرح ہوتے
ہیں۔ آپ انہیں منہ میں چباتے ہیں اور پھر نکال کر پھینک دیتے ہیں اور اس کی جگہ نئی چیونگم رکھ دیتے
ہیں۔ یہ ہیرو آپ کو جوانی میں اچھے لگتے ہیں۔ تاہم، اگر آپ یہ جاننا چاہتی ہیں کہ اب تک میں نے
کتنے ہیرو کو منہ میں چبایا ہے۔ میں آپ کو ان کے نام بتا دیتا ہوں۔ چنگیز خان، سکندر اعظم، ہنی بال
اور نپولین۔ نپولین کو میں سب سے بڑا ہیرو سمجھتا تھا۔ میں روسو کا بھی بڑا فین رہا ہوں۔ اس کے علاوہ
مجھے Cavouro، Mazzini اور Garibaldi کو بھی چبانے کا موقع ملا ہے۔ آپ کو اندازہ ہو
گیا ہوگا کہ میرے اندر کتنے تضادات تھے۔

میرے منہ سے نکلا "آئی سی"۔

میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ چلیں، آپ کی شخصیت کو زیادہ بہتر سمجھنے کے لیے آپ مجھے یہ
بتائیں کہ موجودہ دنیا کے کون سے ایسے لیڈر ہیں جنہیں آپ پسند کرتے ہیں یا جو آپ کو پسند کرتے
ہیں۔

بھٹو صاحب نے جواب دیا۔ سکارنو۔ وہ میری ایک طرح سے پوجا کرتا تھا اور میں اس کی۔
اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود جس میں عورتوں کے ساتھ Vulgarity کرنے کے باوجود وہ ایک
زبردست انسان تھا۔ اسے اکنامکس کی بھی کوئی سمجھ بوجھ نہیں تھی۔ [illegible] ناصر تھا۔ وہ بھی ایک شاندار
انسان تھا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور میں اس سے۔ میں نے 1966ء میں جب جنرل ایوب کی کابینہ
سے [illegible] دیا تو ناصر نے مجھے [illegible] کی دعوت دی اور مجھے ایک [illegible]

[illegible] چل گئی ہے۔ [illegible] اطلاعات میں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] 1946ء

جہاں تک میرے [illegible] کی بات ہے کہ [illegible] اقتدار کا بھوکا ہوں [illegible] خیال ہے کہ
یہ اشد ضروری ہے کہ ہم یہ بات سمجھیں کہ طاقت کیا چیز ہوتی ہے۔ میرے نزدیک پاور وہ نہیں جو
جنرل یحییٰ کے پاس تھی۔ طاقت سے میری مراد ہے وہ چیز جس سے آپ پہاڑوں کو گرا کر زمین ہموار
کرتے ہیں۔ جس سے صحراؤں میں پھول کھلتے ہیں اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں جہاں بھوک
اور افلاس سے کوئی نہیں مرتا۔ میں ڈکٹیٹر نہیں بننا چاہتا لیکن اس وقت میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بہت
زیادہ سخت ہونا پڑے گا۔ میں جن ٹوٹی ہوئی کرچیوں کو دوبارہ جوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں وہ کرچیوں
میں بکھری ہوئی ہیں۔ مجھے کرچیاں اٹھا کر باہر پھینکنی ہوں گی اور اگر میں نے ان کرچیوں کو پھینکتے وقت
احتیاط نہ کی تو یہ ملک نہیں رہے گا۔ میرے پاس صرف ایک بازار رہ جائے گا۔ ایک بات سمجھنے کی ہے کہ
آپ سیاست محض کھیل کود کے لیے جاری نہیں کرتے۔ آپ سیاست اس لیے کرتے ہیں تاکہ طاقت
حاصل کر سکیں اور اسے اپنے پاس رکھیں۔ جو یہ بات نہیں مانتا وہ جھوٹ بولتا ہے۔ سیاستدان ہمیشہ آپ
کو یقین دلانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ وہ بہت اچھے ہیں، بہت اچھے کردار کے مالک ہیں اور
مستقل مزاج ہیں۔ آپ ان کی باتوں میں نہ آئیں۔ اس طرح کے سیاستدان کا کوئی وجود نہیں ہوتا جو
اچھا ہو، اخلاقی لحاظ سے بہتر اور مستقل مزاج ہو۔ سیاست [illegible] کا کام ہے۔ میرے باپ نے ایک
دفعہ مجھے ایک بات بتائی تھی کہ کبھی کسی شخص پر اس وقت بھروسہ مت کرنا جب تک آپ اس کے ہاتھوں مار
کھانے کے لیے تیار نہ ہوں۔ [illegible] جائے۔ [illegible] اور [illegible] جائے۔ [illegible] کی وہ تمام
خوبیاں اس وقت سے [illegible] جو میں نے سکول کے دنوں میں سیکھی تھیں۔

میں نے کہا کہ بھٹو صاحب! آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ سوشلسٹ [illegible] اور [illegible]
کی کتابیں پڑھتے ہیں۔

میں جتنا عرصہ چاہوں وہاں ٹھہر سکتا ہوں۔ اس کے بعد تیسرا لیڈر جس سے میں متاثر رہا ہوں وہ سٹالن تھا۔ میں ہمیشہ اس کی دل سے بڑی عزت کرتا ہوں۔ تاہم، میں نے خروشیف کو کبھی پسند نہیں کیا۔ اسے میں نے ہمیشہ چیختے چلاتے، الٹے دل کو ہلا کھلتے یا شراب پیتے اور ہمیشہ امریکیوں کے آگے جھکنے کے لیے تیار دیکھا۔ خروشیف نے ایشیا کو بہت نقصان پہنچایا۔ آخری لیڈر جس سے میں متاثر ہوں اور میرا خیال ہے کہ آپ جانتی ہیں کہ میں ماوزے تنگ کے بارے میں کچھ کہوں تو میں آپ کو بتاؤں کہ میرے لیے چو این لائی کے بارے میں بات کرنا زیادہ آسان ہے کیونکہ میں اسے ذاتی طور پر جانتا ہوں اور میری ان سے کئی ملاقاتیں اور بحث و مباحثے ہوئے ہیں جو صبح سے شام تک جاری رہے حتیٰ کہ ایک سال تک ہم یہ مباحثے کرتے رہے۔ میں 1962ء سے بیجنگ جا رہا ہوں اور چو این لائی سے ملاقاتیں کرتا رہا ہوں۔ میں اسے بہت پسند کرتا ہوں۔

میں نے کہا کہ جناب صدر! آپ جن لیڈروں کے نام لے رہے ہیں انہوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے بہت جدوجہد کی تھی جبکہ آپ نے تو ایسا کچھ نہیں کیا؟

بھٹو صاحب بولے آپ غلط کہہ رہی ہیں۔ یہاں تک پہنچنا میرے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مجھے جیل میں ڈالا گیا۔ میں نے کئی دفعہ خطرات کا سامنا کیا۔ میں نے جنرل ایوب خان اور یحییٰ خان کا سامنا کیا۔ انہوں نے کھانے میں زہر دے کر مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ میرے اوپر گولیاں بھی برسائی گئیں۔ دو دفعہ میرے اوپر قاتلانہ حملہ 1968ء میں ہوا اور ایک دفعہ 1970ء میں۔ سندھ کے شہر سانگھڑ میں دو سال پہلے میں یحییٰ خان کے بھیجے ہوئے قاتلوں کی کی گئی کراس فائرنگ میں ایک گھنٹے تک پھنسا رہا۔ مجھے بچاتے ہوئے ایک شخص مارا گیا جبکہ دوسرے شدید زخمی ہوئے۔ آپ ایک اور بات بھی نہ بھولیں کہ جب آپ کسی امیر گھر میں پیدا ہوتے ہیں اور اس کے بعد سوشلسٹ بنتے ہیں تو پھر کوئی آپ کی بات کا یقین نہیں کرتا۔ نہ دوست اور نہ ہی آپ کے قریبی لوگ بلکہ وہ آپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور تو اور غریب بھی آپ کی بات کا یقین نہیں کرتے جو بیچارے دستے پڑھے لکھے نہیں ہوتے کہ وہ آپ کے خلوص پر یقین کریں۔ میرے لیے گولیوں کی بوچھاڑ اور خوراک میں زہر سے بچنا اتنا مشکل کام نہیں تھا جتنا ان لوگوں کو اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ میری باتوں کو سنجیدگی سے لیں جو مجھ پر یقین نہیں کرتے تھے۔ ایک ایسا شخص جو سازشوں اور مراعات میں پیدا ہوا تھا انہوں نے کوئی مجھے الدین کے قائلین پر

نہیں بنا دیا تھا اور اگر سیاست میرا پیشن نہ ہوتا۔۔۔۔

میں نے کہا بھٹو صاحب آپ کے اندر سیاست کے لیے اتنی محبت کہاں سے آئی؟

بھٹو صاحب بولے یہ ہمیشہ سے میرے اندر تھی۔ جب میں ایک بچہ تھا اس وقت بھی میرے اندر تھی لیکن میرا خیال ہے کہ یہ چیز میرے والدین کی طرف سے میرے اندر آئی تھی۔ میرا باپ ایک بڑا زبردست سیاستدان تھا۔ تاہم، افسوس کی بات ہے کہ سیاست سے اس وقت وہ نکل گئے جب وہ ایک انتخابات میں ہار گئے۔ ان کے سیاست کے بارے میں بڑے اعلیٰ خیالات تھے۔ ایک دن وہ مجھے راجواڑہ کا چکر لگوانے لے گئے۔ انہوں نے مجھے قدیم مندر دکھائے۔ شاندار گھر اور اپنی تہذیب کی نشانیاں اور مجھے کہا کہ دیکھو بیٹا! سیاست بھی ایک مندر یا گھر تعمیر کرنے کی طرح ہوتی ہے یا میوزک یا ڈوری بجنے کی مانند۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں مائیکل اینجلو کا بھی ذکر کیا۔ تاہم میری ماں بڑی مختلف خاتون تھیں۔ ان کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا اور وہ دوسرے غریب لوگوں کی غربت بہت محسوس کرتی تھیں۔ وہ مجھے اکثر کہتی رہتی تھیں کہ بیٹا تم ہمیشہ غریبوں کا خیال رکھنا۔ ہمیں غریبوں کی مدد کرنی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ جب میں امریکہ گیا تو میری ماں کی باتیں میرے ذہن میں اتنی رچ بس گئی تھیں کہ میں ایک انقلابی بن گیا۔ میں امریکہ کی یونیورسٹی آف کیلیفورنیا میں پڑھنے گیا جہاں انٹرنیشنل لاء کا ایک بہت بڑا پروفیسر پڑھا رہا تھا۔ میں اس وقت انٹرنیشنل لاء میں بھی ڈگری لینا چاہتا تھا۔ یہ دور کمیونسٹوں کو بلیک لسٹ کرنے کا دور تھا۔ میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ میں نے کیا کرنا تھا۔ میں لال نیل پالش لگانے والی لڑکیوں سے دور رہتا اور ایک ایسی سٹریٹ میں جا کر رہا جہاں نیگروز رہتے تھے۔ میں وہاں ایک مہینہ اور ایک ہفتہ رہا۔ مجھے ان کے ساتھ رہنا اچھا لگا۔ وہ جو بھی تھے ان میں بناوٹ نہیں تھی۔ انہیں ہنسنا آتا تھا۔ ایک دن سان ڈیاگو میں ایک ہوٹل والے نے اس وجہ سے کمرہ دینے سے انکار کر دیا کہ میں ایک میکسیکن لگتا تھا۔ اس واقعے نے بھی میری سوچ کافی بدلی۔ میں امریکہ سے لندن گیا۔ ان دنوں الجیریا کی آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ میں الجیریا کے لوگوں کے ساتھ ہو گیا لیکن میں مظاہرین کے ساتھ مل کر برطانیہ کے وزیراعظم کے دفتر 10۔ ڈاؤننگ سٹریٹ کے باہر نعرے نہیں لگاتا تھا۔ ہو سکتا ہے شاید کسی کو علم نہیں ہے کہ میں اندر سے ایک شرمیلا انسان ہوں۔ میں لوگوں میں زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ میں ہمیشہ لکھ کر بحث و مباحثہ کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ میرے خیال میں سیاست کی گیم میں یہ چیز مجھے

دوبارہ کبھی ملیں گی۔

میں نے کہا کہ بھٹو صاحب! اب آپ سے آخری سوال، دوبارہ شاید کبھی ملاقات ہو، اگر سوال آپ کو برا لگے تو مجھے لگتا ہے آپ کو اپنی ذات پر یقین ہے، آپ کبھی شک نہیں کرتے؟

بھٹو صاحب نے کہا کیا آپ نے اس سوال کو جس طرح پوچھا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ میں اگلی تم ہو جاؤ لیکن میرا خیال ہے کہ میں ان تمام لوگوں سے زیادہ دیر تک پاکستان کا حکمران رہوں گا جنہوں نے ابھی تک اس ملک پر حکمرانی کی ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ میں اس وقت صحت مند ہوں اور میرے اندر توانائی بھی بھرپور ہے۔ میں کام کر سکتا ہوں جیسے ابھی بھی ایک دن میں اٹھارہ گھنٹے کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ میں اس وقت نوجوان ہوں۔ میری عمر 44 برس ہے اور میں اندرا گاندھی سے دس سال چھوٹا ہوں اور سب سے بڑھ کر مجھے اس بات کا پتہ ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے میں تیسری دنیا کا واحد لیڈر ہوں جو دنیا کی دو بڑی سپر پاورز کی مخالفت کے باوجود دوبارہ سیاست میں واپس آیا۔ 1968 میں امریکہ اور روس دونوں مجھ سے سخت ناراض تھے اور مجھے مشکلات میں دیکھنا چاہتے تھے۔ آج میں ان تمام مشکلات پر قابو پا کر یہاں بیٹھا ہوں کیونکہ مجھے اپنے پیشے (سیاست) کے بنیادی اصولوں کا پتہ ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اصول کیا ہیں؟ دراصل سیاست میں آپ کو کئی دفعہ یہ تاثر دینا پڑتا ہے کہ آپ بیوقوف ہیں اور دوسروں کو یہ یقین دلانا پڑتا ہے کہ ان سے بہتر ذہین کوئی پیدا نہیں ہوا۔ تاہم یہ سب کچھ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ کے اندر لچک ہو۔۔۔۔ کیا آپ نے کبھی کسی گھونسلے پر کسی پرندے کو اپنے انڈوں پر بیٹھے دیکھا ہے۔ ایک سیاستدان کی انگلیاں اتنی لمبی اور لچکدار ہونی چاہئیں کہ وہ بڑی مہارت سے اس پرندے کے نیچے سے اس کے انڈوں کو ایک ایک کر کے اتنی خوبصورتی سے نکالے کہ اسے پتہ ہی نہ چلے!

کراچی، اپریل 1972ء

Courtesy : An Interview With History

مترجم: رؤف کلاسرا



رؤف کلاسرا کی یہ کاوش آج کے ان تجزیہ نگاروں کے لیے بہت مفید ہے جن کے پاس رائے عامہ کو تبدیل کرنے کی طاقت تو بہت ہے مگر سیاست کو سمجھنے کا تجربہ، جماعتوں کے اسرار و رموز، مقامی سیاست کے مسائل اور علاقائی تفریقوں سے آگاہی بہت کم ہے۔ رؤف نے یہ سیاسی خاکے لکھ کر ان شخصیات کے اندر جھانکنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم رؤف کے تجربے سے اتفاق کریں، مگر رؤف نے سیاست کے ایک دور کا خاکہ میدان میں ری ایکشن کے لیے پھینک دیا ہے۔ جس کسی میں اختلاف کا مواد یا مباحثے کی عقل ہو وہ اس معرکے میں شریک ہو سکتا ہے۔

مجھے یہ خاکے پڑھ کر احساس ہوا کہ جو چوہدری نثار یا چوہدری شجاعت رؤف کے خاکوں میں ابھرے ہیں ان کو تو میں جانتا ہی نہیں یا یہ کہ مصنف نے ان کو اپنے زاویے سے دیکھا ہے۔ شاید سیاسی صحافت کا یہی سب سے بڑا سبق ہے کہ ایک ہی منظر اور کردار کی کئی کہانیاں ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان خاکوں کا عنوان "ایک سیاست کئی کہانیاں" بہت موزوں ہے۔ کسی کے پاس سچائی کی ٹھیکیداری نہیں اور یوں ہی چھوٹی کہانیوں سے ایک بڑی کہانی ابھرتی ہے جو حقیقت کے قریب تر ہوتی ہے۔

عامر متین

ISBN: 978-969-496-385-3